نقشہ ہندوستان
آزادی سے قبل
NEPAL
BHUTAN
ASSAM
UNITED PROVINCES
E.S
SHILLONG
BIHAR
CENTRAL INDIA STATES
MANIPUR
BENGAL
BURMA
EASTEN STATES
CHANDERNAGORE (FRENCH)
CALCUTTA
AL PROVINC
ORISSA
E.S
BAD
BAY
OF
BENGAL
MADRAS
ANDAMAN IS
PONDICHERRY (FRENCH)
KARIKAL (FRENCH)
NICOBAR IS
CEYLON
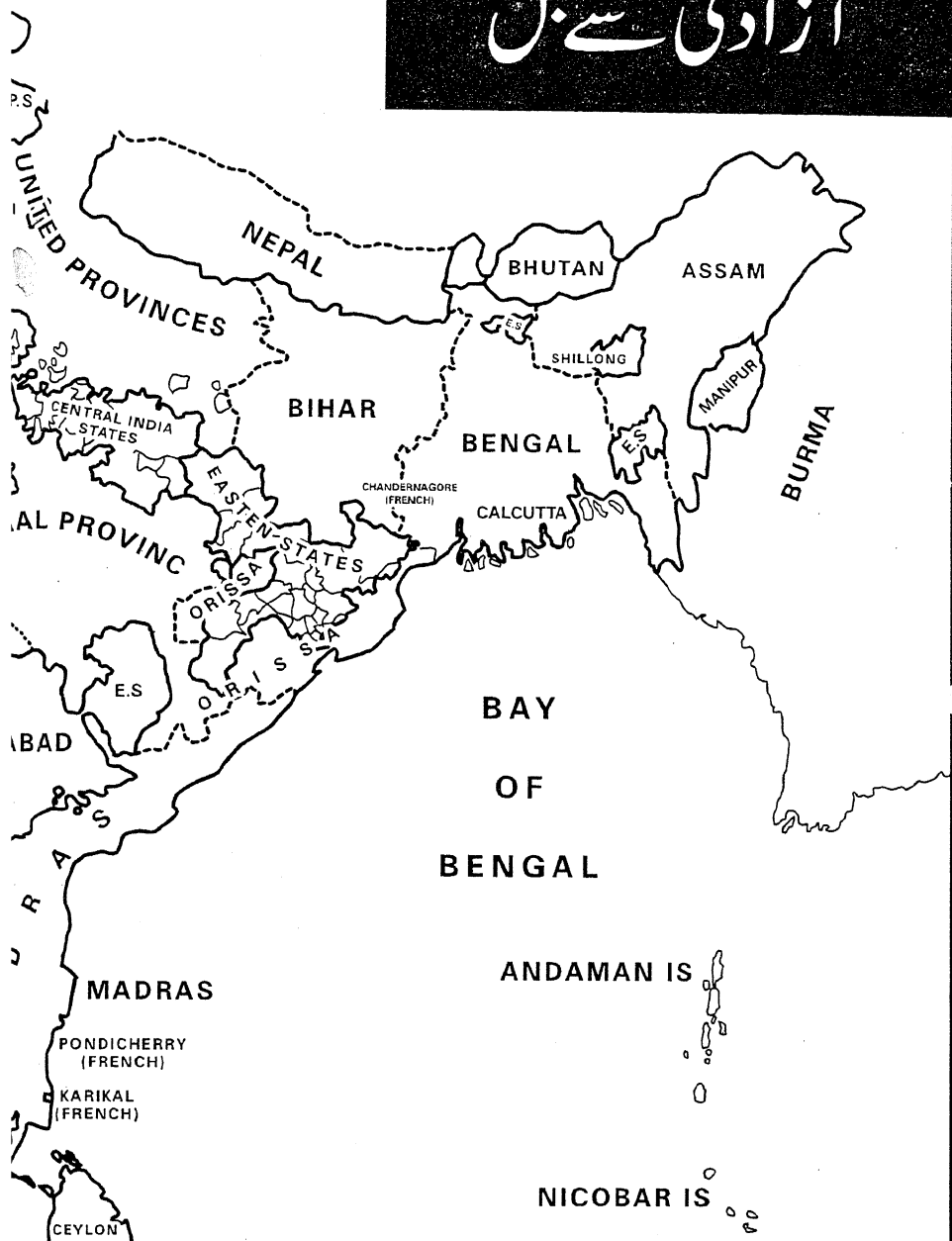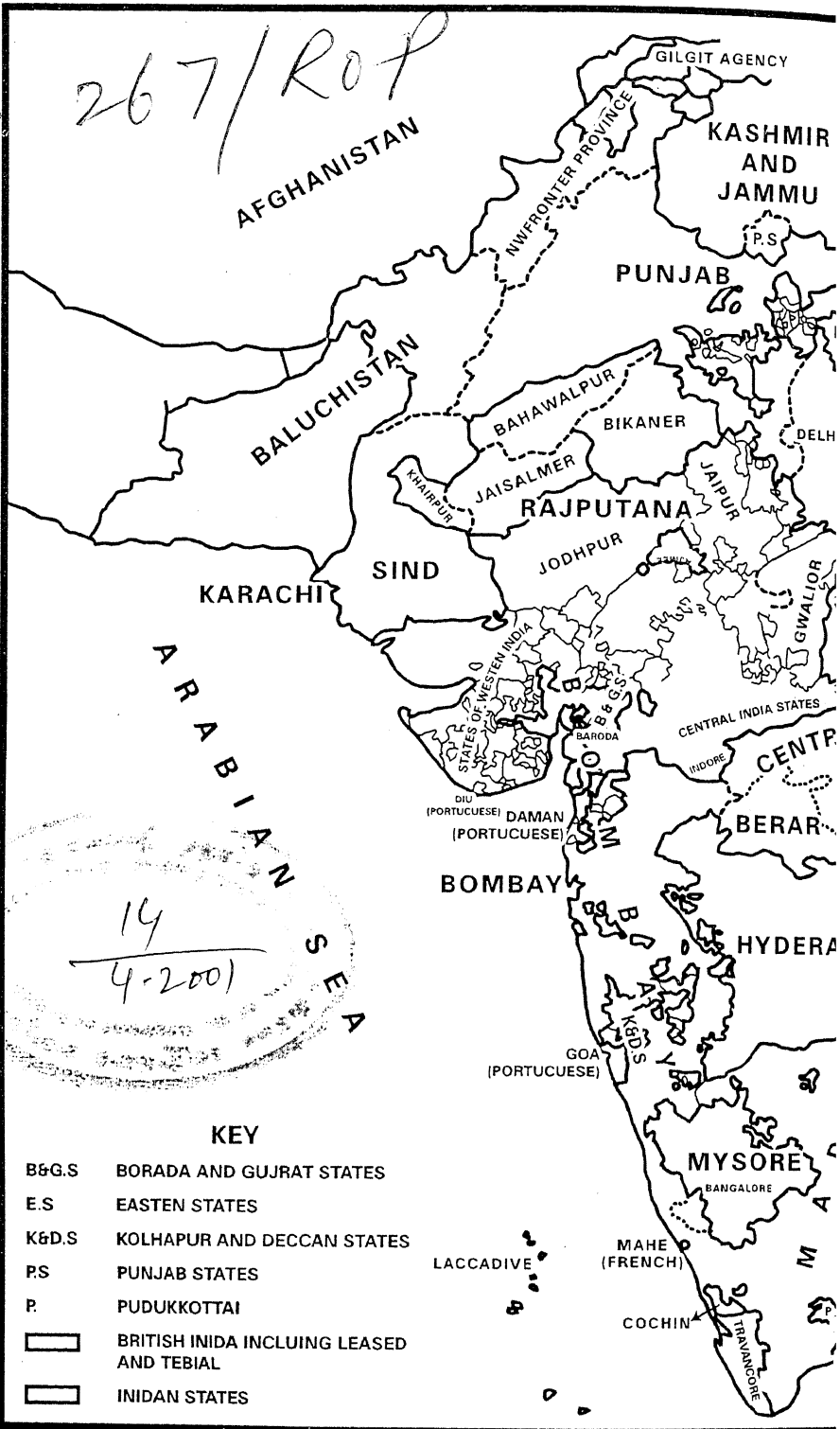
زوالِ حیدرآباد

سید حسین

ناشر : سنٹر فار مینار یٹیز اسٹڈیز، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد - ۲۹

نام	:	زوالِ حیدرآباد
نام مصنف	:	سید حسین
سن اشاعت	:	ستمبر ۲۰۰۱ء
تعداد	:	ایک ہزار
سرِ ورق	:	سعادت علی خاں
کمپیوٹر کتابت	:	الاکرم گرافکس فون : 040 - 4073394 16-1-14/4 ڈاکٹر ذاکر حسین کالونی، سعید آباد، حیدرآباد - 59
طباعت	:	ایس۔ کے۔ پرنٹر، حیدرآباد
قیمت	:	(۱۲۰) روپئے ، (۱۰) امریکی ڈالر ، (۴۰) سعودی ریال
ناشر	:	سنٹر فار مینا رٹیز اسٹڈیز، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد - 29
مصنف کا پتہ	:	3-5-143/A/54 کنگ کوٹھی روڈ، حیدرآباد - 001 500 فون : 4755307
ڈسٹری بیوٹر	:	حسامی بک ڈپو مچھلی کمان، حیدرآباد - 2

ملنے کے پتے

۱ - دارالاشاعت مجلس تعمیر ملت، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد-۲۹

۲ - تاجران کتب حیدرآباد

۳ - مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، دہلی-۲۵

۴ - بک ایمپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ-۴

۵ - مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، پرنس بلڈنگ، بمبئی-۳

۶ - مکتبہ دین وادب، پبلشرز اینڈ بک سیلرز، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

۷ - مرکز پبلیکیشنز، بڈشاہ چوک، سری نگر، کشمیر

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

ان ہزاروں بے گناہوں کے نام جن کے قتل نامے بیان کرتے ہوئے میری والدہ مرحومہ زار زار رویا کرتی تھیں اور خدا پاک سے دعائیں کرتی تھیں کہ اُن کی روحوں کو وہ سکون عطا ہو کہ ان کی موت بھی رشک کرنے لگے۔

ہزاروں بے قصور جنھیں گھروں سے باہر نکالا گیا، راستوں پر لٹا کر ٹھوکریں ماری گئیں، ماں، باپ، بیوی اور بچوں کے سامنے قتل عام کیا گیا۔ وہ جو جان بچا کر بھاگنے لگے تو شکار کی طرح مار گرایا گیا۔ وہ جو کھیتوں میں چھپ کر پناہ لئے اندھا دھند فائرنگ سے ان کو مٹایا گیا۔ ہزاروں عورتیں اپنی عصمت کی خاطر باولیوں میں کود کر جانیں دیں۔ لاشوں سے باولیاں پاٹ دی گئیں تھیں۔ خون کے ندیاں بہادی گئیں تھیں۔ ان واسیوں کا قصور یہ تھا کہ وہ سات سو سال سے مسلمان تو مسلمان ہندوؤں کو بھی اپنے سینہ سے لگائے رکھے تھے۔ کبھی انھیں غیر نہیں سمجھا تھا۔ کبھی بھی ہندو مسلم اصطلاح میں نہیں سونچا تھا۔ اپنے خاندان کا ایک فرد تصور کرتے تھے اور اپنے سے زیادہ انھیں خوش حال بنایا تھا۔

ان جیالوں کے نام جو اپنی آزادی کے خاطر اور اپنی مملکت کی بقاء اور اس کی آزادی کے خاطر اپنی ماؤں کا دودھ بخشائے بغیر بھالے برچھے لے کر میدانِ کارزار میں اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر کود پڑے تھے۔ بکتر بند گاڑیوں (دبابے) کی چینیں برچھوں بھالوں سے گراتے ہوئے اور دبابوں کے سامنے سوتے ہوئے اپنی جان قربان اس لئے کئے تھے کہ آزاد رہنا ان کا پیدائشی حق تھا اور ان کی مملکت جو آزاد تھی اس کو بچانے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان جاں نثاروں نے قربانی کی وہ مثال دی شائد کوئی گروہ نے ایسی مثال قائم کی ہو۔ افسوس کہ آج ہم انھیں بھول گئے اور اغیار انھیں رضا کار ایک داغدار نام کے حوالے سے یاد کرتے ہیں۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے۔

سید حسین

اظہارِ تشکر

میں سر بہ سجود ہوں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔

جناب محمد عبدالرحیم قریشی صاحب (ایڈوکیٹ) صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت حیدرآباد نے میری بڑی حوصلہ افزائی فرمائی اور بڑے خلوص و محبت سے ہر قدم پر تعاون فرمایا۔ باوجود تنظیمی مصروفیات کے مشوروں اور اہم واقعات پر تبادلہ خیالات کے سلسلہ میں وقت دیا اور مشوروں سے نوازا۔ ان کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔

نسیم عارفی صاحب اگزیکٹیو ایڈیٹر روزنامہ منصف حیدرآباد کتاب کی تزئین، کمپوزنگ، طباعت اور دیگر اُمور میں بڑے خلوص و محبت سے تعاون فرمایا۔ اخباری مصروفیات کے باوجود میرے لئے وقت نکالا۔ میں ان کا بے حد مشکور ہوں۔

یوسف رحمت اللہ صاحب اور قیوم عادل صاحب کے تعاون کا مشکور ہوں۔ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کی لائبریری کی کتابوں سے استفادہ کی بڑی سہولت ملی جس کے لئے میں اقبال اکیڈیمی کا بھی مشکور ہوں۔

سید حسین

حرفِ چند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرے دوست سید حسین صاحب لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے حیدرآباد کے زوال پر ایک اچھی اور معلومات آفریں کتاب لکھی ہے۔ ''زوال حیدرآباد'' ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جس میں آصفجاہی سلطنت کے قیام سے لے کر آصف سابع کی شکست اور مملکت آصفیہ کے خاتمہ تک بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مملکت آصفیہ کا خاتمہ بیسویں صدی کا ایک بہت بڑا المیہ ہے جس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ لیکن دنیا کے بدلتے ہوئے حالات، ہندوستان کی تقسیم اور جمہوریت کے طوفان میں چاروں طرف سے ہند یونین سے گھری ہوئی ریاست حیدرآباد کا آزاد رہنا بڑا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ قابل مصنف نے ان تمام عناصر کا بڑے ہی غیر جذباتی انداز میں حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے اور زوال کے اسباب کا بڑی حد تک صحیح تجزیہ کیا ہے۔ میں نے اس موضوع پر اب تک جتنا بھی لٹریچر پڑھا ہے ان میں یہ کتاب ایک اچھا اور قابل قدر اضافہ ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اس کتاب کا خاطر خواہ استقبال کیا جائے گا۔

عبدالرزاق لاری

ملک پیٹھ، حیدرآباد

یکم اگست ۲۰۰۱ء

نوٹ : عبدالرزاق صاحب لاری ایک بلند پایہ اہل قلم ہیں۔ زوال سے پہلے مملکت آصفیہ حیدرآباد میں مایہ ناز ادیبوں، شاعروں، انشاپردازوں، فن کاروں اور خطیبوں کی ایک بڑی تعداد منظر عام پر آئی جس میں موصوف طنز نگار انشاپردازوں میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ یہ ابراہیم جلیس، نظر حیدرآبادی، شاہد صدیقی، پروفیسر منظور حسین، خواجہ معین الدین، سید خلیل اللہ حسینی کے ساتھی ہیں۔ حیدرآباد کے شب و روز سے اچھی وقفیت رکھتے ہیں۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ریاست نظام حیدرآباد یا مملکت آصفیہ، برطانوی ہند میں آبادی اور آمدنی کے لحاظ سے سب سے بڑی دیسی ریاست تھی۔ رقبہ، آبادی و وسائل کے اعتبار سے ایشیا، یورپ اور وسطی امریکہ کے ان کئی ملکوں سے بڑی اور مضبوط تھی جو آزاد ممالک کی حیثیت میں اقوام متحدہ کے رکن ہیں۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد اہل علم و ہنر، ادیب و شاعر قدر دانی، حوصلہ افزائی اور سرپرستی کے لئے اس ریاست حیدرآباد کا رُخ کرتے۔ آبادی کی اکثریت ہندو تھی اور حکمران خاندان مسلمان تھا جس کے عمائدین و امراء میں خاص تعداد ہندوؤں کی تھی۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور یگانگت میں یہ ریاست اپنی مثال آپ تھی۔ سوا دو سو سال (۱۷۲۴ تا ۱۹۴۸ء) کے طویل عرصہ میں بجز آخر کے ڈیڑھ دو سال کے کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا اور اس ڈیڑھ دو سال کے عرصہ میں بھی ریاست کے باہر سے آ کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت پیدا کی گئی اور فسادات کروائے گئے۔ بہر حال ریاست حیدرآباد جس کو برطانوی بالادستی (Paramountcy) کے اندر بڑی حد تک خودمختاری حاصل تھی کئی اعتبارات سے منفرد مقام اور منفرد حیثیت رکھتی تھی اور بجز ایک معذوری کے، یہ ریاست آزاد مملکت کی حیثیت سے باقی رہنے کی تمام شرائط کی تکمیل کرتی تھی اور صلاحیت رکھتی تھی۔ ایک معذوری یہ تھی کہ یہ چاروں طرف ہندوستان سے گھری ہوئی تھی۔

ستمبر ۱۹۴۸ء میں ہندوستان نے فوجی کارروائی کر کے اس ریاست کو ختم اور ہندوستان میں ضم کردیا۔ اس کارروائی کے فوجی منصوبے کو 'آپریشن پولو' کا نام دیا گیا اور عام طور پر اس کارروائی کو پولیس ایکشن کا نام دے کر فوجی حملے کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ جس تیزی اور سرعت کے ساتھ ہندوستانی فوج نے پیشقدمی کی اس نے سب کو حیران اور ششدر کردیا۔ کہیں حیدرآبادی فوج سے لڑائی نہیں ہوئی۔ مزاحمت اگر ہوئی تو صرف مسلم نوجوانوں کی طرف سے جنھوں نے دبابوں (ٹینکس) کے سامنے لیٹ کر اور دبابوں کی چینوں (Chains) پر برچھوں، بھالوں سے حملہ کر کے

فوج کی پیشقدمی کو روکنے کی کوشش کی ۔ موت کو گلے لگایا ۔ جرأت و بہادری، قربانی اور جاں سپاری کی تاریخ میں اپنے خون سے ایک نیا باب لکھا۔

مملکت آصفیہ حیدر آباد کے خاتمہ اور سقوط پر کئی کتابیں موجود ہیں ۔ اس کے باوجود یہ احساس ہوتا ہے کہ اس پر جتنا لکھا جانا چاہیئے تھا نہیں لکھا گیا ۔ حیدر آباد کا سقوط تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جس کے تمام پہلو، اس کے اسباب و وجوہ، اس کے تعلق سے فریقین کے نقاط نظر ان سب کو منظر عام پر آنا چاہیئے ۔ مگر جو کتابیں اس موضوع پر ملتی ہیں ان سے ان سب باتوں پر روشنی نہیں پڑتی ۔ اس خونین باب پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے ۔ ابھی بہت سے پہلو منظر عام پر نہیں آئے جن پر تحقیق کا ذوق رکھنے والوں کو توجہ دینا چاہیئے ۔ تاریخ کے اس باب میں بڑے حقائق اور بڑی بصیرتیں اور عبرتیں پوشیدہ ہیں ۔ ماضی کے اس باب کو پوری طرح وا کرنے سے مستقبل کے لئے بہت کچھ مل سکتا ہے ۔

جناب سید حسین صاحب نے اس کتاب میں سقوط کے تاریخی پس منظر کو پیش کرتے ہوئے سیاسی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے اور اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ اس واقعہ میں جن اشخاص نے اہم کردار ادا کیا ہے اس کو بھی سامنے لایا جائے ۔ دارالاشاعت کل ہند مجلس تعمیر ملت کی جانب سے امریکہ اور جاپان میں مقیم دو حیدر آبادی نژاد اہل قلم ڈاکٹر عمر خالدی اور ڈاکٹر معین الدین عقیل کی مرتبہ ''سقوط حیدر آباد'' کی اشاعت اور اس کو پڑھنے سے انھیں تحریک ہوئی اور یہ سوال ان کے ذہن میں گردش کرنے لگا کہ اس خوں آشام اور تباہ کن واقعہ کو ٹالا جا سکتا تھا یا نہیں ۔ اگر ٹالا جا سکتا تھا تو اس میں رکاوٹ کیوں آئی اور کیسے آئی اور ذمہ داری کس پر عائد ہو سکتی ہے؟ اس تجسس نے انھیں اس موضوع پر موجود انگریزی و اُردو کتابوں کے مطالعہ پر مائل کیا جس کے بعد اُنھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کسی کتاب میں بھی اس سوال کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے اور اس سوال سے بچ کر لکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ زیادہ سے زیادہ قاسم رضوی صاحب کی جذباتیت اور تیز مزاجی کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد سید حسین صاحب نے خود لکھنے اور اپنی کتاب میں اس سوال کا جواب فراہم کرنے کا ارادہ کیا اور یوں اس کتاب کی تصنیف شروع ہوئی ۔

سید حسین صاحب حکومت آندھرا پردیش کے کلاس (I) آفیسر رہے ہیں ۔ ڈائرکٹر لوکل فنڈ آڈٹ کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں اور ان کی سروس کا میدان تنقیح (Audit) رہا ہے ۔ اسی تنقیحی

نقطہ نظر سے اُنھوں نے سقوط حیدرآباد کے اسباب وعلل کا جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب میں عبارت آرائی اور منظر نگاری نہیں ملے گی۔ کتاب کی تحریر واقعاتی اور تجزیاتی رنگ اور طرز کی ہے اور جو لوگ تاریخ پر پڑے پردوں کو اُٹھا کر حقیقتوں سے نظر ملانے کا حوصلہ رکھتے ہیں ان کے لئے دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ سقوط حیدرآباد کے موضوع کے تعلق سے یہ کتاب لائق تحسین اضافہ ہے جس میں حقیقت پسندی سے اس وقت کے حالات کا تجزیہ کیا گیا۔ سید حسین صاحب کے دل میں جہاں یہ خواہش ہے جو ان کی اس کتاب میں جھلکتی ہے کہ کاش ریاست حیدرآباد اپنی خودمختاری کے ساتھ باقی رہی ہوتی وہیں حقیقت پسندی کے جذبے نے ان کو حکومت ہند اور حکومت نظام کے درمیان گفت وشنید کے تجزیے پر مائل کیا چنانچہ اس کتاب کے اندر یہ حقیقت پسندانہ خیال ملتا ہے کہ سمجھوتے کے امکانات تھے مگر .... حیدرآباد کی تاریخ اور اس کے سقوط کے واقعہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب میں کافی مواد ملے گا اور سقوط حیدرآباد پر کتابوں میں اس قیمتی اضافہ کی قدردانی ہوگی۔

۹/اگست ۲۰۰۱ء

محمد عبدالرحیم قریشی

(صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت، حیدرآباد)

پیش لفظ

دکن ہندوستان میں مسلمانوں نے جو سلطنت قائم کی تھی، وہ خلجی، تغلقی، بہمنی اور آصف جاہی بادشاہوں کے تحت رہی۔ آخری سلسلہ آصف جاہی رہا اور سلطنت اسی نام سے مملکت آصفیہ حیدر آباد سے موسوم رہی۔ دکن کے اس خطہ پر مسلمانوں نے تقریباً سات سو سال حکومت کی۔ لیکن آناً فاناً صرف پانچ دن (۱۳ر ستمبر ۴۸ء تا ۱۷ر ستمبر ۴۸ء) کی فوجی کارروائی نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس سلطنت کے زوال پر مختلف مصنفین نے کتابیں لکھی ہیں اور زوال کے اسباب کا تجزیہ کئے لیکن زیادہ تر واقعات و اسباب و علل ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۸ء تک ہیں۔ بعض کتابوں میں دوسری عالمگیر جنگ کی شروعات سے احاطہ کیا گیا ہے۔ بعض مصنفین نے تو زوال کے بنیادی اسباب پر مصلحتوں کے پردے بھی ڈال دیئے ہیں۔

زوالِ حیدر آباد کے المناک واقعات نصف صدی گذرنے کے بعد آج بھی دلچسپی کا اہم موضوع ہے۔ اس موضوع پر ابھی بھی کتابیں لکھی جارہی ہیں۔ جن میں واقعات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔ ان اہل قلم اصحاب میں وہ بھی شامل ہیں جو سات سمندر پار بستے ہیں۔ حال ہی میں Lucien D Benichou نے اپنی کتاب From Autocracy to Integration میں آزادیٔ ہند کی عوامی تحریک کے حوالے سے حیدر آباد کے زوال کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے باوجود بھی تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔

میرے لئے حیدر آباد اور اس کا زوال اس لئے بھی دلچسپی رکھتا ہے کہ میں نے حیدر آباد کے معاشرے اور تہذیب کو ٹوٹتے بکھرتے دیکھا ہے۔ مذہبی اور فرقہ وارانہ رواداری اور ہندو مسلم میل ملاپ واتحاد کے جذبات جو میرے ذہن پر نقش تھے وہ آج بھی باقی ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو برادری آج بھی یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ معاشی آسودگی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی جو اس وقت تھی آج کے

اس جمہوری دور میں عنقا ہے۔ حیدر آباد کی ایک منفرد تہذیب تھی۔ اس تہذیب کی انفرادیت کی بقاء اور مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے جو صدیوں کے اقتدار کی وجہ سے قائم ہوا تھا حیدر آباد، ہندوستان سے دوستانہ تعلقات قائم رکھتے ہوئے آزاد رہنے کا آرزومند تھا۔

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ ہفتم کا دور اگرچہ کہ حیدر آباد کے لئے خوش حالی کا دور تھا لیکن سیاسی اعتبار سے حیدر آباد نازک دور میں داخل ہو گیا تھا۔ تحریک آزادیٔ ہند دورِ عثمانی کے آغاز کے وقت قدم جما رہی تھی اور کچھ عرصہ بعد ہی تیز گام ہو گئی۔ تحریک آزادی کی منزل قیام ذمہ دارانہ حکومت (جمہوریت) تھی یعنی دیسی ریاستوں کے بقاء کے لئے خطرے کی گھنٹی۔ ۱۹۳۷ء کے بعد تحریک آزادی اقلیت، اکثریت اور تعصبیت کا شکار ہو گئی جس کی وجہ سے ہندوستان کا سارا ماحول بگڑا۔ دوقومی نقطہ نظر کی بنیاد پڑی اور اسی بنیاد پر ہندوستان تقسیم ہو کر ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا۔ اس ماحول میں کیا سلطنت حیدر آباد ایک مسلم مملکت کی حیثیت سے اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکتی تھی؟ یہ ایک اہم سوال تھا۔ اور اسی سوال کے جواب میں اس کی بقاء اور زوال دونوں مضمر تھے۔

ان ہی اہم نکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کتاب تحریر کی گئی تا کہ زوال کے اسباب پر تفصیلی روشنی پڑے اور ہم سب کو اور آنے والی نسلوں کو ایک اہم مسلم مملکت کے کھونے کے اسباب کا علم ہو۔

سید حسین

سلطنتِ آصفیہ حیدرآباد لسانی لحاظ سے تین علاقوں (۱) تلنگانہ (۲) مرہٹواڑہ اور (۳) کنٹرا پر مشتمل تھی۔ تلنگانہ میں تلگو، مرہٹواڑہ میں مرہٹی اور کنٹرا میں کنٹری عوامی زبان تھی۔ اُردو ان سب علاقوں کی مشترکہ زبان تھی۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں ہندوستان کی ریاستوں کی لسانی بنیاد پر تنظیم جدید کے عمل آوری کے نتیجہ میں علاقے مرہٹواڑہ کو ریاست مہاراشٹرا اور علاقے کنٹرا کو ریاست کرناٹک میں ضم کیا گیا۔ علاقہ تلنگانہ کو ریاست آندھرا سے جوڑ کر آندھرا پردیش بنایا گیا اور حیدرآباد کو اس کا پایہ تخت۔ اس طرح سے سلطنت حیدرآباد تین حصوں میں منقسم ہوگئی۔

دکن کی مختصر تاریخ

علاء الدین خلجی کے حملہ کے وقت دکن میں تین خود مختار سلطنتیں قائم تھیں۔مغرب میں موجودہ علاقہ مہاراشٹرا کے بڑے حصہ پر مشتمل ایک سلطنت تھی جس کا پائے تخت دیوناگری یا دیوگڑھ (دولت آباد) تھا۔یادو خاندان کا راجہ رام دیو حکومت کرتا تھا۔مشرق میں تلنگانہ (موجودہ تلنگانہ کے علاقوں کے علاوہ موجودہ آندھرا پردیش کی سرکار کے علاقہ پر مبنی) تھا کاکتیا خاندان کی عورت رودرماں دیوی حکمراں تھی۔اس کا پایہ تخت ورنگل تھا۔جنوب اور جنوب مغرب میں جو سلطنت تھی وہ ہوسلیاس (Hosalyas) کے نام سے موسوم تھی جو تقریباً موجودہ کرناٹک (میسور اسٹیٹ) پر مشتمل تھی۔ دیواسمندرم (Devasamandram) اس کا پائے تخت تھا جہاں سے راجہ حکومت کرتا تھا۔

علاء الدین خلجی نے ۱۲۹۴ء میں دکن پر حملہ کرکے ایلچ پور پر جو مہاراشٹرا سلطنت کی بڑی فوجی چھاونی تھی قبضہ کرلیا اور یہاں بہت سے صوفی اور درویش آباد ہوگئے۔یہیں سے دکن میں مسلمانوں کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔۱۳۰۶ء میں دیوگڑی راجہ نے خراج دینا بند کیا تو ملک کافور کی قیادت میں دوسرا حملہ کیا گیا۔راجہ نے بغیر لڑے اطاعت قبول کی اور خراج بحال کی گئی۔۱۳۰۹ء میں ورنگل پر حملہ ہوا تو حکمران نے صلح کرلی اور خراج دینے کا وعدہ کیا۔۱۳۱۰ء میں ملابار پر حملہ ہوا اور فوجیں بڑھتی ہوئیں رامیشورم تک پہنچ گئیں جو ہندوستان کے انتہائی جنوب میں واقع ہے جہاں ملک کافور نے ایک مسجد بھی تعمیر کی۔

خلجی دور کے بعد عہدِ تغلق میں ورنگل کی سلطنت فتح ہوئی اور ملابار تک کا علاقہ مسلمانوں کے تسلط میں آ گیا۔اتنی بڑی سلطنت کی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے پائے تخت دلی سے دولت آباد تبدیل کیا گیا مگر یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوا اور پھر پائے تخت دہلی منتقل ہوا۔۱۳۵۱ء میں محمد بن تغلق کا انتقال ہوا اور اس کی زندگی میں ہی اس کی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا۔

۱۳۴۵ء میں دکن کے مسلمانوں نے اپنی آزاد سلطنت قائم کرلی اور دو سال بعد ۱۳۴۷ء میں علاء الدین حسن بہمنی شاہ نے گلبرگہ کو پائے تخت بنایا۔ اس کی حکومت کے حدود شمال میں برار، مشرق میں تلنگانہ دریائے گوداوری تک، جنوب مشرق میں موجودہ اضلاعِ سرکار (مچھلی پٹنم، ایلورو اور خلیج بنگال کی سرحد تک)، جنوب میں دریائے کرشنا کا جنوبی علاقہ جو اس وقت رائیلسیما کہلاتا ہے (اضلاع کرنول، کڑپہ اور اننت پور)، جنوب مغرب میں حیدرآباد کے سابقہ کرناٹک کا علاقہ (اضلاعِ بیدر، گلبرگہ، رائچور)، بلاری اور مرہٹواڑے کے اضلاع شامل تھے۔ یہ سلطنت چار صوبوں پر مشتمل تھی۔ برار، مرہٹواڑہ، کرناٹک اور تلنگانہ۔ بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ء تا ۱۵۲۹ء تک قائم رہی۔ جب بہمنی سلطنت کے مرکز میں اضمحلال ہوا تو پائے تخت اور چار صوبے خود مختار ہو گئے اور اس طرح سے دکن میں حسب ذیل پانچ خود مختار سلطنتیں قائم ہوئیں :

۱- عماد شاہی	دارالحکومت	برار	۱۴۸۴ء	تا	۱۶۰۹ء
۲- برید شاہی	دارالحکومت	بیدر	۱۴۹۲ء	تا	۱۶۰۹ء
۳- نظام شاہی	دارالحکومت	احمد نگر	۱۴۹۰ء	تا	۱۵۹۵ء
۴- عادل شاہی	دارالحکومت	بیجاپور	۱۴۸۹ء	تا	۱۶۸۶ء
۵- قطب شاہی	دارالحکومت	گولکنڈہ	۱۵۱۲ء	تا	۱۶۸۷ء

۱۳۳۶ء میں وجے نگر میں ایک ہندو سلطنت قائم ہوئی اور دریائے تنگھبدرا ہندو اور مسلم مملکت میں حد فاصل کا کام انجام دیتا رہا۔ دکن میں مسلمان حکومتوں کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر ہندو اپنی طاقت مجتمع کئے اور مسلمان حکومت کو ختم کرنے کی پہلی کوشش کی اور حملہ کرکے ہزاروں مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا۔ مسجدوں کو اصطبلوں میں تبدیل کیا۔ لیکن مسلم حکومتوں کا قلع قمع نہ کر سکے۔ مسلمانوں نے سبق سیکھا اور متحد ہو کر ۱۵۶۵ء ٹالیکوٹہ کے کارزار میں وجیانگر سے فیصلہ کن معرکہ ہوا۔ مسلمان کامیاب ہوئے اور وجیانگر کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ اس لئے اسی جنگ کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر ناکام ہوتے تو چار سو سال قبل ہی دکن سے مسلمانوں کا نام مٹ جاتا۔ پھر دکن میں مرہٹوں کے عروج تک ہندوؤں کی کوئی خود مختار حکومت قائم نہ ہوتی۔

اسی زمانہ میں شمالی ہندوستان میں مغلیہ سلطنت عروج پر تھی۔ ٹالیکوٹہ کی لڑائی کے بعد مسلمانوں میں پھر انتشار پیدا ہوا۔ اس انتشار سے فائدہ اُٹھا کر مغلوں نے ایک ایک کر کے سب مسلم مملکتیں ختم کیں۔ اورنگ زیب نے ۱۶۸۷ء میں سلطنت قطب شاہی کا خاتمہ کر کے پورے دکن کو مغلیہ سلطنت کا صوبہ بنایا اور اورنگ آباد اس کا صدر مقام قرار دیا۔

سلطنت آصفیہ اور انگریز

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ جانشینی کے تنازعہ نے حکومت میں کمزوری کے آثار نمودار کیے۔ مغل دربار سازشیوں اور خوش آمدیوں کا آماجگاہ بن گیا تھا۔ اسی دوران نادر شاہ کے حملہ نے دہلی میں بڑی غارت گری کا بازار گرم کیا۔ نادر شاہ تو چلا گیا مگر دہلی کی سلطنت میں بڑا ضعف آ گیا۔ دہلی کے ان ہنگامہ خیز فضاء سے تنگ آ کر میر قمر الدین علی خاں آصف جاہ نے دکن کی صوبے داری کا انتخاب کیا اور حیدر آباد دکن میں ۱۱ر اکتوبر ۱۷۲۴ء کو سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی اور اس کی آزادی اور خود مختاری کی بنیادیں مستحکم کرنی شروع کیں۔ دہلی سے وہ برائے نام وابستہ رہے لیکن خود مختاری کا اعلان نہیں کیا۔ آصف جاہ اول اور ان کے بعد کے آصف جاہوں نے مغلیہ سلطنت کی وفاداری کا لحاظ کرتے ہوئے ماتحت گردانا اور اپنی بادشاہت کے اعلان سے گریز کیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مغلیہ سلطنت کا نام ونشان باقی نہ رہا اور انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کرلیا تب ۱۸۵۸ء میں آصف جاہ نے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کرتے ہوئے بادشاہت کا اعلان کیا۔ حیدر آباد دکن کی سلطنتِ آصفیہ ایک خود مختار مسلم مملکت کی حیثیت سے قریب سوا دو سو سال قائم رہی اور ۱۸ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو ختم ہوگئی۔

بانی سلطنت میر قمر الدین علی خاں نظام الملک آصف جاہ اول ترکستان کے معزز خاندان کے سپوت مغل دربار اور خاص طور پر اورنگ زیب عالم گیر کے آنکھوں دیکھے راسخ العقیدہ، بلند کردار، سیاسی سوجھ بوجھ کے حامل، معاملہ فہم اور ایک باصلاحیت سپہ سالار تھے۔ ۱۷۴۸ء میں انتقال کے وقت سلطنت کے حدود بڑے وسیع تھے۔ چھ صوبہ جات (۱) اورنگ آباد (۲) خاندیس (۳) برار (۴) محمد آباد بیدر (۵) بیجاپور اور (۶) حیدر آباد پر مشتمل یہ سلطنت شمال میں نربدا سے لے کر جنوب میں رامیشورم اور مشرق میں سیکاکول (موجودہ سریکاکلم) تک پھیلی ہوئی تھی۔ (تفصیل نقشہ میں

دیکھی جاسکتی ہے)
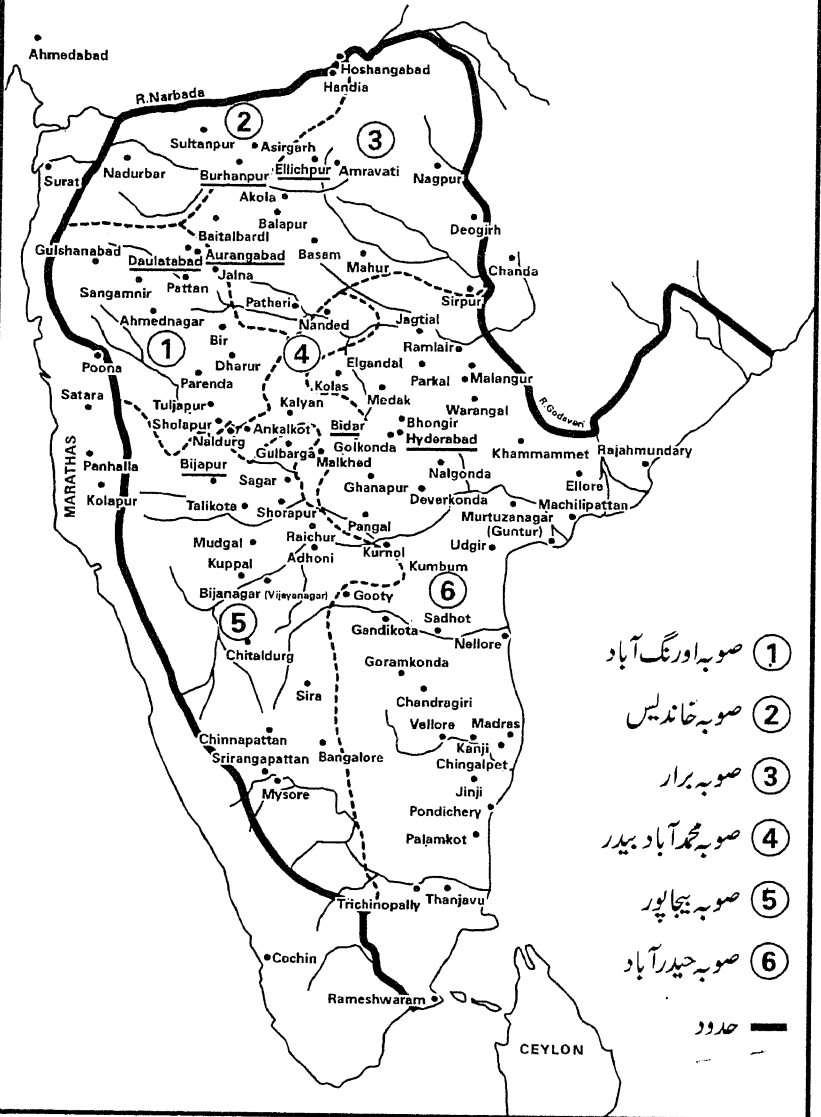
انتقال کے وقت ان کے پانچ لڑکے تھے، غازی الدین علی خاں، ناصر جنگ، صلابت جنگ، میر نظام علی خاں اور بسالت جنگ۔ ان میں اول الذکر دہلی میں تھے اور باقی سب دکن میں۔ انتقال کے بعد ناصر جنگ نے جانشینی کا اعلان کیا تو غازی الدین علی خاں دہلی سے دکن پہنچے۔ ناصر جنگ کی والدہ نے انھیں زہر دے کر ختم کیا۔ ناصر جنگ کو ان کے بھانجے مظفر جنگ نے چیالنج کیا۔ ناصر جنگ کو انگریزوں کی حمایت حاصل تھی جب کہ مظفر جنگ کو فرانسیسیوں کی۔ اس کھینچا تانی میں وہی حشر ہوا جو کہ ہونا تھا یعنی کچھ ہی عرصہ میں دونوں مارے گئے۔ ناصر جنگ کا انتقال ۱۷۵۰ء میں ہوا۔ ان کے بعد صلابت جنگ مسند نشین ہوئے جنھوں نے بارہ سال تک حکومت کی۔ ۱۷۶۱ء میں وزراء اور درباریوں نے انھیں نظر بند کر دیا اور چوتھے فرزند نظام علی خاں کو تخت نشین کیا۔ بھائیوں میں سب سے زیادہ ہوشیار اور ذی عقل تھے۔ آصف جاہ دوم کہلائے۔ بیالیس (۴۲) سال حکومت کی اور ۱۸۰۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد سکندر جاہ آصف جاہ سوم مسند نشین ہوئے اور ۱۸۲۹ء میں فوت ہو گئے۔ ان کی جگہ ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم نے لی۔ چوبیس سال بعد ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ افضل الدولہ آصف جاہ پنجم مسند نشین ہو کر ۱۸۶۹ء میں انتقال کیے۔ افضل الدولہ کے انتقال کے وقت میر محبوب علی خاں تین برس کے تھے لیکن تخت و تاج کے وارث رہے اور سن شعور پر پہنچنے پر ۱۸۸۴ء میں مسند نشین ہوئے ۱۹۱۱ء میں انتقال تک حکومت پر فائز رہے۔ ان کے بعد آصفیہ سلطنت کے آخری تاجدار نواب میر عثمان علی خاں نے ۱۹۱۱ء میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور سقوط حیدر آباد ۱۸ر ستمبر ۱۹۴۸ء تک بادشاہت پر قائم رہے۔

یہ بات وضاحت طلب ہے کہ ناصر جنگ، مظفر جنگ اور صلابت جنگ کو نظام الملک آصف جاہ کا جانشین نہیں مانا گیا اور نظام علی خاں کو بجائے نظام پنجم کہنے کے نظام ثانی کہا گیا۔

آصف جاہ اول کے زمانہ سے ہی انگریزوں کی آمد کا سلسلہ حیدر آباد میں شروع ہوا اور دوستانہ تعلقات کی ابتداء ہوئی۔ ان کا منحوس سایہ جو اس سلطنت پر پڑا ایک گھن سا لگا اور آخر کار ان کی مکارانہ چالوں نے اس سلطنت کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ آصف جاہ اول کے زمانہ میں انگریز کوئی گل نہ کھلا سکے البتہ صلابت جنگ اور میر نظام علی خاں آصف جاہ دوم انگریزوں کے لئے بڑے کار آمد ثابت ہوئے۔ آصف جاہ دوم اپنے جد کی خصوصیات سیاسی سمجھ بوجھ، فراست اور سپاہ گری سے ہٹ کر موقعہ

پرستی اور دولت کی لالچ کی طرف مائل ہوئے۔ اس سے انگریزوں نے خوب فائدہ اُٹھایا۔

انگریزوں کے ساتھ فرانسیسی بھی اپنے رسوخ بڑھانے کی کوشش میں تھے۔ صلابت جنگ کے دربار میں فرانسیسی چھائے ہوئے تھے۔ انگریزوں نے موقعہ کی تلاش میں رہ کر فرانسیسی جاگیرات پر حملہ کیا جو صلابت جنگ کو ناگوار ہوا اور انگریزوں کے خلاف فوج کشی کا ارادہ کیا لیکن انگریزوں نے پیش قدمی کر کے صلح کی درخواست کی۔ ۱۷۵۹ء کے سب سے پہلے تہہ نامے کے ذریعہ صلابت جنگ نے سمندری راستہ والا علاقہ مچھلی پٹنم اور نظام پٹنم بطورِ انعام حوالے کیا اور انگریزوں سے فوجی مدد کا وعدہ لیا۔ اس طرح فرانسیسیوں سے تعلقات منقطع ہوئے۔ اس تہہ نامہ پر ابھی عمل درآمد نہ ہوا تھا کہ
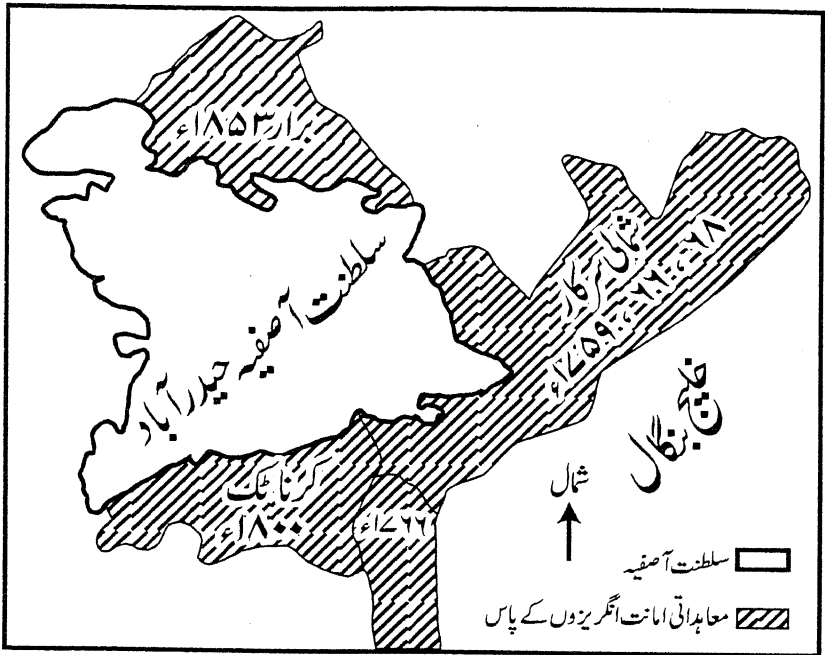
انگریزوں نے ۱۷۶۵ء میں قانون کے بالکل خلاف بالا بالا انداز میں شاہ دہلی سے شمالی سرکار کی سند حاصل کر لی۔ نظام علی خاں کو بہت ناگوار گذرا۔ انگریزوں نے نظام علی خاں کے بدلے تیور دیکھ کر صلح کر لینا موزوں سمجھا۔ چنانچہ ۱۷۶۶ء ایک تہہ نامہ کے ذریعہ شمالی سرکار کے علاقے یعنی سیکاکول، راجمندری، ایلور، مرتضیٰ نگر (گنٹور) اُن کے قانونی مالک سے اس شرط پر حاصل کئے کہ سالانہ (۷) لاکھ روپئے خراج دیں گے۔ یہ بھی وعدہ کیا کہ انگریز نظام کی ہر ضرورت پر فوج کی مدد کریں گے۔ اگر

اس فوج کے اخراجات خراج سے کم ہیں تو بعد منہائی باقی رقم دی جائے گی۔ اگر زیادہ ہوئی تو مزید رقم کا مطالبہ نہ ہوگا۔ فوجی خدمات کا یہ پہلا داؤ تھا جس میں نظام کو پھانسا گیا۔ اس عہد نامہ کے تحت ایک مستقل فوج نظام کے لئے تیار رکھنی تھی۔ لیکن جب انگریز مقبوضات کو حیدر علی سے خطرہ لاحق ہوا تو اس فوج کو ۱۷۶۷ء میں حیدر آباد سے واپس بلوالیا گیا۔ اس طرح سے شمالی سرکار اور مشرقی علاقے کے سمندری علاقوں سے نظام کو ہاتھ دھونا پڑا۔ پھر اسی طرح سے اپنے مکار چالوں سے نظام علی خان کو حیدر علی سے منحرف کرواکر ۱۷۶۸ء میں کرناٹک سے وصول ہونے والی دیوانی (۷) لاکھ روپئے ایک معاہدہ کے تحت انگریزوں نے اپنے لئے کروالئے تاکہ انگریز نظام علی خان کی خدمت کے لئے فوج تیار رکھیں۔ ان مکارانہ چالوں سے ایک اور معاہدہ ۱۷۹۸ء میں کروایا جس کی رُو سے انگریز نظام کی حفاظت کے لئے صیانتی فوج رکھیں گے۔ جس کا خرچ نظام اُٹھائیں گے اور فرانسیسی افواج کو آئندہ کمپنی کی اجازت کے بغیر نہیں رکھیں گے۔ یہ انگریز ڈپلومیسی کا شاندار کارنامہ تھا۔ اس طرح سے انگریز فوجی نقطہ نظر سے نظام پر چھاگئے۔

دکن میں آصف جاہ اول کے وقت انگریز قدم نہیں جمائے تھے اور مرہٹے بھی سر نہیں اُٹھائے تھے۔ صلابت جنگ اور نظام علی خان آصف جاہ دوم کے زمانہ میں انگریز قدم جما کر دکن میں ایک طاقت بن گئے تھے۔ اس وقت سیاسی صورتِ حال کچھ اس طرح سے ہوگئی کہ دکن میں چار طاقتیں برسرپیکار ہوگئیں۔ ایک نظام، دوسرے مرہٹے، تیسرے میسور کے حکمراں (حیدر علی اور ٹیپو) اور چوتھے انگریز۔ مرہٹے دکن میں مسلم سلطنت کے باقیات کے مخالف تھے اور انگریز بھی دکن میں اپنے قدم جمانے کے لئے مسلم اقتدار اور مرہٹوں کے خاتمہ کے درپے تھے۔ اس طرح سے مسلم مملکتوں (نظام اور ٹیپو) کے مشترکہ دشمن مرہٹے اور انگریز تھے۔ ظاہر ہے مقابلہ کے لئے دونوں مسلم مملکتوں کا اتحاد ضروری تھا۔ نظام پہلے مرہٹوں سے نمٹنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہاں انگریز مستقل طور پر نہیں رہ سکتے[1] جب کہ ٹیپو پہلے انگریزوں سے نمٹنا چاہتے تھے۔

دکن کے حکمرانوں کو یہ زعم باطل بھی تھا کہ اپنے سوا دوسروں کو شریف نہیں سمجھتے تھے اور میسور کے حکمرانوں (حیدر اور ٹیپو) کو نائیک سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے۔ حیدر علی سری رنگا پٹنم کی فوج میں

---

[1] آصف سابع اور مملکت حیدر آباد، شائع کردہ بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی صفحہ ۱۵۳ و ۱۵۴

ایک معمولی عہدہ نائیکی پر فائز ہوتے ہوئے اپنی بہادری اور چالاکی سے سپہ سالاری پر فائز ہوئے اور بعد میں میسور کے راجہ کو نظر بند کر کے خود حکمراں بن گئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے ٹیپو حکمراں ہوئے اور سلطان کا لقب اختیار کیا۔ اس طرح سے ٹیپو سلطان آصف جاہ کی نگاہوں میں ایک معمولی آدمی تھے۔[۲]

صلابت جنگ اور آصف جاہ دوم کی کمزوریوں کی وجہ سے دکن کے اس بڑے خطے کے کئی علاقوں پر آصف جاہی قبضہ یا کنٹرول باقی نہ رہا اور کئی علاقے باجگذار نہ رہے۔ سری رنگا پٹنم اور میسور ان ہی میں سے تھے۔ اسی وجہ سے آصف جاہ دوم ابتداء ہی سے میسور کے حکمرانوں سے دوستانہ اور مفاہمانہ تعلقات رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ انھیں باجگذار ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ٹیپو سلطان کو باجگذار بنائیں۔ اسی لئے اپنے مقصد کے حصول کے لئے موقعہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ ٹیپو سلطان کے خلاف جب بھی جنگ ہوتی تو وہ انگریز یا مرہٹوں سے مل جانے کا کوئی موقعہ کھونا نہیں چاہتے تھے۔[۳] اپنے جد کی فن سپاہ گری سیاسی سمجھ بوجھ، فراست اور وسیع القلبی سے محرومی نے موقعہ پرستی اور دوسروں کا سہارا لینے پر مجبور کیا۔

ٹیپو سلطان انگریزوں کے سخت دشمن تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریز دکن میں قدم جمائیں۔ انگریز نظام اور مرہٹوں سے مفاہمانہ پالیسی اختیار کئے ہوئے تھے اور ٹیپو سلطان کے خاتمہ کے درپے تھے۔ ٹیپو سلطان نے نظام اور مرہٹوں سے اتحاد کی بڑی کوشش کی لیکن کوئی معاہدہ یا اتحاد نہ ہو سکا چوں کہ نظام اور مرہٹے نہ صرف پر خلوص نہ تھے بلکہ وہ ٹیپو سلطان کی سرکوبی کے جذبات رکھتے تھے۔ حیدرآباد میں ہمیشہ سے ایک انگریز موافق ٹولی موجود تھی جو نظام اور ٹیپو سلطان میں تعلقات استوار ہونے نہ دیتی تھی۔[۴]

جب انگریزوں نے گنٹور پر جبراً قبضہ کرنا چاہا تو اگست ۱۷۸۷ء میں نظام نے ٹیپو سلطان سے معاہدہ کی پیش کش کی۔ ٹیپو سلطان نے قبول کیا اور تعلقات کو مزید مستحکم بنانے کے لئے نظام کی بیٹی سے اپنے لڑکے کے رشتہ ازدواج کی تجویز بھی رکھی۔ لیکن نظام نے رشتہ ازدواج کو پسند نہیں کیا

---

۲ آصف سابع اور مملکت حیدرآباد، شائع کردہ بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی صفحہ ۱۵۳ و ۱۵۴

۳ ہسٹری آف ماڈرن دکن، شائع کردہ ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹیٹوٹ حیدرآباد صفحہ ۹۹ اور ۱۰۰

۴ ہسٹری آف ماڈرن دکن، شائع کردہ ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹیٹوٹ حیدرآباد صفحہ ۹۹ اور ۱۰۰

اور معاہدہ طے نہیں پاسکا۔ جب گنٹور پر انگریزوں کے قبضہ کا خطرہ بڑھا تو نومبر ۱۷۸۸ء نظام نے دوبارہ معاہدہ کی تجدید کی جس کو ٹیپو سلطان نے قبول کرتے ہوئے رشتہ ازدواج کی تجویز کو دہرایا اور بات چیت کو قطعیت دینے کے لئے اپنے وکیل قطب الدین خان اور علی رضا خان کو حیدرآباد بھیجا۔ لیکن نظام معاہدہ کے معاملہ میں پرخلوص نہ تھے انھوں نے ایک طرف ٹیپو سے اور دوسری طرف انگریزوں سے بات چیت کے لئے میر عالم کو کلکتہ بھیجا تاکہ پتہ چلایا جائے کہ کن سے زیادہ فائدہ حاصل ہوگا۔[5]

انگریزوں نے جب ٹیپو سے معاہدہ کی بو سونگھی تو مکارانہ چالوں میں سرعت پیدا کی۔ نظام اور ان کے مشیر اور درباریوں کو یہ باور کروایا کہ ٹیپو کے ارادے خطرناک ہیں اور نظام کی سلطنت پر ان کی نگاہ ہے۔ لارڈ کارنوالس نے نظام کو لالچ دیا کہ وہ انگریزوں کا ساتھ دیں تو میسور کی سلطنت فتح کر کے ان کے حوالے کردیں گے۔ درباریوں نے اپنا کام کیا۔ نظام نے اسے زیادہ فائدہ مند سمجھا اور انگریزوں کا ساتھ دیا۔ رشتہ ازدواج یہ کہہ کر نامنظور کیا کہ ٹیپو ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں[6] ٹیپو یکا و تنہا ہو گئے لیکن ہمت نہ ہارے ایک مرد مجاہد کی طرح لڑتے ہوئے ۱۷۹۹ء میں شہید ہو گئے۔ ٹیپو سلطان کے شہید ہونے کے بعد انگریزوں نے جنوبی ہند پر اپنا تسلط قائم کرلیا۔

میسور کی جنگ میں کامیابی کے بعد حسبِ وعدہ میسور کا علاقہ نظام کو دیا جانا چاہیئے تھا۔ بجائے اس کے راجگان میسور کے قدیم خاندان کے حوالے کردیا گیا کیوں کہ انگریز کو خدشہ تھا کہ نظام طاقتور ہو جائیں گے۔ تاہم بلاری اور کڑپہ کے علاقے مال غنیمت کے عوض نظام کو ملے۔ اس کی آمدنی ایک کروڑ روپئے سالانہ تھی۔ یہ بھی انگریز کو کھٹکنے لگی۔ چنانچہ اس سے محروم کرنے کے لئے ۱۸۰۰ء میں ایک معاہدہ طے کیا گیا جس کی رُو سے دونوں حکومتوں پر کسی تیسری طاقت کا حملہ ہو تو دونوں مل کر مقابلہ کریں گے اور انگریز اپنے علاقوں کی طرح نظام کی حفاظت کریں گے۔ اس حفاظت کے لئے مزید فوج رکھی جائے گی جس کے اخراجات کی پابجائی کے سلسلہ میں بلاری، کڑپہ وغیرہ کے علاقے جو میسور کی جنگ سے حاصل ہوئے تھے انگریزوں کو واپس دیئے جائیں گے اور کمپنی کی رضامندی کے

---

[5] ٹیپو سلطان از ڈاکٹر شیخ علی، شائع کردہ ٹیپو سلطان ریسرچ سنٹر حیدرآباد صفحہ ۲۲ و ۲۳

[6] ٹیپو سلطان از ڈاکٹر شیخ علی، شائع کردہ ٹیپو سلطان ریسرچ سنٹر حیدرآباد صفحہ ۲۲ و ۲۳

بغیر نظام کسی اور طاقت سے تعلقات نہیں رکھیں گے۔ دوسری طاقتوں سے نظام کے تنازعہ کی صورت میں کمپنی ثالث ہوگی اوراس کا فیصلہ قطعی ہوگا۔ یہ وہ فیصلہ تھا جس نے حیدرآباد کواس کی خارجی آزادی سے محروم کردیا۔ اور حیدرآباد کی آزاد حیثیت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ اس کو ۱۸۰۰ء کا عہد معاونت (Subsidiary alliance) کہتے ہیں جس نے حیدرآباد کی آزادی کوسلب کر کے رکھ دیا۔ آصف جاہ دوم نے نہ صرف اپنی سلطنت کے ایک بڑے حصے کو خود اپنے ہاتھوں سے دوسروں کے حوالے کردیا بلکہ سلطنت حیدرآباد کی آزادی کا سودا کرنے کے رسوا کن عمل کے مرتکب ہوئے۔ کاش فراست اور وسیع القلبی سے کام لے کر مرد آہن ٹیپو سلطان کا ساتھ دیتے تو بجائے انگریزوں کے شکار ہونے کے انگریزوں کا دیس نکالا کرتے۔

سمندری راستے کا کٹ جانا اس سلطنت کو ہمیشہ کے لئے باہر کی دنیا سے بے ربط کردیا۔ دفاع کے لئے اپنی فوج کے بجائے انگریزوں پر تکیہ کیا۔ انگریزوں کو خارجی اُمور میں ثالث تسلیم کر کے ریاست کو بے بس کردیا۔ سلطنت آصفیہ کواس فرمانروا سے جونقصانِ عظیم ہوا پھر اس کا ازالہ نہ ہوسکا۔ ٹیپو سلطان کے ساتھ نظام کے رویہ پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ کاش نظام دوم میں اپنے جد کی جذبہ فن سپاہ گری، فراست اور وسیع القلبی ہوتی تو ٹیپو سلطان شہید نہ ہوتے اور دکن میں انگریزوں کا تسلط نہ ہوتا۔ ٹیپو سلطان کو انگریز جیسی مکار قوم کے مقابلے یکا وتنہا چھوڑ دیا گیا۔ اس مرد مجاہد نے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر سمجھی بجائے گیدڑ کی سودن کی زندگی کے۔ یکا وتنہا شیر کی طرح لڑتے ہوئے شہید ہوگیا۔ آج بھی ٹیپو سلطان کی مزار پر جائیں تو ایک روحانی کیفیت چھائی سی محسوس ہوتی ہے اور پکارتی ہے کہ زندہ رہیں تو ایسے شہید بن کر زندہ رہیں۔ جذبات کو قابو میں رکھنا مشکل ہوجاتا ہے اور ذہن پر ایک بوجھ سا چھایا رہتا ہے کہ مردِ مجاہد کا ساتھ نہ دے کر کتنی عظیم غلطی کی گئی۔

۱۸۰۳ء میں نظام علی خان کا انتقال ہوا تو سکندر جاہ مسند نشین ہوئے۔ نظام علی خان کے عہد تک انگریزوں نے اندورنی مداخلت نہیں کی۔ اگرچیکہ ۱۷۷۸ء میں حیدرآباد میں انگریزوں کا ریذیڈنٹ مقرر رہا تا کہ انگریزوں کے مفادات کی نگرانی کرے اور نظام پر نگاہ رکھے۔ سکندر جاہ کے زمانے سے اندرونی مداخلتیں شروع ہوئیں۔ ۱۸۰۴ء میں ارسطو جاہ صدارالمہام کے انتقال کے بعد انگریزوں نے میر عالم کو مسلط کیا جنھوں نے انگریزوں کے اثر کو بڑھانے میں کافی مدد کی۔ میر عالم

نے چندولال کو اپنا پیش کار بنایا۔ یہ انگریزوں کی معاونت کے لئے میر عالم سے آگے تھے۔ ان دونوں نے مل کر سلطنت کے مفاد کو متاثر کیا اور انگریزوں کے زیر اثر لایا۔ صیانتی فوج حیدرآباد کے لئے انگریز رکھنے کے پابند تھے۔ ضرورت کے وقت اس فوج کو بھیجنے میں حیلے حوالے ہوتے رہے۔ گورنر جنرل نے اصرار کیا کہ صیانتی فوج کے علاوہ مزید فوج رکھی جائے جس کے لئے نظام راضی نہ ہوئے۔ بالآخر ریذیڈنٹ نے چندولال پیش کار کو موافق بنالیا اور باہمی اتفاق سے دو ہزار سواروں کی فوج تیار کرلی۔ جس کے سالانہ اخراجات (۴۰) لاکھ نظام کے خزانے پر عائد ہونے لگے اور اس فوج کو ریذیڈنٹ کے ماتحت رکھا گیا۔ اس کی وجہ سے ریاست پر بڑا مالی بوجھ پڑنے لگا اور خسارہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ تنخواہیں ریذیڈنٹ کے خزانے سے ادا ہونے لگیں۔ انگریز کمپنیوں سے قرض لیا جانے لگا۔ انگریزوں کی مداخلت دن بہ دن بڑھتی گئی۔ ۱۸۵۰ء میں قرض (۷۰) لاکھ روپئے سے تجاوز کرچکا تھا۔ انگریزوں کے مطالبے پر نظام نے قرض کی ادائی کی مہلت لی لیکن اس مہلت میں بھی قرض ادا نہ ہوا۔ اب برار کو ہڑپ کرلینے کے منصوبے تیار ہونے لگے۔ معاہدہ کا مسودہ بھیجا گیا۔ لیکن نظام نے قبول نہیں کیا تو دھمکیاں دی گئیں کہ فوجی حملے کے ذریعہ ریاست اور نظام کا خاتمہ کیا جائے گا۔ دباؤ اور دھمکیوں سے جبراً معاہدہ پر دستخط لئے گئے اور برار کو ۱۸۵۳ء میں حاصل کرلیا گیا۔ پھر ۱۹۰۲ء میں معاہدہ کے ذریعہ برار کو دوامی پٹہ پر اس شرط کے ساتھ حاصل کرلیا گیا کہ اس کا انتظام جس طرح چاہے وہ کرلیں اور اس کے عوض سالانہ (۲۵) لاکھ روپئے مستقل خراج ادا کریں گے۔

۱۸۵۷ء میں ناصر الدولہ کا انتقال ہوا۔ ان کی جگہ افضل الدولہ تخت نشین ہوئے۔ اسی دوران ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (غدر) برپا ہوئی۔ حیدرآباد میں انگریزوں کے ناجائز استحصال کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف شدید جذبات تھے۔ اس کے باوجود نظام نے انگریزوں کا اپنی پوری طاقت سے ساتھ دیا۔ یہ نظام کی دوسری بڑی غلطی تھی۔ جب کہ انگریز اپنی موت وزیست سے دوچار تھے۔ گورنر بمبئی نے حیدرآباد کے ریذیڈنٹ کو تار دیا تھا کہ اگر نظام ساتھ نہ دیں تو سب کچھ ختم ہوجائے گا۔ انگریزوں نے قرض معاف کردیئے جو حیدرآباد کے لئے کچھ نہ تھا۔ افضل الدولہ کے انتقال کے بعد ۱۸۸۴ء میں میر محبوب علی خان مسند نشین ہوئے اور اُن کے انتقال کے بعد ۱۹۱۱ء میں آخری نظام میر عثمان علی خان نے اقتدار سنبھالا۔ اس وقت سلطنت آصفیہ کے جغرافیائی حدود کٹ چھٹ کر ایک

ایسے جزیرہ کے مانند ہو گئے جس کے ہر سو برٹش گورنمنٹ تھی۔

نظام آخر کے مسند نشین ہونے کے تین سال بعد ہی پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ نظام نے انگریزوں کو اس نازک موقع پر دل کھول کر ہر لحاظ سے مدد کی۔ سلطنت کے سارے ذرائع برطانیہ کے لئے وقف کر دیئے۔ (۶۲) کروڑ روپئوں سے زیادہ مالی و جنگی امداد کی۔ ان گراں قدر احسانات کا بدلہ یارِ وفادار (Faithful Ally of British Govt) اور ہزاِ گزالٹڈ ہائینس (His Exalted Highness) کے القاب سے نواز نے کے سوا کچھ نہ دیا۔ دیگر ریاستوں کے روساء کو ہز ہائینس (His Highness) سے خطاب کیا جاتا تھا اب انھیں ہزاگزالٹڈ ہائینس کے خطاب سے ممیّز کیا گیا تھا۔ جنگ عظیم کے بعد انگریز حکومت بڑی مشکلوں میں گھر گئی اور جب یہ دور ختم ہوا تو ۱۹۳۲ء میں نظام نے برار کی واپسی کا مطالبہ کیا اور ایک یادداشت لارڈ ریڈنگ کو بھیجی جس کے جواب میں لارڈ ریڈنگ نے نظریہ اقتدار اعلیٰ (Paramountcy) کو علی الاعلان مسلط کرتے ہوئے کہا کہ برطانوی حکومت کو جو بالا دستی حاصل ہے وہ ازروئے معاہدات نہیں بلکہ ازروئے فرمانروائی ہے۔ صریحاً جھوٹ اور طاقت کے بل بوتے ناجائز فائدہ اُٹھانا ہے۔ وائسرائے کے اس ناروا سلوک پر نظام خاموشی اختیار کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ انگریز نظام کے آنسو پوچھنے کے لئے ولیعہد کو پرنس آف برار کا خطاب دے کر خوش کرنے کی کوشش کی۔

غدر کے بعد ۱۸۶۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کو قانوناً ختم کر کے تاج برطانیہ کی حکومت سارے ہندوستان پر قائم کی گئی تو اس وقت ہندوستان میں انگریزوں کے مقابل کوئی طاقت نہ تھی۔ پیرامونٹسی (Paramountcy) کے نظریہ کو مسلط کر کے علی الاعلان اقتدارِ اعلیٰ کو تمام ریاستوں بشمول حیدرآباد پر مسلط کیا گیا۔ سلطنت حیدرآباد باوجود آزاد ہونے کے مغلوب رہی۔

حیدرآباد کے اہم ساحلی اور غیر ساحلی علاقے یعنی شمالی سرکار، راجمندری، مچھلی پٹنم، نظام پٹنم، ایلور، مرتضیٰ نگر، کڑپہ، کرنول، بالاگھاٹ، کرناٹک کے علاقے، بیجاپور، بھدراچلم، برار وغیرہ انگریزوں کو جو دیئے گئے تھے وہ خراج کے طور پر نہیں بلکہ بضمن فوجی اخراجات اور خدمات انجام دہی کے لئے تھے۔ یعنی ان کی نوعیت مشروط الخدمت جاگیرات تھی۔ اس لئے بہادر یار جنگ مجلس کی بنیادی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے بارہا کہا کرتے تھے کہ حیدرآباد ہر دور میں آزاد رہا ہے اور فوج کو

عصری بنانے میں وہ آزاد ہے اسی لئے وہ آئندہ بھی آزاد رہے گا۔ سلطنت برطانیہ سے اس کے تعلقات دوستانہ اور حلیفانہ ہیں نا کہ ایک باجگذار کے اسی لئے یہ تعلقات ایسے ہیں کہ کسی کو منتقل یا فروخت نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے باوجود نظام میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان مقبوضات کو دوبارہ حاصل کر سکیں۔

سلطنت حیدرآباد اور رعایا

ساحلی اور غیر ساحلی علاقے کے ایک بڑے حصے کو مختلف معاہدات کے تحت انگریزوں کے حوالے کرنے کے بعد ریاست حیدرآباد صرف (۸۲۶۹۸) مربع میل پر محیط ہوگئی تھی جو برٹش انڈیا (موجودہ ہندوستان) سے گھری ہوئی تھی۔ کوئی سمندری راستہ نہ تھا۔ رقبہ کے لحاظ سے یورپ کی اہم مملکتوں جیسے برطانیہ اور فرانس سے کم نہ تھی۔

رقبہ کا قریب ایک تہائی حصہ صرفخاص اور جاگیرات پر مشتمل تھا باقی دو تہائی دیوانی پر تھا۔ اسی دیوانی کی آمدنی سے ریاست کے سارے کام چلتے تھے۔ صرفخاص اور جاگیرات کے علاقے بہت پسماندہ تھے۔ عہد عثمانی میں ریاست نے سب سے زیادہ ترقی کی۔ نظم ونسق، عدلیہ، تعلیم، زراعت، تجارت، صنعت، طبابت وغیرہ ہر لحاظ سے ترقی یافتہ تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور اس کے تحت کالجس قائم تھے۔ گاؤں، تعلقہ اور ضلع کی سطح تک تحتانوی اور ثانوی تعلیم کا انتظام تھا جہاں مفت تعلیم ہوتی تھی۔ شہر حیدرآباد میں عثمانیہ دواخانہ، یونانی دواخانہ اور ضلع اور تعلقہ سطح پر دواخانوں کا جال بچھا ہوا تھا جہاں مفت علاج ہوتا تھا۔ نظام ساگر، عثمان ساگر، حمایت ساگر، علی ساگر اور کئی ایسے پراجکٹ تعمیر ہوئے۔ تنگبھدرا پراجکٹ زیر تعمیر تھا، ناگرجنا ساگر پراجکٹ کے نقشے اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ ان پراجکٹس کی وجہ سے زراعت میں کافی ترقی اور سہولتیں ہوئیں۔ شکر سازی، کاغذ سازی، سمنٹ، کوئلہ جیسی کئی صنعتیں قائم ہوئیں۔ ریاست نہ صرف خود مکتفی تھی بلکہ اپنی اشیاء بھی برآمد کرتی تھی۔ روئی اور تیل کے بیجوں کی بڑے پیمانے پر برآمد کی جاتی تھی۔

اس کی اپنی کرنسی تھی۔ قومی زبان اُردو میں نوٹ چھاپے جاتے تھے اور سکے ڈھالے جاتے تھے۔ ایک بڑا ٹکسال تھا جو کرنسی اور سکے بناتا تھا۔ اس کا اپنا ڈاک ٹکٹ تھا اور ڈاک کی ترسیل کا بہترین انتظام تھا۔ اس کی اپنی فوج تھی اگرچہ تعداد میں حکومت ہند کی فوج کے مقابلہ میں کم تھی لیکن بڑی

کارکردتھی اور آزاد مملکت کی حفاظت کے قابل تھی۔ٹیلیفون کا انتظام تھا۔لاسلکی اور رسل ورسائل کی سہولتیں تھیں۔اس کا اپنا قومی پرچم تھا جوقومی تہواروں کے موقعہ پرلہرایا جاتا تھا۔مذہبی آزادی تھی۔ فرمانروا مذہبی معاملہ میں بالکل مداخلت نہ کرتے تھے بلکہ مذہبی اُمور کی دیکھ بھال کے لئے ایک سرکاری محکمہ تھا جو اس بات پر نگرانی کرتا تھا کہ مذاہب کے اُمور کی انجام دہی اسی مذہب کے اُصولوں کے مطابق ہو۔ یہ محکمہ، محکمہ اُمور مذہبی کے نام سے موسوم تھا۔یہی ایک بڑی وجہ تھی کہ مذہبی تعصب جنم نہ لے سکا۔۱۹۳۱ء کے اعداد شمار کے لحاظ سے (۳۱۳۷۲) منادر، (۵۱۹۱) مساجد اور (۱۱۰) چرچ تھے جن کی نگہداشت کی جاتی تھی۔بادشاہ بالکل سیکولر تھے۔کسی گوشہ سے کوئی مذہبی مداخلت نہیں ہوتی تھی۔ ہرلحاظ سے بڑی ترقی یافتہ ریاست تھی۔

آبادی ایک کروڑ چونسٹھ لاکھ تھی جس میں مسلمان تیس (۳۰) لاکھ یعنی اٹھارہ فیصد، شیڈ ولڈ کاسٹ اور شیڈ ولڈ ٹرائبس (۶۰) لاکھ یعنی چھتیس فیصد، سکھ، عیسائی اور پارسی (۷) لاکھ یعنی قریب پانچ فیصد اور باقی ہندو (۶۷) لاکھ یعنی اکتالیس فیصد یا یوں کہیں کہ مسلمان (۱۸) فیصد اور ہندو بشمول شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس (۷۷) فیصد۔عام طور پر مسلمانوں کا تناسب (۱۵) فیصد اور غیر مسلموں کا تناسب (۸۵) فیصد شمار کیا جاتا تھا۔

حیدرآباد کی منفرد تہذیب اس کی اپنی شناخت بن گئی تھی۔ جو کچھ بھی تھی اُس کی اپنی تھی اور وہاں کے ماحول سے پیدا ہوئی تھی۔ بیرونی تہذیبی اثرات سے غیر متاثر تھی۔سلیقہ، رہن سہن کے طریقے، تہذیبی آداب اور وضع داری اس کی اپنی خاص تھی۔لباس خاص طور سے شیروانی پہننا ہر دو فرقوں میں اتنا عام تھا کہ ہندو مسلم میں تمیز کرنا مشکل تھا۔آج بھی جب اس کی باقیات نظر آتی ہیں تو ماضی کا حیدرآباد آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔

مسلمان، ہندو اور دیگر تمام طبقوں میں مخلصانہ اور برادرانہ تعلقات تھے۔ایک دوسرے کے عید اور تہوار میں شریک ہوتے۔شادی بیاہ کے وقت ایک خاندان جیسی کیفیت رہتی۔نیوتا (شادی بیاہ کے وقت رشتہ داروں اور دوستوں کو کپڑے بنائے جاتے ہیں اس کو نیوتا کہا جاتا ہے) اور تحائف دونوں فرقوں میں ہوا کرتے تھے۔دعوت اور نیوتا میں برابر سلوک نہ ہوتا تو خاندانی افراد کی طرح شکایتیں بھی ہوتی تھیں جو پیار و محبت سے دور کرلی جاتی تھیں۔ ہندو مسلم برادرانہ تعلقات کی ایسی

مثال ہندوستان میں مشکل سے ملتی تھی۔ کبھی بھی فرقہ واریت داخل نہیں ہوئی۔ حتی کہ سارے ہندوستان میں تحریک آزادی کے دوران ہندو مسلم تعلقات متاثر نہیں ہوئے۔ ہندوستان بھر میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے لیکن حیدرآباد نے اپنی روایات کو برقرار رکھا اور کوئی فساد نہ ہوا۔ تقسیم ہند کے فوری بعد بھی جب کہ فسادات کا بازار گرم ہوا تھا اور لاکھوں جانیں گئی تھیں، کروڑوں روپیوں کی املاک تباہ ہوئی تھی حیدرآباد نے امن اور رواداری کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

مذہبی رواداری تو مثالی تھی کسی کے مذہب میں مداخلت نہیں کی جاتی تھی۔ حکومت کی جانب سے ہندوؤں، پارسیوں اور سکھوں کی مذہبی عبادت گاہوں کو بڑی جاگیریں (مشروط الخدمت) اور فراخدلانہ مالی امداد دی جاتی تھی۔ (۵) ہزار مسلم اداروں کے مقابلے (۱۱۳۵۵) ہندو اور دیگر اداروں کو نقد معاش مقرر تھی۔ مندروں کے لئے جو جاگیریں عطاء کی گئی تھیں ان کی آمدنی سالانہ (۵) لاکھ روپئے تھی۔ شہر حیدرآباد کے سیتارام باغ مندر کی آمدنی (۵۰) ہزار روپئے سالانہ تھی۔ اس کے علاوہ (۱۲۵) مسلم ادارے، مساجد، مقبرے اور عاشور خانوں کا انتظام بالکل ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا جس کے لئے انھیں معاش اور امداد مقرر تھی۔ مندر کے پجاریوں کے علاوہ (۵۴) شاستریوں اور (۵۶) بھجن گانے والوں کو سرکاری تنخواہیں مقرر تھیں۔ حیدرآباد کے باہر بھی مندروں کو امداد دی جاتی تھی۔ مدراس کے بھدراچلم اور چنگل پیٹھ مندر کو سالانہ قریب (۲۰) ہزار روپئے کی امداد دی جاتی تھی۔ برار کے بالاجی مندر، شولاپور کے مہندرپور مندر امداد سے مستفید ہوتے تھے۔ مسلم اداروں کے (۹۴۶۰) روپئے سالانہ امداد کے مقابل ہندو اداروں کو قریب (۹۸) ہزار روپیوں کی امداد ملتی تھی۔ ہندو منادر کے لئے (۲) لاکھ ایکڑ سے زیادہ اراضی جاگیر اور معاش کی صورت میں دی گئی تھی۔

معاشی لحاظ سے ہر دو طبقے مطمئن تھے۔ معاشی خوش حالی تھی۔ ہندو طبقہ معاشی اعتبار سے کافی مراعات یافتہ تھا جس کے لئے یہ طبقہ آج بھی بڑا احسان مندی کے جذبات رکھتا ہے اور اس دور کو یاد کرتا ہے اور آج کے دور پر افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آزادی کے بعد بھی انھیں اب وہ مراعات حاصل نہیں جو نظام کے دور میں تھیں۔ معیشت کے تمام ذرائع پر ہندو قابض تھے زراعت، صنعت و حرفت، تجارت، ساہوکاری ان کے ہاتھ میں تھی دیہی عہدے پٹیل، پٹواری وغیرہ سب ان کے قبضے میں تھے۔ مسلمان صرف ملازمت پر قناعت کرتے تھے۔ دیہی خدمات موروثی تھیں جب کہ

سرکاری ملازمت موروثی نہیں تھی۔ رعایا سے انکم ٹیکس یا سیلز ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا جس کا سب سے زیادہ فائدہ ہندو ہی اُٹھاتے تھے۔

بدر شکیب نے (۱۹۳۱ء) کی مردم شماری کے حوالے سے معیشت سے متعلق حسب ذیل اعداد و شمار پیش کئے ہیں :

نمبر شمار	ذریعہ معیشت	تعداد جملہ افراد	ہندو	مسلم	فیصد تناسب ہندو	فیصد تناسب مسلم
۱	زراعت	۶,۹۴۷,۹۱۳	۶,۰۸۱,۷۱۳	۵۸۱,۷۴۸	۸۷	۸
۲	صنعت و حرفت	۱,۷۱۱,۸۳۷	۱,۵۷۸,۲۹۹	۸۹,۹۷۳	۹۲	۵
۳	ذرائع نقل و حمل	۱۹۳,۰۸۷	۱۵۳,۱۵۹	۲۴,۱۱۹	۷۹	۱۲
۴	تجارت	۱,۲۱۸,۶۹۶	۱,۰۳۰,۳۰۷	۱۵۲,۵۷۸	۸۵	۱۳
۵	فوج و پولیس	۲۲۶,۲۲۲	۱۶۶,۲۸۶	۴۹,۵۶۵	۷۴	۲۲
۶	سرکاری ملازمت	۳۳۵,۴۵۹	۲۱۸,۶۷۹	۱۰۵,۹۴۹	۶۵	۳۲
۷	پیشے اور حرفتیں	۲۰۱,۴۱۱	۱۴۳,۰۶۳	۴۶,۵۸۹	۷۱	۲۳
۸	خانگی ملازمت	۳۴۴,۵۰۳	۲۳۴,۵۶۸	۵۷,۷۵۸	۶۸	۲۵
۹	ایسے پیشے جن کی تفصیلات ناکافی	۹۴۲,۸۷۷	۷۹۵,۱۰۲	۹۲,۱۰۵	۸۴	۱۰

(حیدرآباد کا عروج و زوال صفحہ ۸۸ و ۸۹)

اس تقابل سے ظاہر ہے کہ ہندو معیشت کے ہر شعبۂ میں مسلمانوں سے آگے تھے۔

سلطنت حیدرآباد کو حکومت ہند میں ضم ہوئے آج (۵۳) سال کا عرصہ ہوا۔ وہ سکون و چین، امن، رواداری، بھائی چارہ اور معاشی اطمینانی اس خطہ سے عنقا ہوگئی ہے۔ چار زبانوں کا یہ گلدستہ (اُردو، تلگو، مرہٹی اور کنڑی) جو ہر سو خوشبو پھیلا رہا تھا تین ٹکڑوں میں بکھیر دیا گیا۔ اس یادگار زمانے کے لوگ جو بقیدِ حیات ہیں اس امن و سکون، بھائی چارے اور معاشی خوش حالی کے لئے ترستے ہیں اور وہ رہنما اور افراد جنھوں نے سلطنت حیدرآباد کے خاتمہ کے لئے جدوجہد کی تھی اور جنھیں مجاہد آزادی (Freedom Fighter) کہا جاتا ہے کف افسوس ملتے ہیں کہ کیا ان لوگوں نے اس لوٹ کھسوٹ، غنڈہ گردی اور امن چین کے خاتمہ کے لئے تکالیف اُٹھائی تھیں اور جانیں دی تھیں؟

آصف سابع اور ان کا دربار

سلطنت آصفیہ کے آخری تاجدار نواب میر عثمان علی خان ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کے انتقال کے بعد ۲۸ / اگسٹ ۱۹۱۱ء کو مسند نشین ہوئے اور ۱۸ / ستمبر ۱۹۴۸ء یعنی قریب ۳۸ برس تک حکومت کی اور ۲۴ / فبروری ۱۹۶۷ء کو انتقال کر گئے۔

عمدہ تعلیم و تربیت پائی اور عہدِ شباب میں جب کہ عمر ۲۷ سال تھی بادشاہ بنے۔ زمانے کے نشیب و فراز کا بڑا تجربہ ہو چکا تھا۔ علمائے دین، مصاحبین اور اعلیٰ عہدہ داروں کے عادات و اطوار سے خوب واقف تھے۔ اُمور سلطنت سے بھی خوب وقفیت ہو چکی تھی انھیں کسی رہبر کی ضرورت نہیں تھی۔ بڑے سادہ مزاج اور سادہ زندگی گذارنے والے تھے۔ سگریٹ کے شوقین اور صبح و شام ہلکی مقدار میں افیون لیا کرتے تھے۔ وقت اور کام کے معمول کے پابند تھے۔ اخبار بینی اور کتب بینی کا شوق تھا۔ مقامی و بیرونی انگریزی اور اُردو اخبار کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے اور تمام حالات سے باخبر رہتے۔ اندرون ریاست اور بیرون ریاست کے سیاسی اور دیگر حالات کا صحیح تجزیہ کرتے۔ ان کی ان مصروفیات نے انھیں ایک بیدار مغز اور باخبر بادشاہ بنا دیا تھا شاید اسی لئے انھیں حکیم السیاست کہا جانے لگا تھا۔ مطلق العنان حکمران کی ساری خصوصیات موجود تھیں۔ بڑا رعب، دبدبہ اور طاقت رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ مردم شناس بھی تھے۔ درباریوں کی باتوں کا گہرائی سے جائزہ لیتے اور حقیقت کو پہنچنے کی کوشش کرتے۔ ماتحتوں کی غلطیوں کو درگذر بھی کرتے تھے۔ دفتر کے کام میں تاخیر نہ برتتے اور صحیح احکامات صادر کرنے میں تاخیر نہ کرتے۔ ماتحین کی رائے کے خلاف بہت کم جاتے۔ سلطنت کی فلاح و بہبود میں انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔

ہندو اور مسلمان دونوں بھی ان کے مداح تھے۔ دونوں کو اپنی دو آنکھ کہتے تھے۔ دونوں فرقے خوش اور خوشحال تھے۔ خوشحال مملکت بنانے میں نظام نے کوئی کسر نہ رکھی بلکہ ہندوستان کی

ریاستوں میں سب سے خوشحال اور ترقی یافتہ ریاست بنائی۔

اس عروج کے ساتھ ساتھ انحطاط اور زوال کی علامات بھی نمایاں ہونے لگی تھیں جو آخر کار ریاست کے خاتمہ کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔ جب عثمان حکومت سنبھالا تو نذر و نذرانہ کو رواج دیا۔ جو جتنا بڑا نذرانہ پیش کرتا اسی قدر شاہانہ التفات کا حق دار بن جاتا۔ تقررات اور تبادلے بھی نذرانے کے ذریعہ ہونے لگے۔ اس طریقہ کار نے انتظامیہ میں رشوت ستانی کو عام کر دیا۔ مطلق العنانی کی کیفیت یہ تھی کہ ۱۹۱۴ء میں نہ صرف وزارت عظمیٰ کا عہدہ برخاست کر دیا بلکہ یہ کام راست اپنی نگرانی میں لے لیا۔ (۵) سال تک حکومت کی ساری باگ ڈور اپنے قبضے میں رکھی۔ جو مروجہ شاہانہ رواج کے خلاف تھا۔ بادشاہ سربراہ رہتا اور حکومت کا سارا کاروبار وزیر اعظم اور وزراء کے تفویض ہوتا۔ اس کے نتیجہ میں رشوت ستانی اور نذرانہ کا رواج عروج پر ہو گیا تھا۔

یہی وہ حالات تھے کہ برٹش گورنمنٹ نے مداخلت کی جرأت کی اور نظام کی مرضی کے بغیر سر علی امام کو صدر اعظم مقرر کیا گیا اور وزراء کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سر علی امام ایک مدبر، تجربہ کار، بلند پایہ قانون داں اور گورنر جنرل ہند کی کونسل کے ممبر تھے۔ انھوں نے نظم و نسق کو بہتر بنایا اور رشوت ستانی کا خلع قمع کیا۔ کاہل اور بددیانت عہدہ داروں کو نکال باہر کیا۔ ریاست کے حالات کو بہتر بنایا۔ ایک دوررس مدبر کی حیثیت سے نو آبادکاری کا نہایت ہی کارآمد منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ بس حضور نظام کو موقع ہاتھ آیا درباری سازشوں کے ذریعہ ہندوؤں کو ایک طرف اس منصوبے کے خلاف یہ کہتے ہوئے ورغلایا کہ ان کے وجود کو خطرہ ہے اور دوسری طرف مسلمانوں میں ملکی اور غیر ملکی جذبات بھڑکا دیئے۔ سر علی امام تنگ آ کر ۱۹۲۳ء میں مستعفی ہو گئے اور چلے گئے۔ وہ کتنے کبیدہ خاطر ہو گئے تھے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ مستعفی ہو جانے کے بعد انھوں نے حیدرآباد کی سرحد چھوڑنے تک پانی نہیں پیا۔ ایک ماہر نظم و نسق تجربہ کار مدبر جس نے مسلم اقتدار کے مستقبل پر نظر رکھی تھی مطلق العنانی اور درباری سازشوں کا شکار ہو گیا۔ حالات پھر بگڑے وائسرائے ہند کی طرف سے بڑے پیمانہ پر مداخلت کی جانے لگی۔ صدر المہام مال، معتمد مال اور کوتوالی جیسے عہدوں پر انگریز لائے جانے لگے۔ انگریزوں نے نظم و نسق میں اصلاح تو کی لیکن یہ عہدے مستقلاً وائسرائے اور ریذیڈنٹ کی منظوری کے بعد پر ہوا کرتے تھے۔

آصف سابع کا یہ معمول تھا کہ ہر روز علی الصبح کوتوال سے ساری معلومات حاصل کرتے، پھر درباریوں کے ساتھ ایک یا دو گھنٹے گذارتے۔ ایسی معلوماتیں بھی حاصل کرتے جن کی متعلقہ وزیر اور صدر اعظم کو خبر نہ رہتی۔ دربار، نظام کے انتظامیہ کا ایک طاقتور مرکز بنا ہوا تھا اکثر سازشیں بُنا کرتا تھا۔ وزراء، اپنی کارکردگی سے متعلق بادشاہ کی رائے کا ان سازشی درباریوں سے پتہ چلاتے۔ وزراء بھی ان حالات سے تنگ آ کر اپنے مصاحبین کو دربار میں داخل کرنے لگے تھے طرفہ تماشہ تو یہ بھی تھا کہ کوئی صدر اعظم یا وزیر اچھا کام کرتے اور نام کماتے تو بادشاہ کی نگاہ میں کھٹکتے اور بادشاہ انھیں نکال باہر کرنے موقع کی تلاش میں رہتے۔ اچھا کام نہ کریں بھی تو مصیبت آن پڑتی تھی۔ وزیروں کو آئے دن تبدیل کیا جاتا تھا۔ اس بات میں جہاں مطلق العنانی نظر آتی تھی وہیں یہ بات کچے کان رکھنے کی علامت تھی۔

نظام کا دربار کس طرح ایک مرکز طاقت بنا ہوا تھا بدر شکیب لکھتے ہیں :

''دربار، مجلس وزراء اور ریذیڈنسی اس مثلث کے تین زاویے تھے جس کو حیدرآباد کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دربار ہمیشہ اپنے آپ کو سرچشمۂ اقتدار قرار دے کر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ مجلس وزراء اپنے وجود کے لئے دربار اور ریذیڈنسی دونوں رحم و کرم کی محتاج تھی اور ریذیڈنسی چور دروازے سے حیدرآباد کی سیاست کو برطانوی اغراض کے تابع رکھنے کی طرف مائل رہتی تھی۔ ان تینوں کے تصادم کو روکنے کے لئے سازش ہی کے حربہ سے کام لیا جاسکتا تھا۔ دربار کے پیش نظر ملک سے زیادہ شخصی اور خاندانی اقتدار کی بحالی کا سوال رہتا تھا۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ساری سازشوں کی ابتداء دربار سے ہوتی تھی اور ان کو ہوا دینے کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک مصاحبین وہاں موجود تھے۔''

(حیدرآباد کا عروج وزوال صفحہ ٦۵)

مشتاق احمد خان نے اس دربار کے بارے میں لکھا ہے :

''یہ درباری بھی عجیب لوگ ہوتے تھے۔ وہ گالیاں کھاتے تھے اور............ان کو سن کر خوش بھی ہوتے تھے۔ مگر اپنی بات کہے جاتے تھے۔ خوشامد، چاپلوسی، مسخراپن ان کے

وجود کی واحد خصوصیت ہوتی تھی۔ مزاج شناس ہونے کی وجہ سے وہ حکمران وقت اور مزاج اور رجحانات پر مسلسل اثر انداز ہوتے رہتے تھے...... صاف ستھرا ماحول کارگذار عہدیدار یا امیر کے لئے سازگار نہ تھا...... ان لوگوں کی لگا بجھائی سے حکمران اپنی حکومت کا خود حریف بن جاتا تھا اور حکومت، مختلف قوتوں کی رزم آرائیوں کا اکھاڑہ بن کر کمزور پڑ جاتی تھی۔ چنانچہ بیسویں صدی کے اوائل ہی سے اکبر جنگ، عماد جنگ، اظہر جنگ، ہوش یار جنگ، زین یار جنگ، شہید یار جنگ، منظور جنگ، دین یار جنگ جیسے درباری، شاہی محل پر چھائے ہوئے رہے اور اپنے اپنے وقتوں میں سالار جنگ ثالث، مہاراجہ کشن پرشاد، سر علی امام، سر اکبر حیدری، نواب چھتاری اور لائق علی ان کی سازشوں کا ہدف بنتے رہے۔ قائد اعظم کے مشورے کے خلاف مرزا اسمٰعیل کو صدارت عظمیٰ پر فائز کرانے میں بھی ان کا ہاتھ تھا جس سے حیدرآباد کو اجتماعی طور پر بہت نقصان ہوا۔''

(زوال حیدرآباد کی ان کہانی داستان صفحہ ۴۶، ۴۷)

یہی دربار کے اکثر لوگ تھے جنھوں نے اپنے مفاد کی خاطر حیدرآباد کے آخری ایام میں کے۔ یم۔ منشی کے جاسوس بننے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ حیدرآباد کے سارے راز حکومت ہند کو ان ہی کی توسط سے بہ آسانی مہیا ہوتے رہے۔ آخری دنوں میں ظہیر احمد بھی کے یم منشی سے ملنے والوں میں پائے گئے۔

نذیر الدین احمد قلمطراز ہیں :

''اس خصوص میں اعلیٰ حضرت حضور پرنور کے عادات وخصائل، ان کے اوصاف اور ان کا مزاج، دروغ گوئی، سفلہ نوازی...... سازشی ذہن، شکی مزاج اُمور مملکت سے زیادہ ارباب نشاط، درباری سازشوں کی قربت سے بے خبری اور اسی قبیل کی باتیں، ہمیں یادِ ایام جلد سوم میں ملتی ہیں۔ یادِ ایام اگرچہ زبان وبیان وطرز نگارش کے اعتبار سے کوئی قابل تذکرہ کتاب نہیں لیکن دکن کے ایک اہم سیاسی دور کے وزیر اعظم کی یادداشت کی حیثیت سے اس کا حوالہ مناسب حال ہے۔''

(سوانح بہادر یار جنگ جلد سوم صفحہ ۲۷۱، ۲۷۲)

لائق علی نے نظام کے مزاج اور کردار کی اچھی تصویر کشی کی ہے......بعض لوگوں نے بار بار یہ الزام لگایا کہ نظام کے مجلس اتحاد المسلمین سے خفیہ تعلقات تھے۔ وہ لوگ یہ بنیادی بات بھول جاتے ہیں کہ نظام فطرتاً اور عادتاً ایک مطلق العنان بادشاہ رہے ہیں اور ان کے پاس اپنا رتبہ، اپنی ذات اور خاندان کے مقابل ہر چیز ہیچ تھی اسی لئے کوئی بھی سیاسی تحریک بشکل جمہوری ہو یا اور کوئی، اس سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اپنی دولت کے لئے کسی سے بھی دور ہو سکتے تھے۔ تحریک اتحاد المسلمین سے حقیقت میں انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کسی سیاسی احتجاج کی پاسداری نہ تھی۔ قاسم رضوی کی تقاریر پر اکثر تنقید کیا کرتے تھے اور بعض جذباتی تقاریر پر دو بدو ملاقات میں سخت وارننگ بھی دے چکے تھے کہ ایسی تقاریر کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ تمام زندگی، نظام کو سب سے عزیز، ان کا اقتدار اور دولت تھی۔ اکثر جب اہم سیاسی مسائل پیدا ہوتے بجائے توجہ دینے کے دوست ہو کہ دشمن مشورہ کرنے سے بے اعتنائی برتتے اور اپنے آپ کو غیر اہم خاندانی مسائل میں مشغول کر لیتے۔ اس پس منظر میں جب کہ ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کروانے کی جدوجہد بام عروج پر تھی وہ ایک اہم سلطنت کے سربراہ تھے۔[۱]

ایسے بادشاہ سے مسلمانوں کے مفاد اور مسلم سلطنت کے بقاء کی کیا توقع رکھی جا سکتی تھی جو اقتدار، تخت و تاج، خاندان اور دولت کو مسلم مفاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔

سلطنت آصفیہ کا مسلمان

سلطنت حیدر آباد، ہندوستان میں دور مغلیہ اور مسلمانوں کی آخری یادگار تھی جسے ایک راسخ العقیدہ، باکردار اور باصلاحیت سپہ سالار میر قمر الدین علی خان نے قائم کیا تھا۔ ان کے بعد ان کے جانشین اپنے جد کا کردار باقی نہ رکھ سکے۔ ان کی عیش پرستی اور دولت کی حوس نے سلطنت کے اہم عنصر دفاع کو متاثر کیا۔ انگریزوں نے جانشینوں کی ان کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر سلطنت کی طاقت پر وار کیا بادشاہ اور سلطنت کو حفاظت کے لئے اپنی فوج کی بجائے انگریزوں کی فوج پر انحصار کرنا پڑا۔ یہاں تک ایک وقت ایسا آیا کہ انگریزوں نے آصف جاہی سلطنت پر State Forces Scheme 1939ء کے تحت فوج رکھنے پر پابندی لگادی۔ انگریزوں کا منحوس سایہ جب پڑا تو سلطنت آصفیہ کو گھن لگ گیا۔ سوا دو سو سال کے عرصہ میں اس سلطنت کو انگریزوں نے ہر لحاظ سے بے بس کر دیا۔ کسی بھی حکومت کے دو اہم عنصر اس کی بلند کرداری اور فوجی طاقت باقی نہ رہیں تو حکومت کا زوال لازم ہو جاتا ہے۔

ان سوا دو سو سال کے عرصہ میں سلطنت کے مسلمان سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ کیوں کہ مسلمانوں کا تعلق حکمران طبقہ سے تھا۔ اسی لئے حکومت کے اہم شعبوں یعنی فوج، پولیس اور انتظامیہ پر مسلمانوں کا ارتکاز تھا۔ ان لوگوں نے دیگر آزاد پیشوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ انھیں کمتر سمجھا۔ نہ تو کسی بادشاہ کو اور نہ کسی رہنماء یا عالم کو فکر ہوئی کہ مسلمانوں کو اس غلامی کی زنجیر سے آزاد کرائیں اور انھیں آزاد پیشوں کی طرف مائل کرائیں۔

اس مسلم حکومت کا بہت افسوس ناک پہلو اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کا تھا۔ ویسے حکومت مذہبی رواداری پر سختی سے پابند تھی اور آج کے نظریہ حکومت کے مطابق مذہب کے معاملہ میں بالکل غیر جانبدار (سیکولر) حکومت تھی۔ ہندوستان میں ایک ہزار سالہ مسلم دور حکومت

میں کبھی بھی اسلام کے اصول ''لا اکراہ فی الدین'' سے پہلوتہی نہیں کی گئی، نہ سرکاری طور پر اسلام کو حکومت کا پابند بنایا گیا، نہ ہی اس کی تبلیغ کی گئی اور نہ غیر مسلموں کو اسلام کے دائرے میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی۔ مسلمان مذہبی آزادی اور رواداری پر سخت پابند رہے۔ ہندوستان میں اسلام کا پھیلاؤ بڑی حد تک اولیاء کرام اور صوفی بزرگوں کی وجہ سے ہوا۔ اولیاء کرام ہندوستان کے چپے چپے میں ہیں۔ دکن میں حضرات یوسفینؒ، سید احمد بادپاؒ وغیرہ بلند پایہ اولیاء اورنگ زیب کی فوج سے وابستہ تھے۔ فوجی ذمہ داری بھی بجالاتے تھے اور تبلیغ بھی کرتے تھے۔ آصف جاہ اول کے بعد ان کے جانشین حرصِ دولت اور عیش پرستی کی طرف مائل ہوئے۔ علماء کرام اور مشائخین نے بھی تبلیغ سے پہلوتہی کی اور دربار سے منسلک ہوگئے۔ علماء کرام اور مشائخین ریاست کے ہر گوشہ میں پھیلے ہوئے تھے لیکن سوائے چند کے جو اعلیٰ کمال درجہ کے علماء اور اولیاء اللہ تھے جنھوں نے رہبر طریقت کا کام انجام دیا اور تبلیغ کا کام کیا اکثر اپنے مخصوص لباس، سادہ اور رنگین جبہ و عمامہ، لنگی اور تسبیح کی آڑ میں دنیا کمارہے تھے۔ امراء، جاگیرداروں اور حکومت سے خوب فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ نذرات اور اعراس کی رقم وصول کرتے۔ معتقدین سے فصل پر اناج اور دوسری پیداوار حاصل کرتے۔ بارہویں (میلادِ حضورؐ) گیارہویں (حضرت غوث اعظمؒ کی نیاز) چھٹی (حضرت خواجہ اجمیریؒ کی نیاز) عرس اور آثار مبارک میں مسلمانوں کو ملوث کئے ہوئے تھے۔ نہ تو مسلمان کی اصلاح کی اور نہ ہی غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کی۔ جس منصب پر یہ فائز تھے اس سے بڑی پہلوتہی کی نتیجتاً حلقہ بگوشانِ اسلام کا دائرہ وسیع نہ ہوسکا۔ اگر یہ طبقہ اپنے فرائض سے غفلت نہ برتا ہوتا آج مسلمان دکن میں اتنی کم تعداد میں نہ ہوتے۔ ایک بڑا پسماندہ طبقہ جو ہندو ذات پات کی اجارہ داری کی وجہ سے کچلا ہوا تھا کوئی تعجب نہیں کہ حلقہ بگوش اسلام ہو جاتا اور ممکن تھا کہ اس مملکت کو آنچ نہ آتی۔

سلطنت آصفی کا دور جب اس کی آخری منزل یعنی بیسویں صدی میں داخل ہوا تو مسلم معاشرہ بری طرح سے متاثر تھا اور زوال کی طرف تیزی سے رواں تھا۔ میر عثمان علی خان نے اس حکمران طبقہ کے معاشرہ کو اور اپنے ہم مذہب طبقہ کو جن سے ان کی حکومت کا وجود باقی تھا سدھارنے اور اس کی سیاسی بقاء کی طرف کوئی توجہ دینے کی فکر نہیں کی۔ صرف اپنی اور اپنے تخت و تاج کی بقاء کی فکر کرتے رہے۔ آخری تاجدار دکن نے ۱۹۱۱ء میں تخت سنبھالا تو اس وقت سلطنت کا معاشرہ بڑا بگڑا

ہوا تھا۔ سارا معاشرہ امراء، جاگیردار اور عوام پر مشتمل تھا۔ امراء و جاگیرداروں میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ مسلمان بشمول امراء اور جاگیردار حکمران طبقہ تھا۔ امراء اور جاگیردار بادشاہ سے زیادہ قریب تھے۔ ان ہی میں سے وزراء اور اعلیٰ عہدیدار ہوتے تھے۔ کم درجہ کی ملازمتوں پر عام مسلمان تھے۔ لیکن یہ ستم ظریفی تھی کہ مسلمان امراء ہو کہ جاگیردار یا عام مسلمان ملازمت کو اُونچا مقام تصور کرتے تھے۔ آزاد پیشے زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، ڈاکٹری، وکالت وغیرہ کو کمتر سمجھتے تھے۔ اس طبقہ کے مزاج میں بادشاہت اتنی رچ گئی تھی کہ وہ بادشاہ کو اپنی بقاء کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ سیاست دانوں نے جب نظام کو مسلمانوں کے تمدن اور اقتدار کا مظہر کہا تو مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات اتنی رچ بس گئی کہ ہزاروں نے پولیس ایکشن میں جان دے دی۔

امرائے پائیگاہ نظام کے قریبی رشتہ دار تھے۔ دیگر اکثر بڑے امراء اور جاگیردار آصف جاہ اول کے ساتھ آئے تھے اور اس وقت سے خانوادہ آصفیہ سے وابستہ تھے۔ ان میں سے اکثر باصلاحیت تھے۔ لیکن وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اولاد ان خصوصیات سے محروم ہو چکی تھی۔ چوں کہ شیرخواری سے ہی چاندی کے جھولوں میں پروان چڑھنے لگے تھے اور عہد شباب میں پہنچ کر چھوکریوں، خواصوں اور محلات کے رنگ رلیوں میں گم ہو گئے تھے۔ جاگیردار طبقہ ہر لحاظ سے اخلاقی پستی کا شکار ہو گیا۔ اس میں تعلیم کا بھی فقدان تھا۔ سیاسی شعور بالکل نہ تھا۔ نہ تجارت تھی، نہ صنعت و حرفت اور نہ معاشی پریشانی۔ جاگیرات سے ذرائع معاش گھر بیٹھے مہیا تھے۔ صبح کب ہوتی تھی وہ ہی بہتر جانتے تھے لیکن جب صبح ہوتی تو باورچی خانہ ہوتا اور ان کے سامنے مرغوب اور عیش و عشرت کی غذائیں ہوتیں۔ نواب اور جاگیرداروں کے نام سے باورچی خانے اور لوازمات منسوب ہونے لگے۔ کبوتر بازی، مرغ بازی، گھڑسواری، تاش وغیرہ سے دن گذر جاتا۔ رات ہوتی تو عیش و عشرت کی محفلیں سجتیں اور ساری رات گذر جاتی۔ یوں ہی صبح اور شام ہوتی تھی۔ ان تمام برائیوں کا اثر دیگر عام مسلمانوں پر پڑنا لازمی تھا۔ ایسے عیش و عشرت اور پرسکون ماحول میں نہ تو کسی سے خطرہ اور نہ کوئی چیز کھو جانے کا خوف۔ صرف شخصی فوائد کے حصول میں گرداں۔ ملازمین تنخواہ، گریڈ اور دفتری سازشوں میں مشغول نتیجتاً مذہبی شعور، سیاسی شعور اور معاشرتی شعور کے فقدان نے سارے معاشرہ کو کھوکھلا کر دیا تھا۔

آخری تاجدار دکن میر عثمان علی خان کی ساری فکر اپنی ذات، تخت و تاج، خاندان اور ان کی دولت کی بقاء کے اطراف گھوم رہی تھی۔ مسلمان اور مسلم مملکت کی سیاسی بقاء سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب کہ مسلمان اپنے بادشاہ پر قربان تھا اور وہ کھوکھلا ہو گیا تھا۔ یہ ایسی کمزوریاں تھیں جو مسلم مملکت کی بقاء کے لئے چیلنج بنی ہوئی تھیں۔

تحریکِ آزادیٔ ہندوستان

زوال حیدرآباد کا جائزہ لینے سے قبل ہندوستان کی تحریک آزادی پر طائرانہ نظر ڈالنا ضروری ہے تاکہ واضح خاکہ ذہن میں رہے۔

۱۸۵۷ء کی انگریزوں سے جنگ دراصل پہلی جنگِ آزادی تھی جسے ہندو مسلم دونوں نے مل کر لڑی۔ اس جنگ کو بدقسمتی سے غدر کا نام دیا جاتا ہے جس سے غداری کے معنی نکلتے ہیں۔ یہ جنگ بڑی حد تک شمالی ہندوستان تک محدود تھی۔ صحیح منصوبہ بندی کے فقدان کے باعث اکثر دیسی ریاستیں خاموش رہیں خاص کر سندھیا، نظام اور سکھوں کے عدم تعاون کی وجہہ سے ہندوستانیوں کو شکست ہوئی۔ اس شکست کے بعد انگریزوں نے سارے ہندوستان پر اپنا سکہ جمادیا۔ انگریزوں کو بڑا خوف اور خدشہ مسلمانوں سے تھا۔ چوں کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان ہی ان کو ہندوستان سے باہر نکال سکتے ہیں اس لئے کہ انگریزوں نے ان ہی سے حکومت چھینی تھی۔ انگریزوں نے مسلمانوں پر بڑے مظالم ڈھائے۔ اور انھیں کمزور سے کمزور تر کردیا۔

انگریز حکومت جب بیسویں صدی میں داخل ہوئی تو ہندوستان کا سیاسی نقشہ برٹش انڈیا اور دیسی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ برٹش انڈیا پر انگریز راست حکومت کرتے تھے جب کہ دیسی ریاستوں کو داخلی آزادی کے ساتھ راجاؤں اور بادشاہوں کے سپرد کیا تھا۔ دیسی ریاستوں کے اہم اُمور یعنی اُمور خارجہ، دفاع، مواصلات وغیرہ اپنے قبضے میں رکھے تھے۔ کئی معاہدوں کے ذریعہ دیسی ریاستوں کو اپنے ماتحت رکھا تھا اور ان کے اُوپر اقتدار اعلیٰ (Paramountcy) قائم کیا تھا۔ پیرامونٹسی ایک فرضی قانون تھا جس کی کوئی قانونی حیثیت نہ تھی اور یہ صرف طاقت کے بل بوتے دباؤ کا ہتھیار تھا۔ ہندوستان کا (۴۰) فیصد حصہ یعنی (۲/۵) حصہ پر دیسی ریاستیں اور (۶۰) فیصد حصہ یعنی (۳/۵) حصہ برٹش انڈیا تھا۔ دیسی ریاستیں (۵۶۲) کے قریب تھیں جن میں (۳۰۰) ریاستیں تو راجستھان،

کاٹھیاواڑ اور گجرات میں تھیں۔ ان میں اکثر چھوٹی ریاستیں تھیں چھوٹی بھی اتنی کہ ایک گاؤں اور اس سے بھی کم علاقے پر محیط تھیں۔ یہ ریاستیں ہمیشہ برٹش انڈیا سے جڑے رہنا ہی اپنے لئے محفوظ اور فائدہ مند سمجھتی تھیں۔ جو بڑی ریاستیں تھیں وہ کافی مستحکم اور اپنے پیروں پر آپ کھڑے رہنے کے قابل تھیں جن میں حیدرآباد، کشمیر، میسور، بڑودہ، بھوپال، پٹیالہ، جودھ پور، جے پور، راجکوٹ، بیکانیر، اڑیسہ، ٹراونکور کوچین قابل ذکر ہیں۔ برٹش انڈیا (۱۱) صوبوں یعنی (۱) صوبہ سرحد (۲) صوبہ پنجاب (۳) صوبہ سندھ (۴) صوبہ یوپی (۵) صوبہ سی پی (۶) صوبہ آسام (۷) صوبہ بنگال (۸) صوبہ بہار (۹) صوبہ اڑیسہ (۱۰) صوبہ مدراس اور (۱۱) صوبہ بمبئی پر مشتمل تھا۔

انیسویں صدی کے اختتام کے قریب، انگریزوں کے سلوک اور مختلف قوانین کے نفاذ سے ہندوستانیوں کے مفادات متاثر ہو رہے تھے، ہندوستان میں ایک عام بے چینی پھیل گئی تھی۔ ہندوستانیوں کے مفادات کی نمائندگی علاقہ واری، صوبہ واری تنظیموں اور اسوسی ایشنس کی بنیاد پر کی جارہی تھی۔ مثلاً بنگال میں (British India Association) تھی تو بمبئی میں (Bombay Association)۔ اسی وجہ سے ایک ایسی جماعت کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جو سارے ہندوستانیوں کی نمائندگی کرے۔ چنانچہ ایک انگریز سیویلین Allan Octavin Hume نے ایسی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ۱۸۸۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے نوجوانوں سے خطاب کے دوران کہا کہ (۵۰) مخلص اشخاص مل جائیں تو یہ کام ہوسکتا ہے۔ ڈسمبر ۱۸۸۴ء میں مدراس میں ایک مذہبی کنونشن ہوا اس کے بعد کچھ لوگ (تقریباً ۱۷) اپنی خانگی ملاقات میں اس پر تبادلہ خیال کیا تو ایک جماعت کا تصور اُبھرا جسے مسٹر ہیوم کا سہارا مل گیا۔ چنانچہ ملازمت سے ان کے سبکدوش ہونے کے بعد انڈین نیشنل یونین کے نام سے ایک جماعت قائم کرنے کی غرض سے کانفرنس کے انعقاد کے دعوت نامے جاری کیے گئے۔ کانفرنس ۲۵ رتا ۳۱ رڈسمبر ۱۸۸۵ء پونہ میں رکھی گئی۔ لیکن وہاں ہیضہ کی وباء پھوٹ پڑنے کی وجہ سے کانفرنس کا مقام بمبئی منتقل کردیا گیا۔ ۲۸ رڈسمبر ۱۸۸۵ء کو گوکل داس تیج سنسکرت کالج ہال میں کانگریس (جسے پہلے کانفرنس کہا گیا تھا) منعقد ہوئی۔ اس اجتماع میں تنظیم کا نام بجائے انڈین نیشنل یونین کے انڈین نیشنل کانگریس رکھا گیا۔ مسٹر ہیوم نے اس کی صدارت کے لئے ڈبلیو۔ سی۔ بینرجی کا نام تجویز کیا جسے منظور کرلیا گیا۔ اس طرح بنرجی کانگریس کے پہلے صدر بنے۔

مسٹر ہیوم چاہتے تھے کہ کانگریس سماجی، معاشی اور فلاحی اُمور پر توجہ مرکوز کرے جب کہ سیاسی سرگرمیوں کے شعبہ کو ایسی دوسری علاقہ واری اور صوبہ واری جماعتوں کے لئے چھوڑ دے جو اس وقت کام کر رہی تھیں۔ مسٹر ہیوم نے کانگریس کو آگے بڑھانے میں بڑی مدد کی۔ انھوں نے اس جماعت کو انگلستان میں حکومتی ایوان، سیاسی اسٹابلشمنٹ اور صحافت سے متعارف کروایا۔ یہ جماعت ترقی کرتی گئی اور اس کو ہندوستان کے ہر طبقہ کا تعاون حاصل ہوتا رہا۔ ابتداء میں تو سیاسی اُمور سے ہٹ کر کام کیا جانے لگا لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا سیاسی میدان میں داخل ہونے میں انڈین نیشنل کانگریس نے تاخیر نہیں کی۔ ۱۸۸۸ء تک کے ایک مختصر عرصے میں اس نے قومی جماعت کی حیثیت اختیار کر لی اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے بھی اقدامات شروع کر دیئے۔ انیسویں صدی کے اختتام تک مسلسل رزولیوشنز کے ذریعہ کئی سیاسی اُمور کی اصلاح کے لئے نمائندگیاں کی جاتی رہیں۔

بنگال کی تقسیم کی وجہہ سے مشرقی بنگال مسلم اکثریت والا علاقہ بن گیا تھا۔ مسلمانوں کی نمائندگیوں میں جب دقت آنے لگی تو نواب آف ڈھاکہ نے ۱۹۰۵ء میں مسلم لیگ قائم کی جس کے ذریعہ مسلم نمائندگی کی جانے لگی۔ کانگریس اور مسلم لیگ شروع سے ہی مل جل کر کام کرتے رہے۔ بیسویں صدی کی ابتداء سے ہی ہندوستان کا سیاسی ماحول اُتھل پُتھل ہونے لگا تھا۔ کانگریس کی سیاسی نمائندگیاں رنگ لانے لگی تھیں۔ مطالبات آگے بڑھتے ہوئے صوبائی خودمختاری (Provincial Autonomy) تک جا پہنچے اور دباؤ بڑھنے لگا۔ حکومت برطانیہ نے صوبائی خودمختاری (Provincial Autonomy) کے مطالبے کو ۱۹۱۱ء میں منظور کیا تو کانگریس نے ۱۹۱۳ء کے اپنے سیشن میں اطمینان کا اظہار کیا اور ۱۹۱۴ء کے سیشن میں اسے عملی جامہ پہنانے کا مطالبہ کیا۔ مسلم لیگ بھی سیلف گورنمنٹ (.Self Govt) کے مطالبہ کے ساتھ سامنے آئی۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ اور کانگریس نے مل کر اس مقصد کے لئے کام کرنے کا عہد کیا۔ کانگریس نے مسلم لیگ کے سیلف گورنمنٹ کے مطالبہ کو سہایا اور ۱۹۱۴ء کے کانگریس سیشن میں متحدہ طور پر کام کرنے کی تجویز کو منظور کرتے ہوئے جلد از جلد سیلف گورنمنٹ کے قیام کا مطالبہ کیا۔ سیلف گورنمنٹ کو Home Rule اور بعد میں .Responsible Govt یعنی ذمہ دارانہ حکومت کا نام دیا گیا۔ اس طرح سے ذمہ دارانہ حکومت کا قیام جدوجہد آزادی کا سب سے اہم مطالبہ بن گیا۔

پہلی جنگ عظیم جولائی ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور نومبر ۱۹۱۸ء میں ختم ہوگئی اس میں برطانیہ کو فتح ہوئی۔اس جنگ کی کامیابی میں ہندوستان کی شرکت اوراس کی فوجی خدمات کا بڑا دخل رہا۔انگریز خوش ہوگئے تھے انھوں نے ہندوستانیوں کوخوش کرنے کے لئے ۱۹۱۷ء میں جب کہ ابھی جنگ چل رہی تھی یہ اعلان کیا کہ ہندوستان میں رفتہ رفتہ سیلف گورنمنٹ اسکیم شروع کی جائے گی اور ذمہ دارانہ حکومت کی طرف اقدامات کئے جائیں گے۔چنانچہ ۱۹۱۸ء میں اصلاحات سے متعلق دو رپورٹ ماؤنٹ فورڈ اور راولٹ کمیٹی کے نام سے جاری کئے گئے۔ان ہی رپورٹس کی بنیاد پر اصلاحی قانون ۱۹۱۹ء جاری کیا گیا۔یہ قانون ایسے دفعات پر مشتمل تھا جوتحریک آزادی پرزبردست ضرب لگاتا تھا۔ اس قانون کےنفاذ کےذریعہ آزادی کی تحریک کودبانے کےاقدامات کئے گئے۔

اصلاحی قانون نے ہندوستان میں آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیااوراحتجاجوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ہوم رول یاذمہ دارانہ حکومت کا مطالبہ جڑ پکڑ گیا۔کانگریس نے بڑے پیمانے پراحتجاج پورے ہندوستان میں منظم کئے جو بڑے کامیاب بھی رہے۔۱۲؍اپریل ۱۹۱۹ءکوجلیان والا باغ کا قتل عام کا واقعہ پیش آیا جس میں (۵۰۰) کے قریب لوگ مارے گئے۔یہ واقعہ اسی احتجاج کا نتیجہ تھا۔اس حادثے نے سارے ہندوستان میں تہلکہ مچادیا۔ڈسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر کانگریس سیشن ہوا۔اس سیشن سے پہلے ایک بڑا جلوس کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے مل کر نکالا جس کی رہنمائی موتی لال نہرو صدر کانگریس اور حکیم اجمل خان صدر مسلم لیگ نے کی۔جلوس میں بے پناہ ہجوم تھا۔حکومت برطانیہ کے خلاف سخت جذبات کا اظہار کیا گیا تھا۔اس واقعہ نے حکومت برطانیہ کی بنیاد ہلادی تھی اور سارے ہندوستان کا ماحول برطانیہ کے خلاف ہوگیا تھا۔اس سے تحریک آزادی میں ایک نیا جوش و ولولہ پیدا ہوگیا اور کانگریس اس کی روح رواں بن گئی۔ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے مطالبہ میں مزید جان پڑگئی اوراس طرح سے بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی راہ ہموار ہوگئی۔

تحریکِ آزادی جو کانگریس کی جانب سے چلائی جارہی تھی وہ ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے مطالبہ پر مبنی تھی یعنی برطانیہ اپنا اقتدار عوام کو منتقل کردے۔باالفاظ دیگر ہندوستان میں جمہوریت کاراج ہواور مطلق العنانی ختم ہو۔کانگریس کی ابتداًء پالیسی یہی رہی کہ منظم ہونے اورسیاسی اثر قائم

ہونے تک خود کو برٹش انڈیا یعنی برطانوی ہند تک محدود رکھے ہوئے تھی اور دیسی ریاستوں میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کئے ہوئے تھی۔ اس پالیسی کا اعلان ناگپور سیشن ڈسمبر ۱۹۲۰ء اور جنوری ۱۹۲۵ء کی پولٹیکل کانفرنس میں کیا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ دیسی ریاستوں میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام میں فی الحال مداخلت نہیں کرے گی اور اس معاملہ کو ریاستوں پر چھوڑ دے گی لیکن وفاقی قانون ۱۹۳۵ء کے تحت ۱۹۳۷ء میں برٹش انڈیا کے (۱۱) صوبوں میں جیسے ہی انتخابات ہوئے کانگریس کو غیر متوقع بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ جولائی ۱۹۳۷ء میں (۶) صوبوں، یوپی، سی پی، بہار، اڑیسہ، بمبئی اور مدراس میں اکثریت حاصل کر کے راست حکومتیں بنائی گئیں۔ صوبہ آسام اور صوبہ سرحد میں آزاد امیدواروں کی مدد سے کانگریس حکومتیں قائم کی گئیں۔ باقی (۳) صوبوں، بنگال، پنجاب اور سندھ میں جو مسلم اکثریت کے صوبے تھے غیر کانگریسی حکومتیں وجود میں آئیں۔ کانگریس کی اس بڑی کامیابی کے بعد سیاسی برتری کا اس کا سکہ ہندوستان پر قائم ہو گیا اب کانگریس نے دیسی ریاستوں میں عدم مداخلت کی اپنی پالیسی یکلخت ترک کردی اور وہاں بھی مداخلت شروع کی گئی۔ اکٹوبر ۱۹۳۷ء کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ایک رزولیوشن سے اتفاق کیا گیا جس کی منظوری ہری پور کانگریس سیشن میں حاصل کی گئی۔ اس رزولیوشن کی رُو سے کانگریس نے دیسی ریاستوں میں بھی ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا تا کہ دیسی ریاستیں بھی ہندوستان کے سیاسی ڈھانچہ سے مختلف نہ ہو بلکہ اس کا حصہ مانا جائے یعنی پورا ہندوستان جمہوری ڈھانچہ میں آجائے۔

بیسویں صدی کے پہلے دہے سے ہی ذمہ دارانہ حکومت یا جمہوریت کے نقوش اُبھرنے لگے تھے جو ۱۹۳۷ء کے بعد نوشتہ دیوار بن گئے۔ سینکڑوں دیسی ریاستوں کے لئے یہ نوشتہ دیوار اضطراب و بے چینی کا سبب نہ بنا چوں کہ ذمہ دار حکومت کا مطلب اقتدار اکثریت کے حق میں منتقل ہونا تھا۔ حکمرانی راجاؤں سے نکل کر اکثریت یعنی ہندو طبقہ کے ہاتھ میں آنے والی تھی لیکن ان مسلم ریاستوں میں جن کے سربراہ تو مسلم بادشاہ تھے لیکن مسلمان بڑی اقلیت میں تھے معاملہ بڑا سنگین تھا۔ بے چینی اور اضطراب پیدا ہوا کیوں کہ صدیوں کے 'مسلم اقتدار' کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ ان ریاستوں میں خاص کر حیدرآباد، بھوپال اور جوناگڑھ قابل ذکر ہیں۔ کشمیر میں الگ معاملہ تھا وہاں مسلم اکثریت تھی لیکن حکمران ہندو راجہ تھا۔ راجہ کو اقتدار کے خاتمہ کا خدشہ تھا۔

۱۹۳۵ء کے وفاقی قانون کا نفاذ ۱۹۳۷ء میں ہوا۔ اس کے بعد سے ہندوستان کے سیاسی حالات بڑی تیزی سے بدلنے لگے۔ آزادی کا مطالبہ جڑ پکڑ چکا تھا۔ کانگریس کی بدقسمتی یہی رہی کہ ابتداء سے ہی ہندو مہاسبھائی اور آریا سماجی ذہن کے لوگ اس میں داخل ہوگئے تھے اور ان تنظیموں کا اثر کانگریس پر پڑنا لازمی تھا۔ ہندو مہاسبھا اور آریہ سماج اگرچیکہ مذہبی تحریکات ہیں لیکن ان تحریکات کے درپردہ ہندوستان میں ہندو راج کا قیام تھا اور جمہوریت ان کے لئے بڑا کارگر ہتھیار بن گئی تھی۔ اسی ذہن کے نتیجہ میں ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد مختلف ریاستوں میں خاص کر بمبئی اور بہار کے سیاسی اقتدار میں ہندو برتری قائم کرنے کے جو اقدامات کئے گئے اور مابعد مسلمانوں پر ان صوبوں میں جو مظالم ڈھائے گئے یہی وہ ماحول تھا جس میں ہندو مسلم تفرقہ کا پودا پرورش پایا اور اکثریت اور اقلیت کے جذبات کو برانگیختہ کیا گیا۔ مسلمانوں نے خطرہ محسوس کیا اور وہ کانگریس سے علحدہ ہوکر مسلم لیگ تلے جمع ہونے لگے۔ محمد علی جناح جیسی ایک انصاف پسند اور بلند کردار شخصیت نے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ مسلم لیگ لاہور سیشن ۱۹۴۰ء میں قیام پاکستان کی تجویز منظور ہوئی جو بعد میں چل کر قیام پاکستان کی سبب بنی۔

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء سے دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔ برطانیہ اور اس کے حلیف جرمن اور جاپان کے مقابل آئے۔ کانگریس نے انگریزوں کا اس مطالبہ کے ساتھ تعاون کیا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی دی جائے گی۔ اگسٹ ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے ہندوستان چھوڑ دو کا نعرہ دیا۔ یکم مئی ۱۹۴۵ء کو ہٹلر کی موت ہوئی اور اس کے ایک ہفتہ کے اندر جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے اور دوسری جنگ عظیم ختم ہوگئی۔ برطانیہ اور اس کے حلیفوں نے بازی جیت لی۔ جنگ کے بعد سیاسی حالات بڑی تیزی سے بدلنے لگے۔ برطانیہ کی سیاسی ساکھ ساری دنیا میں متاثر ہوگئی اور اس کے لئے جمہوریت کے مقابلے میں نوآبادیاتی نظام (Colonisation) باقی رکھنا اور اس پر قائم رہنا مشکل ہوگیا۔ نیز انگریز جنگ کی وجہہ سے بڑی مالی مشکلات سے بھی دوچار ہوگئے تھے۔ ان حالات میں ہندوستان کو آزاد کرنے میں ہی برطانیہ نے اپنی بھلائی سمجھی۔ اس وقت چرچل کی کنزرویٹیو پارٹی انتخابات ہار چکی تھی اور لیبر پارٹی انتخابات جیت کر اٹلی کو وزیراعظم بنایا تھا۔ لیبر پارٹی کی حکومت نے ہندوستان کو آزادی دینے کے اقدامات کے تحت کیبنٹ مشن ہندوستان بھیجا کہ آزادی کس طرح سے دی جائے

سفارشات پیش کریں۔ کیبنٹ مشن نے ہندوستان میں تمام سیاسی جماعتوں، دیسی ریاستوں کے سربراہوں، مذہبی اور غیر مذہبی جماعتوں کی نمائندگی کی سماعت کرنے کے بعد ۱۲؍مئی ۱۹۴۶ء کو حکومت برطانیہ کو اپنی سفارشات پیش کیں جو ہندوستان کی مستقبل کی صورت گری سے متعلق تھیں۔ اس پر کانگریس اور مسلم لیگ کی جانب سے مختلف توضیحات کی جانے لگیں۔ کانگریس کا آزادی کے لئے دباؤ بڑھنے لگا۔ اٹلی کی حکومت نے ہندوستان کی آزادی کے لئے انتہائی عجلت پسندانہ اقدامات کے ذریعہ لارڈ مونٹ بیٹن کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا۔ ۲۲؍مارچ ۱۹۴۶ء کو گورنر جنرل کا جائزہ لینے کے بعد لارڈ مونٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں کہا کہ حکومت برطانیہ، جون ۱۹۴۸ء تک اپنا اقتدار ہندوستان کے حوالے کردے گی۔ چنانچہ ۱۲؍اگسٹ ۱۹۴۶ء کو وائسرائے نے جواہر لال نہرو (جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے) کو عارضی حکومت بنانے مدعو کیا۔ بعد میں ۱۵؍اکتوبر ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ بھی حکومت میں شامل ہوئی۔ وائسرائے ہند نے پھر ۳؍جون ۱۹۴۷ء کو یہ اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ جون ۱۹۴۸ء سے پہلے یعنی ۱۵؍اگسٹ ۱۹۴۷ء کو اقتدار منتقل کردے گی۔ چنانچہ قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء (India Independence Act 1947) کے ذریعہ ۱۵؍اگسٹ ۱۹۴۷ء کو دو آزاد مملکتوں ہندوستان اور پاکستان کو برطانوی اقتدار منتقل کیا گیا اور اسی قانون کی دفعہ (۷) کے تحت دیسی ریاستوں کے رؤسا کو اختیار دیا گیا کہ وہ آزاد رہیں یا دونوں آزاد مملکتوں میں سے کسی ایک سے الحاق کرلیں۔

دیسی ریاستیں اور ہندوستان میں انضمام

قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کے تحت ہندوستان اور پاکستان کو برطانیہ ہند کی جگہ قائم مقام بنا کر آزادی دی اور انھیں دولت مشترکہ کا رکن بنایا گیا تا کہ یہ دونوں مملکتیں اندرون اور بیرون ملک مکمل آزاد کہلائے جاسکیں۔ خارجی، دفاعی اور ہر قسم کی پالیسی کا مکمل اختیار دیا گیا۔ اسی قانون کی دفعہ (۷) کے تحت دیسی ریاستوں کو بھی آزادی دی گئی لیکن انھیں دولت مشترکہ کا رکن نہیں بنایا گیا جس کا مطلب یہ نکالا جانے لگا کہ انھیں وہ خارجی آزادی نہیں جو کہ ہندوستان اور پاکستان کو ہے۔ بہر حال ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ ساری دیسی ریاستیں بھی ازروئے قانون آزاد ہوئیں اور سربراہان مملکتوں کو یہ حق دیا گیا کہ چاہے وہ آزاد رہیں یا پھر ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کرلیں۔

حکومت برطانیہ جب تک ہندوستان پر حکمران تھی پیرامونٹسی (اقتدار اعلیٰ) کے فرضی قانون (جس کی نہ کوئی قانونی تعریف تھی اور نہ قانونی وضاحت) کے تحت تمام دیسی ریاستوں کو اپنی ماتحت بنائے رکھی تھی۔ ان ریاستوں کا دفاع یعنی حفاظت اور خارجی اُمور اپنے تحت رکھا تھا اور انھیں بے دست و پا بنا دیا تھا۔ تقریباً سب ریاستیں انگریزوں کی دست نگر بن گئی تھیں۔ تاج برطانیہ اور دیسی ریاستوں کے درمیان تعلقات ان معاہدات کی بنیاد پر تھے جو دونوں حکومتوں نے طے کئے تھے اور ان معاہدات کے ہر دو پابند تھے۔ دیسی ریاستیں اپنے اپنے طور پر اور ادارہ چیمبر آف پرنسیس کے ذریعہ حکومت برطانیہ سے مسلسل مطالبہ کرتی رہیں کہ ان کے موقف کا صحیح تعین کیا جائے اور جن معاہدات کے تحت دونوں حکومتوں میں تعلقات تھے ان کے تحت محصلہ حقوق اور علاقے واپس کر دیئے جائیں۔ حکومت برطانیہ صرف یہ دلاسے دلاتی رہی کہ انھیں آنے والی حکومت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند معاملات کرنے کا موقع حاصل رہے گا۔ یہ نہ صرف بڑی بے وفائی تھی بلکہ شرمناک حرکت تھی۔ جب تاج برطانیہ ہندوستان میں اپنا اقتدار حوالے کرکے واپس جانا چاہتا تھا تو

دیسی ریاستوں کے حقوق کا استرداد کئے بغیر صرف ہندوستان سے معاملت کر کے چلتے بنا اور دیسی ریاستوں کو ہندوستان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ برطانیہ کا اقدام انصاف کے تقاضوں کی کس حد تک تکمیل کرتا ہے یہ ایک سوالیہ نشان ہے؟ ہونا تو یہ تھا کہ معاہدات ختم کئے جاتے اور ریاستوں کے حقوق انھیں واپس کئے جاتے۔ حکومت برطانیہ کی اس ایک طرفہ کارروائی کی وجہ سے دیسی ریاستیں لرزہ براندام ہوگئیں۔ وائسرائے کے اعلان آزادی کے بعد نہرو اور سردار پٹیل نے دیسی ریاستوں کو ڈرانے اور دھمکانے کی پالیسی اختیار کی تاکہ وہ ہندوستان میں شریک ہو جائیں۔ ۱۸؍اپریل کو آل انڈیا اسٹیٹس پیوپلس کانفرنس (All India States People's Conference) کو مخاطب کرتے ہوئے نہرو نے اعلان کیا کہ اگر دیسی ریاستیں ہندوستان میں شریک نہ ہوں گی تو وہ باغی کہلائیں گی نتیجتاً ان کے ساتھ جو سلوک ہوگا اس کی ساری ذمہ داری خود ان ہی پر ہوگی۔ لیاقت علی خاں (مسلم لیگی رہنما اور رکن کیبنٹ) نے اس اشتعال انگیزی پر فوراً سخت احتجاج کیا اور یہ صحافتی بیان جاری کیا کہ کانگریس کو اس طرح سے ریاستوں کو ڈرانے دھمکانے کا حق نہیں پہنچتا۔[1]

وائسرائے کے ۳؍جون ۱۹۴۷ء کے اس اعلان کے بعد کہ آزادی ۱۵؍اگسٹ ۱۹۴۷ء کو دی جائے گی الحاق و انضمام کے سلسلہ میں عجلت پسندانہ اقدامات شروع ہوگئے۔ وی۔ پی۔ مینن کے مطابق نہرو، سردار پٹیل اور وی۔ پی۔ مینن نے مل کر ریاستوں کے الحاق کا ایک منصوبہ بنایا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ریاستوں کو مکمل الحاق کی بجائے جس کی وجہ سے ریاستوں کا الحاق مشکل ہوسکتا تھا صرف چند اُمور پر الحاق کے لئے راضی کیا جائے۔ دفاع ایک ایسا معاملہ تھا جس کی وجہ سے شورش یا امن و امان کو بنیاد بنا کر عقبی دروازے سے ریاستوں میں مداخلت کرتے ہوئے حکومت ہند کا تسلط قائم کیا جاسکتا تھا۔ اُمور خارجہ سے ریاستیں اچھی طرح سے نمٹ نہیں سکتیں تاہم مواصلات کے لئے حکومت ہند سے اشتراک ضروری تھا۔ چنانچہ صرف ان اُمور کا جھانسہ دیا گیا۔ اس منصوبے پر عمل آوری کے لئے لارڈ مونٹ بیٹن کی خدمات حاصل کرنے کی درخواست کی گئی تو وہ بخوشی راضی ہوگئے۔[2] اس طرح عقبی دروازے سے راستہ نکالا گیا۔ اسی دوران راجہ آف ٹراونکور اور کوچین نے ۱۱؍جون ۱۹۴۷ء کو اور اس کے ساتھ ہی حیدرآباد نے بھی آزاد رہنے کا اعلان کیا جو نہرو اور سردار پٹیل کے لئے بڑی

پریشانی کا باعث بن گئے۔ الحاق کے منصوبے کو جلد از جلد روبہ عمل لانے کے اقدامات شروع کردیئے گئے۔

چھوٹی ریاستیں اپنے آپ کھڑے رہنے کے قابل نہیں تھیں ان کے لئے الحاق ہی نجات کا ایک ذریعہ تھا۔ چنانچہ الحاق کے نام پر انھیں حکومت ہند میں ضم کیا گیا۔ بڑی ریاستیں جن کی تعداد (۱۴۰) کے قریب تھیں ان کا الحاق حکومت ہند کے لئے ایک دشوار کن مسئلہ بنا ہوا تھا۔ سردار پٹیل اور ان کے سکریٹری وی۔ پی مینن[۲] الحاق کے اقدامات کے طور پر دیسی ریاستوں کے والیان سے ربط پیدا کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے مہاراجہ آف پٹیالہ سے جو اس وقت چانسلر آف چیمبر آف پرنسیس تھے (ادارہ چیمبر آف پرنسیس دیسی ریاستوں کا ترجمان مانا جاتا تھا) ملاقات کی گئی اور انھیں شرکت پر راضی کرالیا جس کے بعد شرکت یا الحاق کے کام میں بڑی آسانی ہوگئی۔ ابتداً مہاراجہ پٹیالہ، گوالیار، بڑودہ اور بیکانیر شرکت پر راضی ہوگئے۔ بعد ازاں یکے بعد دیگرے دوسری کئی ریاستیں بھی ہندوستان میں شرکت کے لئے رضا مند ہوتی گئیں۔

ماؤنٹ بیٹن کو اس کام کے لئے خوب استعمال کیا گیا۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسی مقصد کے تحت وائسرائے کا عہدہ برخاست کردیئے جانے کے بعد بھی ماؤنٹ بیٹن کو ایک سال کے لئے ہندوستان کا گورنر جنرل بنایا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن کی خواہش تھی کہ انھیں پاکستان کا بھی گورنر جنرل بنایا جائے لیکن پاکستان نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے اپنا گورنر جنرل خود مقرر کرلیا۔ یہی وہ خلش تھی ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان کا مخالف بنائے رکھی۔ ماؤنٹ بیٹن جب تک وائسرائے تھے ان سے توقع تھی کہ وہ اس معاملہ میں غیر جانبدار رہیں گے مگر انھوں نے اپنے دبدبہ اور اثر و رسوخ کے ذریعہ ان ریاستوں کو جو الحاق نہیں چاہتی تھیں ہندوستان میں شریک ہوجانے کے لئے مجبور کیا (اس امر کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا دیسی ریاستیں انگریز اور وائسرائے سے بڑی گھبراتی تھیں وائسرائے کی بات کو ٹالنا ان کے بس کی بات نہ تھی)۔ مہاراجہ جودھپور نے پاکستان سے الحاق کی خواہش کی تھی جب کہ میسور اور ٹراونکور کوچین نے آزاد رہنے کا اعلان کیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کی مداخلت نے مہاراجہ جودھپور کو درخواست واپس لینے پر راغب کیا اور مہاراجگان میسور اور ٹراونکور کوچین کو شرکت پر مجبور کیا۔ ماؤنٹ

بیٹن نے گورنر جنرل جیسے جلیل القدر عہدہ پر فائز ہونے کے بعد جو جانبدارانہ رول ادا کیا ہے وہ برطانوی حکومت کے اس اعلیٰ نمائندے کو زیب نہیں دیتا تھا۔ ہندوستان نے جس مقصد کے لئے ان کی خدمات حاصل کی تھیں وہ اس میں کامیاب رہا۔ دیسی ریاستیں قانوناً آزاد تھیں اور انھیں آزاد رہنے کا حق تھا لیکن دھمکیوں اور دباؤ سے انھیں زیر کیا گیا۔ چھوٹی دیسی ریاستوں کو شراکت کے نام پر ضم کیا گیا۔ (۱۴۰) بڑی ریاستوں کے اہم اُمور دفاع، خارجہ اور مواصلات کے الحاق کے نام سے ان پر بھی قبضہ کرلیا گیا۔ آج وہ ریاستیں باوجود آزاد ہونے کے باقی نہیں ہیں۔ دستور ہند کے نفاذ اور ریاستوں کی تنظیم جدید وغیرہ کے نام پر ریاستیں نہ صرف ضم کردی گئیں بلکہ اب ان کا اصلی وجود بھی باقی نہیں رہا۔ برطانوی ہند اور (۵۶۲) دیسی ریاستوں پر مشتمل ہندوستان اب (۲۸) ریاستوں اور (۷) مرکزی زیر انتظام علاقوں پر مشتمل ملک ہے جس میں سے ایک بھی دیسی ریاست اپنے سابق نام سے موسوم نہیں ہے۔ اس طرح ہندوستان کو ایک وحدت میں ڈھالنے کا کانگریس، نہرو اور پٹیل کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔ برطانیہ جیسی بیرونی طاقت کے زیر اثر یہ ریاستیں اپنا وجود باقی رکھی تھیں لیکن آج وہ اپنا تشخص کھو بیٹھی ہیں۔ صرف دو یعنی حیدرآباد اور کشمیر ایسی مسلم مملکتیں تھیں جنھوں نے شمولیت اختیار نہیں کی اور آزادی کو باقی رکھا تھا۔ حیدرآباد نے دفعہ (۷) قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کے تحت ۱۱/ جون ۱۹۴۷ء کو آزاد رہنے کا اعلان کیا تھا اور ہندوستان اور پاکستان سے دوستانہ تعلقات رکھنے کا بھی اعلان کیا تھا۔

جس وقت حیدرآباد نے آزاد رہنے کا اعلان کیا تھا وہ جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے ہر طرف ہندوستان سے گھرا ہوا تھا چوں کہ مملکت کے وہ حصے یعنی سیکاکول، راجمندری، ایلور، مچھلی پٹنم، نظام پٹنم، کرنول، کڑپہ، بیلاری اور برار کے علاقے جو انگریزوں کے پاس معاہدات کے لحاظ سے مشروط الخدمت تھے اور جو نظام کو واپس لوٹائے جانے تھے نہیں لوٹائے گئے تھے۔ انگریزوں کی یہ دھوکہ دہی اور معاہدہ خلافی، نظام کے ساتھ بڑی احسان فراموشی تھی حالاں کہ نظام نے انگریزوں کی ہر برے وقت میں فراخدلانہ مدد کی تھی اور ان کے استحکام میں بڑا رول ادا کیا تھا اگر یہ علاقے حیدرآباد کو واپس ہوتے اس کا محل وقوع کچھ اور ہی ہوتا۔ سمندری راستہ مل جاتا تو آزادی کے برقرار رکھنے میں وہ دشواریاں پیش نہ آتیں جو بعد میں حکومت ہند نے پیدا کی تھیں۔

خوابِ غفلت

اقتدارِ برطانیہ اپنی آب و تاب کے ساتھ جب بیسویں صدی میں داخل ہوا تو آصف جاہ ششم نواب میر محبوب علی خان حیدرآباد دکن کے تاجدار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نواب میر عثمان علی خان ۲۸ راگست ۱۹۱۱ء کو مسند نشین ہوئے۔ آصف جاہ سابع یا نظام ہفتم کہلائے۔

جس وقت نظام ہفتم نے تخت سنبھالا اسی زمانے سے ہندوستان میں آزادی کی تحریک جڑ پکڑ چکی تھی۔ کانگریس اس تحریک کی روح رواں تھی۔ بعد میں مسلم لیگ بھی کانگریس سے مل کر متحدہ جدوجہد میں شریک ہوگئی (تفصیل سابقہ باب میں درج ہے)۔ بیسویں صدی کی ابتداء سے ۱۹۱۹ء تک کی جدوجہد ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی صورت میں سامنے آئی اور یہی تحریک آزادی کا مطالبہ بنی۔ ۱۹۱۹ء کے بعد سے ہندوستان کا سارا سیاسی ماحول تبدیل ہوگیا اور ذمہ دارانہ حکومتوں کے قیام کا رُخ کیا۔ سیاسی حالات تیزی سے تبدیل ہورہے تھے۔ ہندوستانی رہنماؤں کی گرفتاریاں، سیول نافرمانی، نمک کا قانون اور ستیہ گرہ جیسی تحریکات نے آزادی کے جذبات میں ولولہ پیدا کردیا تھا۔ حکومت برطانیہ نے حالات کو بھانپ لیا اور اقتدار کی محدود انداز میں منتقلی کے لئے ایک قانون وفاق ۱۹۳۵ء منظور کیا۔ اس قانون کے دو حصے تھے ایک برطانوی ہند کے صوبوں کو صوبائی خودمختاری (Provincial Autonomy) تھی اور دوسرا حصہ مرکز میں کمزور وفاق (Federation) جو دیسی ریاستوں اور برطانوی ہند کے صوبوں کے نمائندوں پر مشتمل تھا۔ دیسی ریاستوں کے بعض اُمور اور برطانوی ہند کے صوبوں کے بعض اُمور اس وفاق کے تفویض کردیئے جانے والے تھے جب کہ دیسی ریاستوں کی داخلی آزادی برقرار رکھی جارہی تھی۔ دیسی ریاستوں کے لئے یہ قانون فائدہ مند نہیں تھا بلکہ ان کے بعض اُموران کے ہاتھ سے نکل جانے کے اندیشے تھے اس لئے معاملہ لیت و لعل میں

پڑ گیا۔ دیسی ریاستیں اس تبدیلی کے لئے راضی نہیں تھیں اسی لئے وفاق عملی صورت اختیار نہیں کر سکا۔ اس قانون کے تحت برطانوی ہند کے صوبوں میں ۱۹۳۷ء میں اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے کانگریس کو ان انتخابات میں بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں ۔ ان کامیابیوں کے بعد کانگریس نے دیسی ریاستوں میں عدم مداخلت کی پالیسی ترک کردی اور ان ریاستوں میں بھی ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا۔ اس طرح ہندوستان کا سارا سیاسی ماحول برطانیہ کے خلاف ہو گیا اور آگے بڑھتے ہوئے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ ۱۵ر اگسٹ ۱۹۴۷ء کو آخرکار ہندوستان کو آزادی دے دی گئی۔ تحریک آزادی کے تین دور تھے۔ پہلا دور اوائل بیسویں صدی سے لے کر ۱۹۱۹ء تک تھا جس میں آزادی کے تصور کی بنیاد پڑی تھی ۔ دوسرا دور ۱۹۱۹ء تا ۱۹۳۷ء پر مشتمل تھا جس میں آزادی کی تصویر واضح ہو گئی تھی۔ آخری دور ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء پر مبنی تھا جس میں جدوجہد نقطہ عروج پر پہنچ گئی اور آزادی کا سورج چمکنے لگا۔ آزادی کے تصور کے ساتھ دانشور طبقے کی وابستگی نے بعد کے دور میں اس تحریک سے سماج کے دوسرے طبقات کو بھی وابستہ کر دیا اور پھر آخری مرحلہ میں عوام کے تمام سطحوں پر ہلچل شروع ہو گئی۔ پہلے دور سے ہی جمہوریت کی بات اور اس کے مطالبات نوشتہ دیوار بنتے نظر آرہے تھے۔ دوسرے دور میں یہ نوشتہ دیوار واضح اور نمایاں ہو گیا اور آخری دور میں جمہوریت منزل قرار پائی۔ اقتدار کی نشہ یا گھمنڈ نے والیان ریاست کو زمینی حقیقتوں سے بے خبر کر دیا تھا اور ان کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے رہے۔ پہلے دو ادوار میں موقع ملا تھا کہ والیان ریاست اپنی بقاء کے جتن کر لیں ۔ لیکن انھوں نے نوشتہ دیوار نہیں پڑھا جس کے نتیجہ میں تیسرے دور کے جمہوریت کے سیلاب نے ان سب کو بہالے گیا۔

افسوس کہ مغلیہ دور کی یادگار آصف جاہی سلطنت کے مکینوں کی اُنگلیاں زمانے کی نبض پر نہ رہیں ۔ اس لئے وہ تحریک آزادی کے اثرات کا اندازہ کرنے میں ناکام رہے۔ اسی دور میں مسلم معاشرہ کا جو حال تھا اس کا ایک مختصر خاکہ سابقہ باب میں بیان کیا گیا۔ عیش وعشرت میں نشاط مسلمان کو نہ تو کسی چیز کا خطرہ اور نہ کسی چیز کے کھو جانے کا احساس تھا۔ بس شخصی منفعت اور مفاد کے لئے کوشاں ۔ چار مل بیٹھتے بھی تو ملازمت ، ترقی ، اضافہ تدریجی وغیرہ پر گفتگو اور اس کے حصول کے لئے سازش میں مصروف رہتے تھے۔ زمانہ کے بدلتے ہوئے تیور سے نابلد اور نہ سمجھنے کی صلاحیت ۔

اخبارات پڑھتے بھی تو حالات کو سمجھ کر قابو پانے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔ آپس میں رقابتیں اور گروہوں میں منقسم تھے۔ پورے معاشرہ کو گھن لگ گیا تھا اور کھوکھلا ہو گیا تھا۔

کوئی ایسا رہنما یا شخصیت بھی انھیں اس دور میں نصیب نہ تھی کہ خواب غفلت سے بیدار کریں۔ حکومت حیدرآباد کی جانب سے بھی بعض ایسے اقدامات کیے گئے جن کی وجہ سے جو بھی سیاسی شعور عام حالات میں بیدار ہو سکتا تھا وہ بھی نہیں ہو سکا۔ تحریک خلافت اور تحریک آزادی کے اثرات ہندوستانی عوام پر پڑ چکے تھے اور خاص طور پر برٹش انڈیا تحریک سیول نافرمانی کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ ان تحریکات سے راست انگریز اور ان کا اقتدار متاثر تھا۔ جب ان تحریکات کا اثر حیدرآباد میں محسوس ہونے لگا حکومت نے ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء میں ایسے قواعد نافذ کی جن کی رو سے صحافت، تقاریر، جلسوں اور بیرونی رہنماؤں کی آمد پر سختیاں لگ گئیں۔ جب کہ ایسے تحدیدات دیگر دیسی ریاستوں میں نہیں لگائے گئے۔ بلکہ میسور، ٹراونکور و کوچین کی دیسی ریاستیں عوام کے شعور بیدار کرنے میں ممد و معاون رہیں۔ عوام کو صحافت اور دیگر ذرائع ابلاغ سے استفادہ کا موقع دیا گیا۔ ان تحدیدات کے ذریعہ حیدرآباد کے پرسکون ماحول کو جہاں متاثر ہونے نہیں دینا تھا وہاں انگریزوں کو بھی خوش کرنا تھا تا کہ انگریزوں اور نظام کے تعلقات میں بگاڑ نہ آنے پائے۔ نتیجتاً غفلت سے متاثر مسلمان سوتا ہی رہا۔ حیدرآباد کی اُردو صحافت بھی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے مسلم بیداری کی طرف توجہ نہیں دی کثیر الاشاعت اخبار رہبرِ دکن اور وقت کے علاوہ میزان، نظام گزٹ وغیرہ عوام کی بیداری کو اُجاگر کرنے سے محروم رہے۔

مذہبی پیشوا جن کے ذمہ مسلمانوں کی اصلاح، بیداری اور غیر مسلموں میں تبلیغ کا کام تھا اپنے فرائض منصبی سے غافل تھے اور شخصی مفاد میں منہمک تھے۔ ان میں سے با اثر اصحاب نے خود کو دربار سے وابستہ کر لیا تھا اور سازشوں کا حصہ بن گئے تھے۔ چند ایک کے سوا تقریباً سب ہی نے اپنے فرائض کو فراموش کر دیا تھا۔ اگر یہ لوگ تبلیغ کے ان کے فرائض سے وابستہ رہتے ممکن تھا کہ مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بڑھ جاتا اور مسلم مفاد کے تحفظ کی سبیل نکل آتی۔

اس وقت یہ سوال سامنے آیا تھا کہ ذمہ دارانہ حکومت (جمہوریت) قائم ہوتی ہے تو حیدرآباد کی مسلم مملکت کو کیسے بچایا جا سکتا ہے جب کہ (۸۵) فیصد آبادی غیر مسلموں پر مشتمل تھی اور مسلمان

صرف (۱۵) فیصد تھے۔ اس مقصد کے تحت منصوبہ سازی کے لئے (۲۵) سال (۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک) سے زائد موقعہ ملا تھا۔ بیدار مغزی ہوتی اور دور رس نگاہیں دیکھتی تو جتن ہو جاتے۔ مسلمانوں نے اپنے مستقبل کو حضور نظام سے اس حد تک وابستہ کرلیا تھا کہ ان کی موجودگی میں مستقبل کی فکر کی ضرورت محسوس نہیں کیا۔ لیکن حضور نظام کا مزاج کچھ اور تھا۔ انھیں تو مسلم مفاد سے زیادہ اپنے مفاد کی فکر تھی۔ ان میں سیاسی حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت تھی اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے آنے والے خطرے کو نہ سمجھا ہو۔ فرلیس بادشاہ تو ایسے خطروں کو سب سے پہلے بھانپ لیتے ہیں۔ چوں کہ یہاں معاملہ بادشاہت بمقابل جمہوریت کا تھا اس لئے حضور نظام کے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ ایسی جمہوریت کے لئے راہ ہموار کرتے جس میں مسلمانوں کو فیصلہ سازی کا موقعہ مل جاتا۔ شاید اسی لئے نظام نے خاموشی کو مناسب تصور کیا۔

حضور نظام نے اپنی حکمرانی کا آغاز ہی نذرانے قبول کرنے سے کیا۔ نتیجہ میں ریاست کا نظم ونسق متاثر ہونے لگا۔ رشوت ستانی اور بدانتظامی بڑھ گئی۔ حالات پر قابو پانے، انگریزوں نے ۱۹۱۹ء میں سر علی امام کو نظام کی مرضی کے بغیر صدر اعظم مقرر کیا۔ سر علی امام نہ صرف اعلیٰ قانون داں بلکہ گورنر جنرل ہند کی کونسل کے ممبر بھی تھے۔ دور رس، مدبر اور باصلاحیت تھے۔ ان کی دور اندیشی کی داد دینی چاہیئے کہ انھوں نے نوشتہ دیوار پڑھ لیا اور اندازہ لگالیا کہ آنے والے دنوں میں اگر جمہوریت کا طوفان برپا ہوتا ہے تو حیدرآباد دکن کی مسلم سلطنت کا بچنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کا تحفظ صرف اور صرف مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ کے ذریعہ ہی کیا جاسکتا تھا۔ اسی لئے نو آبادکاری کا منصوبہ بنایا تاکہ شمالی سرحدی علاقے جیسے عادل آباد، نظام آباد میں جو بڑی حد تک کم آباد تھے ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے مسلمانوں کو لاکر بسایا جاسکے اور ان کی تناسب میں اضافہ کیا جاسکے۔ بدر شکیب[1] نے لکھا ہے کہ نو آبادکاری چوں کہ موپلاؤں سے ہونے والی تھی جو انگریز دشمنی کے لئے مشہور تھے اسی لئے ریذیڈنسی نے مخالفت کی اور اِدھر ہندوؤں نے بھی اپنے مستقبل کے لئے خطرہ سمجھا اس لئے منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا۔ جہاں تک موپلاؤں کے ذریعہ نو آبادکاری کا تعلق تھا وہ صحیح نہیں تھا کیوں کہ سر علی امام انگریزوں کے مفاد کے خلاف نہیں جاسکتے تھے انگریز موپلاؤں کے سخت خلاف تھے۔ چوں

---

[1] حیدرآباد کا عروج وزوال صفحہ ۶۳

کہ سر علی امام، نظام کی مرضی کے خلاف انگریزوں کی جانب سے مسلط کیے گئے تھے اس لئے نظام موقع کی تلاش میں تھے کہ کس طرح انہیں ہٹایا جاسکتا ہے۔انھیں موقعہ ہاتھ آگیا چنانچہ اسی منصوبہ کو ان کے خلاف استعمال کیا گیا اوران کو صدر اعظم کے عہدہ سے مستعفی ہونے پر مجبور کردیا گیا۔

سر علی امام، انگریزوں کے وفادار تھے۔ان کا مفاد بھی انھیں عزیز تھا۔اس کے باوجود مسلم مفاد کو لاحق خطرہ کو محسوس کیا تھا۔ فریس اور دور رس نگاہ رکھنے والے اس رہنما نے مسلمانوں کے تناسب کو بڑھانے کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ بنایا تھا جب کہ اس وقت کسی اور رہنما یا شخص کے خواب و خیال میں ایسا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔علماء اور مشائخین اگر تبلیغ کی اہمیت کو محسوس کرتے تو اس منصوبے کی ضرورت نہ ہوتی۔اس منصوبے کی افادیت اور اہمیت کا ادراک بہادر یار جنگ جیسے فریس رہنما نے کیا۔اس تحریک کے احیاء کے لئے بہادر یار جنگ کی بے چینی کا اندازہ ملاحظہ کیجئے :

''۱۹۳۸ء میں علاقہ ترکستان کے کئی ہزار جلاوطن تبت کے راستے کشمیر آئے۔کشمیر کے راجہ نے ان مظلومین کا قافیہ حیات تنگ کردیا۔اس مسئلہ کی یکسوئی، ملّی اور سیاسی ہر دو نقطۂ نظر سے قائد ملت کی توجہ کی محتاج تھی...... قائد ملت نے صدر اعظم باب حکومت سر احمد سعید خان نواب صاحب چھتاری کو اس مسئلہ کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے جو جملہ تحریر فرمایا تھا وہ اس مسئلہ کے حل کی ملّی اور سیاسی اہمیت کی کامل وضاحت کا مظہر تھا کہ :

یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی یہ خدمت تاریخ حیدرآباد میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔

اپنے اس تاریخی مکتوب میں قائد ملت نے نواب صاحب چھتاری کو اس مسئلہ کے پس منظر اور اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا :

ایک خاص مسئلہ کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ قازق علاقہ ترکستان کے کئی ہزار جلاوطن تبت کے راستے کشمیر میں وارد ہوئے ہیں۔حکومت کشمیر نے تو ان پر بہت سے مظالم کئے لیکن حکومت برطانیہ نے اخباری اطلاعوں کے مطابق ان کو ہندوستان میں آباد کرلینے کا ارادہ کرلیا ہے، میرے خیال میں بہترین موقع ہے کہ حیدرآباد ان پر اپنے دامن کا سایہ پھیلادے، تھوڑا شور ضرور مچے گا لیکن کامیابی یقینی ہے اور فوائد ظاہر ہیں، آصف آباد اور نظام آباد میں ہزاروں ایکڑ اراضی

افتادہ پڑی ہے اور وہاں ان کو آسانی سے آباد کیا جا سکتا ہے، بے شک ابتدائے کار میں تھوڑا روپیہ بطور تقاوی وغیرہ خرچ کرنا پڑے گا، ضرورت صرف تھوڑی فراست اور جرأت کی ہے جس سے یہ کام بہ آسانی پورا ہو سکتا ہے۔ میری رائے میں حکومت کے سامنے اس مسئلہ کو رکھنے سے قبل اگر جناب حکومت برطانیہ سے اپنے طور پر گفت وشنید فرمائیں اور اس کو آمادہ کرلیں تو بہت مناسب ہوگا، میں اس کام کی طرف آپ کی خاص توجہ کا متمنی ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی یہ خدمت تاریخ حیدرآباد میں ہمیشہ یادگار رہے گی اور آپ اس کام کی تکمیل کریں گے، جس کی بنیاد سر علی امام مرحوم نے رکھی تھی۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو اس کی توفیق وطاقت عطا فرمائے۔"

اسی طرح افریدیوں اور مہمندوں اور خٹک کے عوام کو بھی وہ دکن کی سلطنت سے قریب کرنے کی کوششوں میں رہے۔ ایک خط میں اپنی اس تمنا کا اظہار کیا تھا :

"میری اپنی تمنا ہے کہ افریدیوں اور مہمندوں کی طرح قوم خٹک کے تعلقات بھی دکن کی اسلامی سلطنت سے قائم ہوں، میں اس کے لئے کوشش کروں گا۔"

اپنے ایک مکتوب میں حیدرآباد میں مسلم آبادی کے ضمن میں یہ وضاحت کی تھی :

"پٹھانوں کی بھرتی کی نسبت کوشش جاری ہے، پائیگائیوں اور صرف خاص کو بھی آمادہ کیا جا رہا ہے، مسلم آبادی میں اضافہ سے متعلق بھی ایک سے زیادہ تجاویز پیش ہیں۔"

روسی علاقہ قازقستان کے جلاوطن مسلمانوں کو باز آبادکاری کے ضمن میں بھی قائد ملت نے کوئی دقیقہ فروگذاشت باقی نہ رکھا، مگر ان کی ساری کوششیں ناعاقبت اندیش حکمران وقت اور خودغرض اربابِ حکومت کی ابلہ فریبی کے باعث شرمندہ معنی نہ ہو سکے۔

(سوانح بہادر یار جنگ جلد سوم از نذیرالدین احمد صفحہ ۲۵۵ تا ۲۵۷)

سر علی امام، حیدرآباد کے لئے نعمت غیر مترقبہ (Blessing in Disguise) تھے۔ وہ قدرت کی جانب سے نظام کو ان کے بُرے وقت ملے تھے۔ مگر افسوس کہ نظام نے محض اپنے شخصی مفاد کی خاطر ایک ایسے مفکر اور مدبر کو جو سلطنت کی بقاء کا درد اور سامان رکھتا تھا چلتا کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ سر علی امام، نظام اور ان کے دربار کے لئے ایک کانٹا تھے لیکن ان کا نوآبادکاری کا منصوبہ نہایت معقول

اور عملی تھا جسے ان کے جانے کے بعد بھی روبہ عمل لایا جا سکتا تھا۔ شائد نظام اور ان کے دربار کے ذہن میں یہ بات آئی ہو کہ اگر مسلمانوں کا تناسب بڑھ جائے تو خود حضور نظام کے اقتدار کو خدشہ لاحق ہو جائے گا اور جمہوریت کے نتیجہ میں مسلمانوں کا حکمراں کوئی اور بن جائے گا۔ یہ منفی سوچ بالآخر حیدرآباد کو لے ڈوبی۔ مسلم تناسب کا نو آبادکاری کے ذریعہ اضافہ ہوتا تو اس مملکت پر آنچ نہ آتی۔

آصف جاہ ثانی نواب میر نظام علی خان کا ٹیپو سلطان کا ساتھ نہ دینا انگریز اقتدار کو دکن پر مسلط کرنا تھا۔ ایک بنیادی غلطی تھی جو آصف جاہی سلطنت کے خاتمہ کی شروعات کا سبب بنی۔ اس کے بعد آصف جاہ سابع کی دوسری بڑی غلطی جمہوریت کے طوفان کے مقابل میں ان کی مجرمانہ بے عملی تھی جو آصف جاہی اقتدار کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔

بیداری اور پیچیدہ مسائل

قانون اصطلاحات ۱۹۱۹ء کی وجہہ سے سارے ہندوستان میں شدید احتجاج شروع ہوئے اور جلیان والے باغ کے واقعہ کی وجہ سے تحریک آزادی میں مزید شدت پیدا ہوگئی۔ بڑے پیمانے پر احتجاجی جلسے منعقد کئے جانے لگے اور دو سال کے اندر حکومت برطانیہ کے خلاف بے چینی اور ناراضگی بڑھ گئی۔ سارا ماحول حکومت برطانیہ کے خلاف ہو گیا۔ حکومت برطانیہ ابتداء سے ہی تحریک آزادی میں رخنہ ڈالنے کے لئے فرقہ واریت کو ہوا دینے لگی تھی اور ہندو مسلم فسادات کے پیچھے اسی کا دماغ کام کرتا رہا۔ ۱۹۲۱ء میں کئی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جس میں ملابار کے موپلا کا فساد بڑا بھیانک تھا۔ ۱۹۲۶ء تک سارا ہندوستان فسادات کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ امرتسر، پانی پت، جبل پور، گونڈہ، آگرہ، گلبرگہ، ناگپور، لکھنؤ، شاہجہاں پور، الہ باد وغیرہ میں فسادات ہوئے۔ ہندو مہا سبھا اور آریہ سماج ان فسادات میں ملوث تھے۔ آریہ سماج نے شدھی تحریک[1] کے ذریعہ ۱۹۲۴ء میں کلکتہ کے ماحول کو بگاڑا اور فسادات کروائے۔ اس کے بعد شدھی اور سنگھٹن تحریک کو شمالی ہندوستان تک پھیلائی گئی اور پھر ہندو مہا سبھا اور آریہ سماج کے مخالف مسلم رویئے کے نتیجہ میں ہندو اور مسلمانوں میں اختلافات نمودار ہو گئے۔

آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا، ہندو مذہب کی نشاط ثانیہ چاہتے تھے۔ اگر چہ یہ مذہبی تحریک تھی لیکن اس کی بنیاد دوسرے مذہبوں کی مخالفت اور دل آزاری پر رکھی گئی تھی۔ ان دونوں تنظیموں کا مقصد ہندو مذہب کی تبلیغ کرنا اور اصلاحات میں دلچسپی لینے سے زیادہ اکثریتی موقف سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مسلمانوں سے سیاسی اقتدار چھین کر ہندو راج قائم کرنا تھا۔ چنانچہ مذہب کی آڑ میں ہندو راج

قائم کرنے کے لئے جدوجہد شروع کی گئی۔ اسی لئے اس وقت کی مسلم قیادت نے ان تحریکوں کا ادراک ہندوستان کی قومی تحریک کے طور پر کیا تھا۔ اگر چہ کانگریس نے غیر مذہبی اساس پر جدوجہد آزادی کی تحریک چلانے کے عزم کا اظہار کیا تھا لیکن آزادی کے جوش و جذبے میں کانگریس کا اساسی نظریہ اس وقت متاثر ہو گیا جب اس میں ایسے لوگ بھی داخل ہو گئے جن کے لباس تو کھادی کے تھے لیکن ذہن آریہ سماج اور ہندو مہاسبھا کا تھا۔ یہ تبدیلی مسلم قیادت کے ایک گروہ کو کھٹکنے لگی بدلتے رجحانات کا یہ وہ نقطہ آغاز ہے جو بعد کے برسوں میں تحریک پاکستان کی صورت میں سامنے آیا۔ کانگریس کو ہندو اساس پر لانے میں آریہ سماج اور ہندو مہاسبھا کا بڑا ہاتھ تھا۔

آریہ سماج کی شدھی اور سنگھٹن تحریک جو شمالی ہند تک پھیلا دی گئی تھی اس کے اثرات سے حیدرآباد متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ چنانچہ آریہ سماج کے دستے حیدرآباد آنے لگے اور وہ مذہب کی تبلیغ کی بجائے اسلام کے خلاف زہر اُگلنے لگے۔ قرآن پاک، پیغمبر اسلام اور اسلام کے خلاف طرح طرح کی بدکلامی کے ذریعہ شر انگیز جذبات اُبھارنے کی کوشش کی۔ حیدرآباد کا ہندو جو صدیوں سے شیر و شکر کی طرح زندگی گزارتا تھا پہلی مرتبہ محسوس کرنے لگا کہ ہندو اور مسلمان نہ صرف الگ ہیں بلکہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ مسلمانوں کے لئے بھی یہ بات بڑی حیرت انگیز تھی۔ تاہم مسلمانوں نے اس وقت تک خاموشی اختیار کی جب تک کہ آریہ سماجیوں کی خاصی تعداد حیدرآباد نہیں پہنچ گئی اور تنظیم کو منظّم نہیں کیا۔ اس تنظیم کا مرکزی دفتر اُودگیر میں قائم کیا گیا جس کا نام ''آریہ پرتی شدھی سبھا نظام راجیہ'' رکھا گیا۔ اضلاع میں شاخیں قائم کی گئیں اور حیدرآباد میں (۱۸) شاخیں سرگرم کر دی گئیں۔ تحریروں، تقاریر، جلوسوں اور نعروں سے منافرت کا بیج بویا گیا اور دہلی، ناگپور، پونا، احمد آباد کی ہندو جماعتوں کے لئے حیدرآباد چراگاہ بن گیا اور اس علاقے کے پورے جسم میں نفرت اور منافرت کا زہر پھیل گیا۔

اس وقت تک بھی مسلمانوں میں کوئی ہلچل نہیں تھی بلکہ راحت و سکون سے سرشار اجتماعی زندگی کے تقاضوں سے دور تھے۔ مسلمانوں میں فرقہ بندی حد درجہ بڑھ گئی تھی۔ وہابی غیر وہابی، صوفی غیر صوفی، سنی، شیعہ اور مہدوی کے درمیان جھگڑے عام ہو گئے تھے۔ چند مخلص اور حساس دل احباب جن میں مولوی محمود نواز خان نائب قلعہ دار، مولانا بندہ حسن، مولانا حکیم مقصود علی اور مولانا حضرت صابر حسینی وغیرہ پیش پیش تھے، فکر مند ہو گئے۔ چنانچہ اس انتشار کو دور کرنے جملہ فرقہ ہائے اسلامی

میں باہمی اتفاق واتحاد پیدا کرنے اور ساتھ ہی وسیع تر بنیادوں پر اپنے فروعی اختلافات کو قائم رکھتے ہوئے اُصول اسلامی پر متحد کرنے کی غرض سے جملہ فرقہ ہائے اسلامی کے پیشواؤں اور اکابرین کا اجلاس مشاورت ۱۲؍نومبر ۱۹۲۷ء کو توحید منزل چوک اسپاں میں مولوی حاجی فتح اللہ کی صدارت میں منعقد کیا۔ اس جلسہ کے محرک مولوی محمود نواز خان تھے۔ مشاورت کامیاب رہی اتحاد واتفاق کا مقصد پورا ہوا اور ایک مجلس کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ مجلس کے مختلف نام زیر غور آئے جن میں سے اتحاد بین المسلمین کا نام منظور کیا گیا۔ ضروری ابتدائی قواعد ودستور العمل مدون اور منظور کئے گئے۔ دوسرا جلسہ ۹؍ردے ۱۳۳۸ف (۱۹۲۸ء) کو منعقد ہوا جس میں مجلس کے نام سے لفظ بین نکال کر مجلس کا نام مجلس اتحاد المسلمین رکھا گیا۔ ۱۸؍فروری ۱۹۲۹ء کو جلسہ عام میں دستور العمل منظور ہوا۔ مجلس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے۔[۲]

۱ - تمام فرقہ ہائے اسلامی کو بغرض تحفظ اسلام واُصول اسلام کے تحت متحد ومتفق کرنا۔

۲ - مسلمانوں کی اقتصادی ومعاشرتی وتعلیمی مقاصد کا تحفظ کرنا۔

۳ - ملک ومالک کی وفاداری قانون مروجہ کا احترام کرنا۔

یعنی مسلمانوں میں اتحاد اوران کے اقتصادی، معاشی اور تعلیمی تحفظ کے اُمور سے متعلق کام کرنا طے پایا۔ سیاسی مسلک شامل نہیں کیا گیا۔ اس لحاظ سے اتحاد واتفاق کا کام ہوتا رہا۔ بڑی دشواریاں پیش آئیں لیکن ہر فرقہ کے صاحب اثر افراد اور پیشواؤں کی موجودگی میں مشکلات آسانی سے حل ہوتی گئیں اور ایک اتحاد کا پلیٹ فارم بن گیا۔ ۱۹؍ڈسمبر ۱۹۳۲ء کو ہندو مہاسبھا کی ہدایت پر وامن نائیک کی صدارت میں ہندوؤں کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں حکومت حیدرآباد پر یہ الزام لگایا گیا کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہے ہیں اور طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ مجلس اتحاد المسلمین نے جواباً اس کی تردید کی اور پمفلٹس کے ذریعہ تفصیل سے ہندوؤں کے ساتھ حسن سلوک کا جائزہ لیا کہ کس طرح ہندو ہر شعبہ حیات میں مسلمان سے زیادہ آگے اور برتر مقام پر ہیں۔[۳]

---

[۲] صفحہ ۱۰۳ و ۱۰۴ سوانح بہادر یار جنگ حصہ دوم از نذیر الدین احمد اور
صفحہ ۳۵ تاریخ مجلس اتحاد المسلمین شائع کردہ دار الاشاعت سیاسیہ مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد دکن

[۳] صفحہ ۳۶ و ۳۷ تاریخ اتحاد المسلمین دار الاشاعت سیاسیہ اتحاد المسلمین حیدرآباد دکن حیدرآباد دکن

۱۹۲۷ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک بھی وہ سیاسی بیداری پیدا نہیں ہوئی جس کی حالات زمانہ کے لحاظ سے شدید ضرورت تھی۔ بیداری صرف اس حد تک تھی کہ انتشار کو اتحاد میں بدلا جائے اور مخالف اسلام تحریکوں کے اثرات کے خلاف تحفظ کیا جائے یعنی نوعیت دفاعی اقدامات کی تھی۔ البتہ اس دوران اتحاد کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔

قانون اصلاحات ۱۹۳۵ء اور اس کے تحت برطانوی ہند کے (۱۱) صوبوں میں صوبائی خودمختاری کے لئے انتخابات، کانگریس کی بڑی کامیابی اور دیسی ریاستوں میں بھی ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ تحریک آزادی کی راہ میں اہم سنگ میل تھے۔ کمزور وفاق کے ذریعہ انگریز اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتے تھے اور دیسی ریاستوں پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ وفاق میں شامل ہو جائیں جب کہ دیسی ریاستیں اس کی مخالفت کر رہی تھیں۔ ان حالات میں سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدر آباد نے ۲۲ رستمبر ۱۹۳۷ء کو مجلس وضع قوانین میں اعلان کیا کہ حکومت نے اپنی آئینی حکمرانی میں جو اس سلطنت میں صدیوں سے جاری ہے تبدیل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ یہ فیصلہ مسلمانوں کے صدیوں کے اقتدار کے خاتمہ کی شروعات کا اعلان نامہ تھا۔ چنانچہ مجلس اتحاد المسلمین جو اس وقت تک مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بن چکی تھی بیدار ہو گئی۔ ۱۴ر فروری ۱۹۳۸ء کو ایک جلسہ مولانا عبدالقدیر صدیقی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں منعقد ہوا اور مجلس کے سیاسی مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے اغراض و مقاصد میں سیاسی مسلک کی دفعہ کا اضافہ کیا گیا:

> "مسلمانان مملکت آصفیہ کی یہ حیثیت ہمیشہ برقرار رہے کہ فرمانروائے ملک کی ذات اور تخت ان ہی کی جماعت کے سیاسی اور تمدنی اقتدار کا مظہر ہے۔ اسی بناء پر مملکت کی ہر دستوری ترمیم میں فرمانروا کے اقتدار شاہانہ کی بقاء و احترام مقدم رہے۔"

(تاریخ اتحاد المسلمین دارالاشاعت سیاسیہ حیدر آباد دکن صفحہ ۴۸)

فروری ۱۹۳۸ء سے مجلس نے مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا بیڑا اُٹھایا۔ (۵۰) سال طویل جدوجہد کے بعد ہندوستان میں جب تحریک آزادی اپنے منزل کے قریب تھی اس وقت حیدر آباد کا مسلمان جاگا تو وہ خود کو دوراہے پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف جمہوریت اپنی آب و تاب سے گھور رہی تھی، دوسری طرف مسلم مملکت مجسم فکر بنی یہ پوچھ رہی تھی کہ اُسے کیسے بچایا جائے گا۔ مسلمان

(۱۵) فیصد تناسب میں ہوتے ہوئے جمہوریت کی بازی ہار چکا تھا۔ نظام کا حکیم السیاست کا اعزاز ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ اگر سر علی امام کے منصوبے نوآبادکاری کی عملی صورت گری ہوتی تو نظام حکیم السیاست کہلانے کے مستحق رہتے۔ سر علی امام کے وزارت عظمیٰ سے ہٹنے کے بعد زمام حکومت ایسے وزراء کے ہاتھ میں آئی جو حیدرآباد کے قدیم خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ایسے اقدامات کئے جائیں جو جمہوریت کی بنیاد کو مضبوط بناتے اور شاہی اقتدار کو کمزور کرنے کا سبب بنتے۔ اقتدار شاہی کی بقاء ہی نظام، ان کے وزراء اور ان کے دربار کی ترجیح تھی۔ وہ مزاج جو شاہانہ تہذیب کا جزلاینفک تھا، نظام کو اس بات پر راضی نہ کرسکا کہ ایک مسلم مملکت کی بقاء کے لئے اپنی بادشاہت کی قربانی پیش کرے۔ مسلمان جب جاگا تو یہی پیچیدہ سوال اس کے سامنے تھا کہ مسلم مملکت کو کیسے بچایا جائے۔ بہادر یار جنگ، مجلس اتحاد المسلمین کو لے کر اس مسئلہ کے حل کے لئے نکل پڑے۔ یہیں سے حیدرآباد کی فضاء میں سیاسی ہلچل تیز ہوگئی۔

حالات مجلس اتحاد المسلمین، نظام اور حکومت حیدرآباد

مجلس اتحاد المسلمین جس کا قیام ۱۹۲۷ء میں ہوا صدر کا عہدہ نہ تھا بلکہ معتمد ہی کا سب سے بڑا عہدہ تھا۔ عرصہ دراز یعنی ۱۹۳۷ء تک معتمد کے عہدہ پر ابوالبیان بہاؤالدین فائز تھے اور نواب بہادر جنگ شریک معتمد تھے۔ ۱۹۳۸ء میں مولوی ابوالحسن سید علی ایڈوکیٹ معتمد ہوئے اور بہادر یار جنگ شریک معتمد رہے۔ ۱۹۳۹ء میں مجلس کے دستور میں مزید بتدیلی ہوئی اور صدارت کا عہدہ قائم ہوا تو نواب بہادر یار جنگ کا صدر کی حیثیت سے ۱۹۴۰ء میں انتخاب عمل میں آیا۔ نواب بہادر یار جنگ انتقال تک (۲۵ رجون ۱۹۴۴ء) صدارت کے عہدے پر فائز رہے۔

۱۹۳۸ء میں مجلس اتحاد المسلمین کے دستور میں ترمیم کے بعد مجلس نے مسلمانوں کے مذہبی، تہذیبی، سماجی اور معاشی اُمور کے علاوہ سیاسی اُمور کی ذمہ داری بھی لی جو وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔ سیاسی میدان میں قدم رکھنے کے بعد مجلس پر ایک بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوئی۔ ایک طرف مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگا کر ان میں سیاسی شعور پیدا کرنا اور ان کو منظّم و مضبوط بنانا تھا تو دوسری طرف سب سے اہم ذمہ داری ذمہ دارانہ حکومت (جمہوریت) کے تقاضوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مسلم مملکت کی حفاظت اور مسلمانوں کی سیاسی برتری کو قائم رکھنا تھا۔ معتمد ابوالبیان بہاؤالدین اور نواب بہادر یار جنگ نے مل کر خوب محنت کی :

> ''خواجہ بہاؤالدین نے اپنی تجارتی مصروفیتوں کے باوجود شب و روز محنت کی اور نواب بہادر یار جنگ نے اپنا سارا وقت مسلمانوں کی تنظیم اور ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے میں صرف کیا۔ نواب صاحب کی خداداد قوتِ بیانی نے اسی موقع پر بڑا کام دیا اور مجلس کو عوام میں بڑی مقبولیت حاصل ہوگئی۔ اسی زمانہ میں مجلس اتحاد المسلمین نے شاخوں کے قیام کا کام شروع کیا اور اس تیزی کے ساتھ شروع کیا کہ دوست و دشمن حیران رہ گئے۔

اس سال ایک لائحہ عمل بنا کر مجلس کی شاخوں کو دیا گیا۔ جس میں دارالمطالعہ، ورزش گاہ، دارالمباحث اور چھوٹی چھوٹی تجارتیں شامل تھیں۔

ایک ہی سال کے اندر شاخوں کی تنظیم، سیاسی بیداری، ورزش گاہوں کا قیام یہ سب مجلس نے کس طرح کیا اور کیوں کر یہ سب کچھ ممکن ہوا اس کا جواب صرف یہ ہے کہ کام کرنے والے پر جوش، مخلص اور بے چین قلب رکھنے والے تھے۔"

(تاریخ اتحاد المسلمین دارالاشاعت سیاسیہ مجلس اتحاد المسلمین حیدر آباد صفحہ ۵۰)

حیدر آباد میں آریہ سماجیوں اور ہندو مہا سبھائیوں کی منافرت آمیز اور زہریلی کارستانیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ان ساری منافرانہ کارروائیوں کا مقصد یہی تھا کہ ہندوؤں میں فرقہ وارانہ خیالات کی پرورش ہو، تاکہ ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے مطالبے میں شدت پیدا ہو۔ ۱۹۳۷ء کے بعد کانگریس نے دیسی ریاستوں میں عدم مداخلت کی پالیسی ترک کر کے ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی سعی کرنے لگے۔ آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا تحریک چلانے والے کانگریس سے متاثر اشخاص نے سوامی رامانند تیرتھ کی سرکردگی میں ایک ادارہ حیدر آباد اسٹیٹ کانگریس کے نام سے قائم کیا جسے اگر چہ کہ انڈین نیشنل کانگریس کی منظوری نہیں تھی تاہم اسے انڈین نیشنل کانگریس کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس وقت تک آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا حیدر آباد میں فرقہ وارانہ ماحول کو ہوا دے چکے تھے۔ اب کانگریس ان دو تنظیموں کے ساتھ مل کر ستیہ گرہ شروع کی تاکہ ہندوؤں میں فرقہ وارانہ جذبات بھڑکانے کے علاوہ ہندو مسلم منافرت پیدا کی جا سکے۔

۱۹ر ڈسمبر ۱۹۳۲ء کو ہندو مہا سبھا نے ایک جلسہ وامن نائیک کی صدارت میں منعقد کیا جس میں یہ الزامات لگائے گئے کہ حیدر آباد میں ہندوؤں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا ہے۔ ہندو مہا سبھا نے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ ہندو مسلم اتحاد کو جو صدیوں قائم تھا نقصان پہنچایا جا سکے۔ جلسہ میں تین پمفلٹس تقسیم کئے گئے اور وامن نائیک کی تقریر اور پمفلٹس کی تائید میں ریزولیوشن منظور کیا گیا۔ مجلس نے ان کارروائیوں پر سخت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ان تمام الزامات کی تردید کی اور کہا کہ ہندو مسلم اتحاد کو مٹانے اور یہاں کے پرامن ماحول میں بدامنی پھیلانے کی سازش کی جا رہی ہے۔ مجلس نے ایک پمفلٹ کے ذریعے ان تمام باتوں کا جواب دیا جو

غلط فہمی اور بدامنی پھیلانے کے لئے کی گئی تھیں ۔ پمفلٹ میں وہ ساری تفصیلات درج تھیں جو ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری، حسن سلوک اور معیشت کے ہر میدان میں ان کی برتری اور سہولتوں کا تذکرہ تھا۔ اس کے کچھ حصے درج ذیل ہیں :

"مجلس اتحادالمسلمین ملک سرکار عالی ۱۹ر ڈسمبر ۱۹۳۲ء والے ہندو مہا سبھا کے زیر ہدایت منعقدہ جلسے کے رزولیوشن اور جلسے مذکور کے صدر وامن نائیک کی تقریر اور اس کی تائید میں تین پمفلٹوں کی اشاعت کی نسبت سخت اظہار افسوس و ناپسندیدگی کرتی ہے کہ اس کے ذریعے سراسر غلط واقعات کا اظہار کر کے ملک سرکار عالی کے صدہا سالہ ہندو مسلم اتحاد کو مٹانے اور اسی طرح ملک کے امن وامان کو بدامنی سے تبدیل کرنے کے لئے قدم اُٹھایا گیا ہے پس انسداد واسباب بدامنی کی خاطر مجلس اتحادالمسلمین ملک سرکار عالی رزولیوشن ہائے مذکورہ کے متعلق حسب ذیل انکشاف حقیقت کرنے پر مجبور ہے۔

یہ رزولیوشن برطانوی ہند کی تقلید میں (جہاں کے محکوم ہندو مسلمان ایک تیسری فاتح وحکمران قوت سے اکثریت واقلیت کے دلائل پر دست وگریباں ہے) اس نیت سے مرتب کیا گیا ہے کہ حیدرآباد کی خود حکمراں ریاست میں بھی (جہاں کہ حکومت نے خود اپنی محکوم رعایا کو ہر طرح سے امن وآزادی دے رکھی ہے) امن سوز اغراض کی اشاعت سے ملک کی پرامن فضا کو مسموم کردے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ یہاں زراعت، تجارت، گتہ داریاں، لین دین، سمتھان لیکھی، دیشپانڈیا گیری، دیہی عہدہ داریاں وغیرہ سب ہندوؤں کے قبضے میں چھوڑ دی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان مواضع کی بہترین اراضیات سے وہی متمتع ہوتے ہیں ۔ ایسے تقریباً (٦٣) ہزار ملازمین دیہی کے ساتھ سرکار کی مہربانی اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ وہ سرکاری رقم تغلب بھی کرلیں یا کسی فوجداری جرم میں سزایاب ہوجائیں تو بھی سرکار ان کی توریث کو برقرار رکھتی اور ان کے فوت ہونے پر ان کے ورثاء کو ان کی معاش وخدمت دے کر ایسے خاطی کے خاندانی حقوق کی حفاظت کرتی رہتی ہے ۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان ملازمین دیہی کو اپنے زیر اثر رعایا و کاشتکاران سے سودی لین دین کرنے اور اپنے حلقۂ اثر

میں ان کو ہر طرح کی بیع وشری کی اجازت ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس جب رعایا محاصل سرکاری داخل کرتی ہے تو اس میں سے پہلے اپنے قرضے کی رقم معہ سود مجرا لے کر سرکاری پن کو بقائے میں ڈال دیتے ہیں گویا سرکار خود نقصان میں رہ کر اس طبقے کو فائدہ پہنچاتی ہے۔

اس کے علاوہ ہندوؤں کے ساتھ سرکار کی رواداری کا یہ عالم ہے کہ ہندو معاشدار لاولد فوت ہونے کے باوجود سرکار اپنی معطیہ معاشوں کو (جن کو وہ ایسی صورت میں داخل سرکار کر لینے کی بالکل مجاز ہے) محض تبنیت کے ضمن میں ایک راستہ چلنے والے شخص پر بھی بحال کر دیتی ہے۔

لاکھوں روپیوں کا نقد رسوم اور لاکھوں روپیوں کی معاش دیشمکھی و دیشپانڈیا گیری جو محض موقتی و مقامی خدمات کی ادائی کا معاوضہ تھا۔ باوجود اب ان خدمات کے باقی نہ رہنے اور ان فرائض کو سرکار دوسرے ذرائع سے بہ مصارف مزید انجام دلانے کے وہ تمام معاش ہائے معاوضہ ہر وراثت پر بغیر کسی وضعات وکمی کے بدستور ان پر بحال رکھے جاتے ہیں۔

یہی وہ مراعات ہیں کہ ہندوؤں کی معاشیں دو سو سال کی حکمرانی آصفیہ کے بعد بھی علیٰ حالہ قائم و برقرار ہیں۔ جس کے باعث ہندوؤں کا تمول کبھی زوال پذیر نہیں ہوا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی یہ حالت کہ :

(۱) لاولد فوت شدہ مسلمانوں کی صدہا معاشیں داخل سرکار ہو گئیں اور ہوتی جاتی ہیں چنانچہ آج تک تخمیناً ۴۵ فیصدی خالصہ ہو چکی ہیں۔

(۲) اگر کسی وارث اناث پر جز ءبحال بھی ہوتا تو تاحیات کی قید لگ جاتی ہے۔

(۳) وہ تمام منصب جو ان کے خون بہانے اور جاں نثاری کرنے کے صلہ میں عطا ہوئے تھے ان میں سے ہر وراثت پر وضعات کا عمل نافذ ہے جس کے باعث صدہا منصب معدوم ہو کر اس وقت تک سینکڑوں خاندان معرض تباہی میں آ چکے ہیں۔

(۴) مسلمانوں کو جو معاشیں مقامی اور موقتی خدمات کے لئے مثل سمستان و دیسمکھ و دیسپانڈیہ وغیرہ عطا ہوئے تھے مثلاً مدافعانہ فوج و حفاظت قلعہ جات وغیرہ وہ

سب محض اس بناء پر کہ اب محل شرط باقی نہیں رہا ہے شریک خالصہ کر لئے گئے اور کر لئے جاتے ہیں۔ بحالیکہ اسی عنوان کی معاشیں محل شرط باقی نہ رہنے پر بھی ہندوؤں پر بحال و اجرا کئے جاتے ہیں۔

(۵) زراعت کرنا چاہیں تو عہدہ داران دیہی جو تمام تر ہندو ہیں وہاں بمشکل دخل پانے کا موقع دیتے ہیں۔

(۶) تجارت کے لئے روپے کی ضرورت ہے مگر یہ خود ہی ہندوؤں کے مقروض ہیں۔

اب ان کی معیشت و زندگی بسر کرنے کا اہم اور واحد ذریعہ صرف ملازمت رہ گیا ہے۔ جس میں کثیر کنبے بغیر کسی آسائش کے محض زندگی کے دن گذارتے ہیں اور پھر ملازمتوں کا دائرہ بھی محدود ہے۔ بریں ہم قدیم سے یہ عمل رہا ہے کہ اس میں بھی ہندوؤں کو معقول تعداد میں حکومت داخل کرتی رہتی ہے جس سے مسلمانوں کی حق تلفی ہو کر دن بدن وہ مفلس و خستہ حال ہوتے جا رہے ہیں۔''

(تاریخ اتحاد المسلمین دارالاشاعت سیاسیہ مجلس اتحاد المسلمین حیدر آباد صفحہ ۳۷ تا ۴۰)

اسی طرح سے آریہ سماج اور ہندو مہاسبھا کے جتھے حیدر آباد میں داخل ہوتے رہے۔ ان کا کام فرقہ وارانہ نعرے، ترانے، اشتعال انگیزی پیدا کرنا، فرقہ وارانہ فساد کروانا، مسلمانوں کا قتل کرنا پھر اپنی بے گناہی کا اظہار کرنا اور مسلمانوں کے مظالم کا تذکرہ کرنا تھا۔ آپسی مخاصمت کا کوئی واقعہ ہوتا تو فرقہ وارانہ رنگ دیتے۔ ڈسمبر ۱۹۳۷ء میں گنجوٹی مقام کے ایک شراب خانہ کے جھگڑے نے فرقہ واری جھڑپ کی شکل اختیار کی اور اس میں دسیا نامی ایک شخص کی موت واقع ہوئی۔ آریہ سماجیوں نے اس کا نام وید پرکاش دیا اور الزام لگایا کہ چوں کہ اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تھا اس لئے اسے قتل کیا گیا جب کہ تحقیقات کے بعد مرنے والے کا نام اور الزامات غلط ثابت ہوئے۔ ۱۶/ مارچ ۱۹۳۸ء کو گلبرگہ میں ایک واقعہ پیش آیا جس کی کوتوال نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ ایک تانگے پر جس میں (۳) مسلمان سوار تھے ہندوؤں نے جو رنگ ریلی منا رہے تھے مسلمانوں پر رنگ پھینکا جب ایک تانگے سے اُتر پڑا اور احتجاج کیا تو آریہ سماجی کارکنوں نے اسے گھیر لیا اور برچھے سے بھونک کر قتل کر دیا اور کہنے لگے کہ خاکسار بڑی تعداد میں جمع ہو کر ہندوؤں کو ڈرایا دھمکایا اور حملہ کیا نتیجتاً ایک مسلم

فوت ہوا۔ حیدرآباد میں ۱۹۳۸ء میں دھول پیٹ کا مشہور فساد ہے جس میں دو مسلمان ناحق شہید ہوئے۔ ان میں سے ایک نواز خان، بہادر یار جنگ کا عزیز تھا اور دوسرا نوجوان سید زادہ بندہ میاں تھا۔ دونوں بھی چنچل گوڑہ کے تھے۔ نظام آباد، پربھنی، اودگیر، چٹگوپہ میں مسلمان مارے گئے۔ کلیانی، گنجوٹی وغیرہ میں مسلمانوں پر حملے ہوئے۔ ان سارے فسادات کے پیچھے آریہ سماجی اور ہندو مہاسبھائی تھے۔ اس طرح سے ساری ریاست میں فساد کا ماحول بنادیا گیا تھا اور مسلمان پست ہمت ہورہے تھے۔ بروقت مجلس اتحادالمسلمین نے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ انھیں جھنجھوڑا کہ حکمران قوم ہونے کے ناطے خواب غفلت میں نہ رہیں۔ حالات حاضرہ سے مطابقت پیدا کریں اور یہ کہ ذاتی منفعت سے نکل کر تمہاری زندگی اللہ اور اس کی مخلوق کے لئے ہونی چاہئے۔ اجتماعی زندگی اور قومی حیات کا تصور جو نکل گیا ہے اس کا احیا کریں۔ اپنے نفس اور مال کے ساتھ جہاد نہ کریں تو خاتمہ میں کوئی شبہ نہیں۔ تمہاری صیانت کی کفیل جو ذات پاک ہے اس کی رسی کو تھامو۔ اس طرح سے مسلمانوں کے سیاسی شعور اُجاگر کیا گیا اور انھیں پست ہمتی سے نکالا گیا۔ یہ مجلس کا دوسرا اہم کارنامہ ہے۔ اب مجلس مسلمانوں کی دل کی دھڑکن بن گئی تھی۔

اس کے بعد ان ہندو جماعتوں نے متحدہ محاذ قائم کیا۔ حکومت حیدرآباد اور نظام کو بدنام کرنے کی غرض سے ہندوستان کے طول وعرض میں حیدرآباد کا سیاہ ترین تصویر پیش کی اور ہندوؤں پر مظالم کا جھوٹا پروپگنڈہ شروع کیا۔ جب یہ نیا محاذ کھولا گیا تو مجلس کے لئے بھی ضروری تھا اس کا سدباب کیا جائے۔

> ''چنانچہ اس تدبیر کے پیش رفت آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ میں بمعیت نواب بہادر یار جنگ بہادر و مولوی احمد عبداللہ مسدوسی شرکت کی گئی جہاں ہندوستان بھر کے مسلم زعماء اور نمائندگان موجود تھے اور حیدرآباد کے مسئلہ کو پیش کیا گیا۔ اس طرح حیدرآباد کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بیرونی مسلمانوں کے دلوں میں حیدرآباد کے لئے ایک ایسا درد پیدا کیا گیا کہ وہ حیدرآباد کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھنے لگے۔ چنانچہ آریہ سماج کی جانب سے جب ۲۲؍جنوری ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا حیدرآباد ڈے مقرر کیا گیا تو ہندوستان کے ہر گوشے سے مسلمان اداروں اور عوام نے اس کا جواب دیا۔ حیدرآباد کی ستیہ گرہ کے خلاف ہندوستان کا

کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا جہاں سے مسلمانوں نے آواز بلند نہیں کی۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے

کہ معاندین کے حوصلے پست ہو گئے۔''

(تاریخ اتحاد المسلمین دارالاشاعت سیاسیہ مجلس اتحاد المسلمین حیدر آباد صفحہ ۵۹)

ہندو پریس کی زہر افشانیوں کی وجہ سے برطانوی ہند بری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ مجلس نے سید فضل حسن وکیل ہائیکوٹ و رکن مجلس عاملہ مجلس کی صدارت میں ایک وفد برطانیہ ہند کے مختلف صوبہ جات کے لئے روانہ کیا۔ اس وفد نے دو ماہ تک مختلف مقامات کا دورہ کر کے ہندوؤں کے خلاف جو معاندانہ پروپگنڈہ کیا گیا تھا ذمہ دارانہ افراد اور اداروں سے ملاقات کر کے یہ واضح کیا کہ ہندوؤں پر مبینہ ظلم و ستم کی رودادوں میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ گوالیار، جودھپور اور جئے پور کی طرح مسلمانوں پر جو ظلم و زیادتی ہوئی ہے ویسی حیدر آباد میں ہندوؤں پر کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے۔ ہندوؤں کے سنجیدہ طبقہ نے آریہ سماجیوں کی اس دروغ گردانی کی مذمت کی اور سارے برطانیہ ہند کی ہمدردیاں حاصل ہوئیں اور ہندو سیول لبرٹی اور آرین ڈیفنس لیگ کے ستیہ گرہوں کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ ایک تیسری اہم کامیابی تھی۔

اسٹیٹ کانگریس کا قیام عمل آیا تو حکومت نے اسے غیر قانونی قرار دے کر پابندی لگا دی۔ لیکن آریہ سماج اور ہندو مہاسبھا کو کھلی چھوٹ دے دی۔ اسٹیٹ کانگریس پر پابندی لگانے کے بعد وہی کانگریسی آریہ سماجی اور ہندو مہاسبھائی ہندو سیول لبرٹی یونین اور آریہ سماجی آرین ڈیفنس لیگ کے نام سے ستیہ گرہ وغیرہ کے ذریعہ اپنی مہمات جاری رکھیں۔ لیکن افسوس کہ حکومت نے ان تحریکوں پر قابو پانے نہ کوئی مضبوط پالیسی اختیار کی اور نہ حکومت نے جھوٹے پروپگنڈہ سے پیدا شدہ تاثر کو ختم کرنے کے لئے کوئی اقدامات کئے تاہم حکومت کا کام مجلس نے کیا اور اس کے احتجاج اور کوششوں کے نتیجہ میں سارا ہندوستان مخالف حیدر آباد کے بجائے موافق حیدر آباد ہوا۔

''مجلس اتحاد المسلمین نے اس نازک وقت میں جہاں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی ان کو صحیح حالات سے باخبر رکھنے اور ان میں حقیقی سیاسی شعور پیدا کرنے کی خدمتیں انجام دیں وہاں اس فریضہ سے بھی بے خبر نہیں رہی جو ایک سچی وفادار جماعت ہونے کی بناء پر دولت آصفیہ کی طرف سے اس پر عائد ہوتی تھی۔ ایک طرف وہ اپنے

ذمہ دار ارکان کو برطانوی ہند میں جہاں سے بے کار اور جاہل نوجوانوں کو پانچ چھ آنے یومیہ اُجرت دے کر ستیہ گرہ کے لئے لایا جاتا تھا بھیج کر وہاں کے ناواقف لوگوں کو صحیح حالات سے روشناس کرایا۔ دوسری طرف اس نے حکومت کو بہترین دانشمندانہ مشورے اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے دیئے اور ملک میں دہشت انگیزی اور امن سوزی کی جو ناپاک کوشش کی جارہی تھی ان کے واقعی تدارک کی طرف متوجہ کیا۔

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ مجلس اتحادالمسلمین کو اپنی مخلصانہ مساعی میں بیرون ممالک محروسہ جس قدر کامیابی حاصل ہوئی اسی قدر اندرون ملک اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آریہ سماجی اپنی شرانگیزی میں برابر مشغول رہے۔ خود شہر حیدرآباد عافیت سوز اور امن شکن ہنگاموں کا شکار ہوتا رہا لیکن حکومت نے پنجہ آہنی کی قوت دکھانے کے بجائے ان کے سر پر مادر مہربان کی طرح شفقت کا ہاتھ پھیرا ان کے لئے جیل خانوں میں وہ راحتیں مہیا کی گئیں جوان بیچارے مزدوروں کو اپنی جھونپڑیوں میں کبھی میسر نہ آسکتی تھیں۔ عدالت کے فیصلہ کے باوجود ان سے مشقت نہ لی گئی۔ ان کے لئے اولٹین اور دودھ مہیا کیا گیا اس طرح قانون شکنی کے مجرمین کے دل بڑھائے گئے۔ حکومت نے امن قائم رکھنے کے فرض کو رواداری اور محبت کی فراوانی سے بھلا دیا حتیٰ کہ بار بار اپنی صفائی اخبارات میں پیش کر کے اپنے وقار کو بھی صدمہ پہنچایا۔ حکومت نے عملاً یہ ثابت کر دیا کہ اسے ہندوؤں کی خاطرداری مسلمانوں سے زیادہ منظور ہے۔ اس وقت مجلس اتحادالمسلمین کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ دکن میں مسلمانوں کے شش صد سالہ فاتحانہ اقتدار اور حاکمانہ وقار کو نزع میں دیکھ کر اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے حکومت پر نکتہ چینی کی اور عزم کر لیا کہ :

''وہ مسلمانان مملکت آصفیہ کے ان مفادات و امتیازات اور حقوق کو برقرار رکھے گی جو دکن میں ان کو نہ صرف سیاسی اقتدار کی بقاء بلکہ معاشی اور ثقافتی حیثیت کے تحفظ کے لئے توارثاً و تعاملاً حاصل رہے ہیں۔''

''اب مجلس کے کاندھوں پر دوگونہ ذمہ داریوں کا بار تھا۔ ایک تو وفادار اور انتہائی وفادار جماعت ہونے کی بناء پر حکومت کو آصفی تخت و تاج کے وفادار و اقتدار کی حفاظت کے

لئے مخلصانہ اور مفید مشورے دینا اور دوم ملت اسلامیہ دکن کے حقوق کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کو تیار کرنا تا کہ گذشتہ چھ سو سال سے جس طرح حکومت دکن کے دست راست بنے رہے ہیں آئندہ بھی حکومت کے ہر آڑے وقت میں کام آسکیں۔"

(تاریخ اتحاد المسلمین دارالاشاعت سیاسیہ مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد صفحہ ۶۱ تا ۶۳)

مجلس اتحاد المسلمین، حالات زمانہ کا مقابلہ کرتے ہوئے نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ حکومت کے لئے بھی بڑی خدمات انجام دے رہی تھی۔ مگر حکومت خاموش تماشائی تھی۔ کچھ کیا تو بس آریہ سماجیوں اور ہندو مہاسبھائیوں کو خوش کرنے کے لئے کیا تا کہ ہندو عوام کو مخالف یا ناراض نہ کیا جاسکے جو نظام کی بقاء کے لئے خطرہ بن سکتے تھے۔

مجلس اتحاد المسلمین کو اس تلخ حقیقت کے باوجود بڑا نازک اور اہم کام انجام دینا ضروری تھا جو مسلمان اور مسلم مملکت کے مفاد کے لئے تھا۔ مجلس اور نواب بہادر جنگ کی دوررس نگاہیں اس خطرے کو بھانپ چکی تھیں کہ ذمہ دارانہ حکومت کے مقابل مسلمانوں کا کھڑا رہنا مشکل ہے۔ کیوں کہ وہ آبادی کے تناسب میں (۱۵) فیصد ہونے کی وجہ سے بڑی اقلیت میں تھے اور (۸۵) فیصد والے اکثریتی طبقہ ہندو سے مقابلہ بے معنی تھا۔ اس نازک موقع پر بہادر یار جنگ ہی برصغیر کے وہ واحد مسلمان تھے جنھوں نے مسلمانوں کی عددی کمزور طاقت کے باوجود مسلم اقتدار کا نعرہ بلند کیا۔ انھوں نے بہ بانگ دھل اعلان کیا کہ مسلمان اس سرزمین پر سات سو سال سے غالب و حاکم رہے ہیں اور تاریخ کے ہر دور میں آزاد اور انگریزوں کے حلیف رہے ہیں۔ اسی لئے انھیں حکمرانی کا حق ہے۔ یہ بھی اعلان کیا کہ حضور نظام کا تخت و تاج مسلمانوں کا سیاسی و تمدنی اقتدار کا مظہر ہے۔ یہ اعلان بہادر یار جنگ کی جسارت ایمانی کا مظہر تھا اور اپنے اس دعوے پر عالمی شہرت یافتہ ماہر دستور قانون و سیاست داں جناح سے مہر توثیق ثبت کروائی۔ اپنے دعوی کے جواز میں جو دلائل اپنی تقاریر میں پیش کیے بڑے سے بڑے علمبردار بھی بے وزن نہیں پائے۔[1]

ہندوستان کی مسلم اقلیت مسلم اقتدار کی بجائے تحفظات کے لئے کوشاں تھی بہادر یار جنگ کی تقاریر نے ان کا رُخ ہی بدل ڈالا :

---

[1] تقاریر و نگارشات قائد ملت بہادر یار جنگ - بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی صفحہ ۱۵۳، ۱۵۴

''بہادر یار جنگ کا مسلمانان ہند سے پہلا سیاسی رابطہ مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ یہاں انھوں نے ایک مخصوص علحدہ جلسہ میں جو صوبہ سرحد کے اورنگ زیب خاں کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، حیدرآباد کے مجوزہ دستوری اصلاحات کے تعلق سے اس موقف پر جو انھوں نے اختیار کیا تھا، شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی، جس کا خلاصہ ان ہی کے الفاظ میں یہ تھا کہ ''میں مسلمانان حیدرآباد کے مفادات کے تحفظ اور مراعات کے حصول کے لئے کوشاں نہیں ہوں۔ مجلس اتحادالمسلمین کی تحریک مسلمانان حیدرآباد کے مفادات کے تحفظ کی تحریک ہے اور نہ ان کے لئے مراعات کے حصول کی جدوجہد۔ میری جنگ ''مسلم اقتدار'' کی جنگ ہے! مسلمان سات سو سال سے سرزمین دکن پر حکمران رہے ہیں۔ اب انھیں مغربی جمہوری تصورات کی آڑ لے کر محکوم نہیں بنایا جاسکتا۔ اکثریت کی کمین گاہ میں بیٹھ کر ''مسلم اقتدار'' کے اس قلعہ کو جس کا نام حیدرآباد ہے ڈھانے نہیں دیا جائے گا۔ قائدین مسلم لیگ کے لئے یہ ایک اچنبھے میں ڈالنے والی بات تھی کے حیدرآباد کی مسلم اقلیت کا یہ رہنما اپنی اقلیت کے لئے حقوق کا تحفظ چاہ رہا ہے اور نہ مراعات کا طالب ہے بلکہ وہ ادعا حکمرانی کررہا ہے اب تک جو سیاسی تحریکات مسلمانان ہند کے قائدین نے چلائی تھیں، ان کا مقصد ومنشاء صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کا جداگانہ تشخص برقرار رہے اور دستوری ترقی کی ہر منزل پر ان کے حقوق کا تحفظ ہوتا رہے۔ گویا مسلمانان ہند کی ہر سیاسی تحریک ''تحفظ حقوق'' کی تحریک تھی، ''دعویٰ اقتدار'' کی تحریک نہ تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ وہ مرعوبیت تھی، جو برطانوی تصور جمہوریت کے تحت ان کے ذہن ودماغ پر ''ایک عددی اقلیت'' ہونے کے باعث چھاگئی تھی یا انگریز ہندو گٹھ جوڑ نے اپنے دانشورانہ پروپگنڈے کے زور پر ان کے دلوں میں بٹھادی تھی۔ ''عددی اقلیت'' تو بس تحفظات کا مطالبہ کرسکتی ہے وہ اقتدار کی بات کیسے کرسکتی ہے۔ یہ نقش مسلمانان ہند کے دل ودماغ پر ثبت ہوچکا تھا۔ اسی لئے ان کے قائدین بھی ''مسلم اقتدار'' کی بات کرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کرتے تھے۔ بہادر یار جنگ کے نعرۂ مستانہ ''ہم دکن کے بادشاہ ہیں'' نے ان کو چونکادیا۔ یہ ایک اور واقعہ ہے کہ اجلاس پٹنہ کے بعد مسلمانان ہند کی سیاست کا رُخ بدل گیا اور اجلاس لاہور ۱۹۴۰ء

میں انھوں نے ''حصول تحفظات'' کے بجائے ''حصول اقتدار'' کو اپنا نصب العین قرار دے دیا۔ مسلم عوام اور ان کے قائدین کے مطمح نظر کی اس تبدیلی میں جہاں اور عوامل کارفرما تھے، وہاں بہادر جنگ کی جرأت ایمانی کو بھی دخل تھا کہ انھوں نے اُمت مسلمہ ہند کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی تصویر کی نقاب کشائی کی، جس کی درخشانی و تابانی کے سامنے پرانے تصورات تحفظات و مراعات ماند پڑ گئے اور ایک نیا تصور ''حکمرانی و فرمانروائی'' جگمگا اُٹھا! یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب کہ ایک مرد مومن نے ان کی آنکھوں پر سے عددی اقلیت کی مرعوبیت کا پردہ اُٹھایا اور ان کے ذہن و دماغ پر سے ہچکچاہٹ کا وہ نقش مٹایا جو انھیں دعویٰ اقتدار و حکمرانی سے اب تک باز رکھے ہوئے تھا۔''

(تقاریر و نگارشات بہادر یار جنگ شائع کردہ بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی صفحہ ۱۵۵، ۱۵۶)

اسی لئے مجلس کے دستور میں اغراض و مقاصد میں جو سیاسی مسلک کا اضافہ ہوا وہ یہ تھا کہ مسلمانان مملکت آصفیہ کی یہ حیثیت ہمیشہ برقرار رہے کہ فرمانروائے ملک کی ذات اور تخت ان ہی کے جماعت کے سیاسی اور تمدنی اقتدار کا مظہر ہے۔ اس بناء پر مملکت کی ہر دستوری ترمیم میں فرمانروا کے اقتدار شاہانہ کی بقاء و احترام مقدم ہے۔

۱۹۳۵ء کے وفاقی قانون کے بعد ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ دیسی ریاستوں میں جڑ پکڑ رہا تھا۔ ہندوؤں کے بعض گوشوں سے خاص طور پر برہمن لابی کی طرف سے دستوری اصلاحات کا مطالبہ اس مقصد کے تحت شروع کیا گیا تھا کہ دستور میں تبدیلی سے اقتدار مٹھی بھر اعلیٰ ذات کے ہندو، برہمن، بنیا وغیرہ کے ہاتھ آئے گا۔ حیدرآباد میں فرقہ وارانہ منافرت جو آریہ سماج، ہندو مہاسبھا اور کانگریس کی جانب سے پھیلائی گئی تھی اس سے مجلس پریشان تھی کہ دونوں فرقوں کا صدیوں سے قائم تانہ بانہ ٹوٹ جائے تو زیادہ فائدہ تو اکثریت کی بناء پر آئندہ ہندوؤں کو ہوگا اس لئے وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ دونوں فرقوں میں اختلاف کی خلیج بڑھے۔ اسی لئے مجلس اتحاد و اتفاق کو قائم رکھنے کے لئے کوشاں تھی۔ چنانچہ میر اکبر علی خان بیرسٹر نے جو مجلسی نہ تھے اتحاد و اتفاق کو قائم رکھنے کی غرض سے جد و جہد شروع کی اور ایک متحدہ پلیٹ فارم کا کام شروع ہوا۔ میر اکبر علی خان نے نواب بہادر یار جنگ سے گفتگو کی۔ ان کی ایماء پر بہادر یار جنگ میر اکبر علی خان، کاشی ناتھ راؤ ویدیہ اور

ہنمنت راؤ کے درمیان کوئی چودہ نشستیں ہوئیں اور مفاہمت بڑی حد تک طے پا چکی تھی اور یہ مفاہمتی فیصلہ حکومت کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا کہ ۱۷ر آبان ۱۳۴۶ف (۲۲ر ستمبر ۱۹۳۷ء) کو سر اکبر حیدری صدر اعظم باب حکومت نے دستوری اصلاحات کے لئے ایک کمیٹی کے تقرر کا اعلان فرمایا۔ اس بے وقت اعلان نے مفاہمتی کوشش پر پانی پھیر دیا۔ یہ بات بعید از عقل تھی کہ آخر اس اہم کوشش کو نظام کی حکومت نے کیوں سبوتاج کیا۔ اگر مجلس اور چند اہم قائدین کے سر کامیابی کا سہرا جاتا تھا تو حضور نظام کا کونسا مقام متاثر ہو رہا تھا۔ آخر یہ بنی بنائی تدبیر نظام کو ہی منظوری کے لئے پیش کی جانے والی تھی جو آخر کار حضور نظام کی منظوری کی مرہون منت ہی تو تھی۔ نظام، سر اکبر حیدری اور حکومت کی ناعاقبت اندیشی کا واویلا جتنا بھی کیا جائے کم ہے۔ اب ہندوؤں میں مفاہمت سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی بلکہ فرقہ وارانہ جذبات کے ماحول کو ہوا لگی۔

پھر چند مسلمانوں نے مفاہمت کی کوشش کی۔ نواب بہادر یار جنگ مسلمانوں کی طرف سے اور ہندوؤں کی طرف سے کون نمائندگی کرے خود ہندوؤں میں اختلاف رہا۔ بالآخر نرسنگ راؤ کا انتخاب کیا گیا۔

> ''ابتدائی دور میں یہ گفتگو بڑی اچھی طرح جاری رہی اور قضیہ سلجھتا نظر آنے لگا لیکن نوعیت حکومت کے مسئلہ پر دونوں حضرات کے مابین اختلاف پیدا ہو گیا اور دونوں اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر پر شدت کے ساتھ مصر رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ گفتگو بھی ناکام رہی۔
>
> شائع شدہ مراسلت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر نرسنگ راؤ کو اس پر اصرار تھا کہ ''ذمہ دارانہ حکومت'' کو کم از کم بعید نصب العین کی حیثیت سے راضی نامہ میں تسلیم کر لیا جائے اور نواب بہادر یار جنگ بہادر اس امر پر مصر تھے کہ گفتگو کی پہلی منزل میں جب یہ طے شدہ ہے کہ موجودہ طریقہ حکومت کی تبدیلی کا نہ کوئی مطالبہ کیا جائے گا اور نہ مستقبل کے لئے کوئی شرط یا پابندی عائد کی جائے گی تو ایسی صورت میں مسلمانوں سے ایسے کسی نصب العین کے قبول کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔''
>
> (تاریخ اتحاد المسلمین جاری کردہ دارالاشاعت سیاسیہ صفحہ ۶۵، ۶۶)

> ''مفاہمت کی دوسری کوشش مسٹر نرسنگ راؤ ایڈیٹر اخبار رعیت نے کی اور وہ جس

وجہ سے ناکام رہی اس کا آپ سب کو علم ہے کیوں کہ میری اوران کی مراسلت اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔اول تو ان کی جماعت ان کو خطِ اعتماد دینے کے لئے تیار ہی نہ تھی۔جب ان کو خطِ اعتماد ملا تو گفتگو شروع ہوئی۔تعلیم اور محکمہ اُمور مذہبی سے متعلق مسائل کو متفقہ رائے سے طے کیا گیا۔طریق حکومت کے مسئلے پر میرا اوران کا اختلاف شدید ہو گیا۔وہ ذمہ دارانہ حکومت چاہتے تھے اور میں اس کو قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔مجھے یقین ہے کہ میں نے ان کو اپنے دلائل سے مطمئن کرلیا تھا اور وہ اس پر راضی بھی ہو چکے تھے کہ اس مطالبے پر اصرار نہ کریں گے اور ہم کسی اور طریقے پر غور کر رہے تھے کہ مسٹر نرسنگ راؤ نے مجھے واردھا چلنے کی دعوت دی۔میرے انکار پر وہ خود گئے اور وہاں سے لوٹے تو ذمہ دارانہ حکومت کے مطالبے پر شدید اصرار کے ساتھ لوٹے اوران کا یہی اصرار انقطاع گفتگو کا باعث ہوا۔"

(تقاریر ونگارشات بہادر یار جنگ - بہادر یار جنگ اکاڈیمی کراچی صفحہ ۲۰۱)

یاد رہے کہ میر اکبر علی خان ایک نیشلسٹ مسلمان تھے اور بہادر یار جنگ اس وقت کے سیکولر رہنما کہلانے کے مستحق تھے۔ ہندو بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے،ان کی بات کا اثر ان پر بہت تھا اور ٹالتے نہ تھے۔مسلمانوں کے مانے ہوئے اور دل و جاں سے چاہے جانے والے رہنما تھے۔ دستوری اصلاحات کا کوئی مطالبہ کسی گوشہ سے نہ تھا۔انگیزوں کا دباؤ تھا کہ حیدرآباد وفاق میں شریک ہو اور کانگریس چاہتی تھی کہ وفاق میں روسائے سلطنت کے نامزد کردہ نمائندوں کی بجائے عوامی منتخبہ نمائندے ہوں۔ غالباً کانگریسوں سے مرعوب ہو کر اور انگیزوں کو خوش کرنے کے لئے یہ ناعاقبت اندیش اقدام کیا گیا جو نظام اور سر اکبر حیدری کی بڑی فاش سیاسی غلطی تھی۔جس کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا اور خود نظام کا ہوا۔مجلس اتحادالمسلمین کا یہ ادعا تھا کہ ایسے اقدامات اس وقت تک ضروری نہیں جب تک ہندوستان کا سیاسی نقشہ واضح نہ ہو جائے۔ یہ بڑی معقول بات تھی۔

عہد عثمانی کا حیدرآباد بجا طور پر ترقیات اور اصلاحات کے لئے امتیازی خصوصیت کا حامل تھا وزارت کے قدیم طریقوں کو تبدیل کر کے مجلس وزراء (جس کو باب حکومت یا Cabinet کہتے ہیں) قائم کر کے وزراء اور صدر اعظم کے اختیارات وضع کئے گئے تھے۔سب سے اہم کام عاملہ سے عدلیہ کو علحدہ کیا گیا۔مجلس وضع قانون کو وسعت دے کر قانون دانوں اور مختلف نمائندوں کو شامل کیا گیا۔یہ

مجلس وضع قانون صحیح معنوں میں مقنّنہ (Legislature) تھی۔ اس لحاظ سے مقنّنہ، عاملہ اور عدلیہ سلطنت کے (۳) اہم شعبے قائم کیے گئے۔ مقنّنہ جو محدود نمائندوں پر مشتمل تھی (قانون پیشہ سے دو ارکان، جاگیردار طبقے کے دو، اور صرفخاص مبارک سے ایک اور عام رعایا کے دو نمائندوں کے علاوہ ذمہ عہدہ داروں پر مشتمل تھی) چوں کہ ترقیات مختلف شعبہ ہائے حیات میں ہو رہی تھیں اس لئے نظام نے مناسب سمجھا کہ سمجھدار عوامی نمائندوں کو جو حکومت کی ترقیات میں مفید مشورے دے سکتے ہیں، شامل کیا جائے۔ اسی لئے مقنّنہ کی اصلاح کی جانب توجہ ہوئی اور ۱۹۲۰ء میں اس مقصد کے تحت فرمان جاری ہوا۔ نظام کا مطمح نظر یا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ قانون ساز مشیروں کی تعداد میں کچھ اور اصحاب فکر کا اضافہ کیا جائے۔ رائے بالمکند (وظیفہ یاب جج ہائی کورٹ) کو حکم ہوا کہ اس مقصد کے تحت ایک رپورٹ توسیع مجلس وضع قانون مرتب کی جائے۔ یہ زمانہ سر علی امام کا تھا۔ اگر یہ اس وقت ہوتے تو یہ کام بعجلت ممکنہ اور نظام کے مقصد کے مطابق تکمیل پا جاتا۔ ان کے جانے کے بعد جو صدر اعظم اور وزراء آئے اس کام کو لیت و لعل میں اس لئے ڈال دیا کہ مجلس وضع قانون میں توسیع کی وجہ سے جمہوریت کی بنیاد پڑے گی جو رفتہ رفتہ اقتدار اہی پر اثر انداز ہوگی۔ اس لئے اس مسئلہ کو ٹالا جانے لگا۔ ۱۹۳۵ء کے وفاقی قانون کے نفاذ کے بعد ۱۹۳۷ء میں برطانوی ہند میں جب ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے لئے اقدامات کئے گئے اور اس طرح کی حکومتیں قائم ہوئیں تو کانگریس نے ہندو مہا سبھا اور آریہ سماج سے ہاتھ ملا کر حیدرآباد میں فرقہ وارانہ فساد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اُدھر انگریز قیام وفاق کے لئے پردیسی ریاستوں پر دباؤ ڈالنے لگے۔ سر اکبر حیدری نے غالباً ان اثرات کے تحت بلا سوچے سمجھے عوامی نمائندوں خاص طور پر مجلس اتحاد المسلمین کے مشورے کے بغیر یکا یک دستوری اصلاحات کا اعلان کر کے ناعاقبتانہ اقدام کیا۔ اس قسم کی اصلاحات کا عوام کے کسی گوشے سے نہ تو مطالبہ تھا اور نہ نظام کا ایسا مطمح نظر تھا۔ اس لئے مجلس اتحاد المسلمین نے اسے قبول نہیں کیا اور وہ احتجاج کرتی رہی۔ حکومت پر واضح کیا گیا کہ مسلمانوں کے ذمہ دار اور حقیقی نمائندوں سے تبادلہ خیال ہو اور انھیں اس پر مطمئن کیا جائے کہ مسلم مفاد کی پوری حفاظت ہوتی ہے۔ اس وقت فضاء ان اصلاحات کے لئے موافق نہیں تھی۔ اصلاحات کی نوعیت کچھ بھی ہو کوئی بھی طبقہ مطمئن نہیں تھا اور بے چین تھا۔ اگر نظم و نسق میں خرابیاں ہوں تو ان کی اصلاح کی جائے۔ اس لئے اصلاحات

غیر ضروری ہیں اور انھیں روک دیا جائے۔ مجلس نے ۱۹؍اردی بہشت ۱۳۴۸ف کو ایک وفد جو اراکین عاملہ پر مشتمل تھا صدر اعظم کی خدمت میں بھیجا۔ اس نے ایک یادداشت بھی اصلاحات کے خلاف میں پیش کی اور مطالبہ کیا کہ حیدر آباد کا سیاسی اقتدار متفرر نہ ہو۔ موجودہ دستور میں کوئی تبدیلی ناگزیر ہو تو مسلمان کوئی ایسی سیاسی تبدیلی قبول نہیں کرے گا جس میں مسلمانوں کی سیاسی برتری جو سالہا سال سے چلی آرہی ہے متاثر ہو جاتی ہو۔ باوجود اس نمائندگی اور احتجاج کے کمیٹی کام کرتی رہی۔

آئین گار کمیٹی نے ۲۵؍مہر سہ ۱۳۴۷ف م ۳۱؍اگسٹ ۱۹۳۸ء کو اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کی۔ مجلس وزراء (باب حکومت نے) معمولی رد و بدل کے ساتھ منظوری کی سفارش کی۔ نظام نے رپورٹ منظور کردی۔ رپورٹ بتاریخ ۱۷؍جولائی ۱۹۳۹ء کو عوام کے لئے شائع کردی گئی۔ رپورٹ کی اہم سفارشات یہ تھیں

(۱) ایک قانون ساز مجلس تشکیل دی جائے جو (۸۵) ارکان پر مشتمل ہو جس میں سے (۴۲) ارکان منتخب شدہ ہوں اور باقی (۴۳) نامزد کردہ۔

(۲) عوامی نمائندوں کا انتخاب علاقہ واری بنیاد پر نہیں بلکہ پیشہ وارانہ اور مفادات کی بنیاد پر ہوگا

(۳) طریقہ انتخاب جداگانہ نہیں بلکہ مخلوط ہو یعنی ہندو مسلم اور دیگر اقلیتیں مل کر انتخاب کریں۔

منتخب ہونے والے (۴۲) ارکان کو (۱۳) مختلف زمروں میں پیشہ اور مفاد کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا تھا جیسے والیان سمستان، جاگیرداران، معاش داران، زراعت پیشہ، مزدور پیشہ، صنعت و حرفت، تجارت، بنک کاری، پیشہ وکالت، پیشہ طبابت، طلباء، مجالس اضلاع اور بلدیہ حیدر آباد۔ نامزد ہونے والے اراکین میں (۱۴) ارکان سرکاری، (۱۴) غیر سرکاری، (۷) ارکان باب حکومت، (۳) ارکان صرفخاص مبارک اور (۵) اراکین علاقہ جات سے تھے۔ ان کی تفصیل ضمیمہ نمبر (۱) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

یہ اسکیم اصلاحات اگر روبہ عمل آتی تو ہندو اکثریت والی قانون ساز مجلس ہوتی اور اقتدار ہندوؤں کو منتقل ہوتا۔ جس کے صدر یا بادشاہ نظام ہوتے۔ ذمہ دارانہ حکومت کا وہ خواب جو کانگریس دیسی ریاستوں میں دیکھنا چاہتی تھی تکمیل پاجاتا۔ یہ بالکل مسلم مملکت اور مسلم مفاد کے خلاف تھا۔ مسلمانوں کو اور مجلس اتحاد المسلمین کو کیسے منظور ہوتا۔ نتیجتاً بڑی بے چینی پیدا ہوئی اور شدید احتجاج ہوئے۔ ہزاروں لوگوں کا اجتماع ''بیت الامت'' (بہادر یار جنگ کا مکان جس میں وہ رہا کرتے

تھے) پر کئی روز تک ہوتا رہا۔ جلوس نکلے اور مظاہرے ہوتے رہے۔ حالات نے شدید احتجاج کا رخ اختیار کیا اور حکومت گھبرا گئی۔ حکومت کے مختلف گوشوں کی جانب سے بہادر یار جنگ سے استدعا کی جاتی رہی کہ حالات کو قابو میں رکھا جائے۔ یہ بہادر یار جنگ ہی تھے جو مسلمانوں کے جذبات پر قابو پا سکے اور انھیں کی یقین دہانی پر مسلمانوں نے نظم وضبط کا مظاہرہ کیا اور مجلس کے فیصلے کے منتظر رہے۔ مجلس نے اصلاحات کو قبول نہ کرنے کا فیصلہ کیا تو مسلمانوں کو سکون ہوا۔ اس کے بعد مجلس نے ایسی ترمیمات پیش کیں جن سے مسلمانوں کے حقوق اور امتیازات کا تحفظ ہو سکے۔ یہ دھمکی دی گئی کہ اگر مطالبات قبول نہ ہوں تو راست اقدام کیا جائے گا۔ راست اقدامات کی ساری تیاریاں کرلی گئیں۔ مسلمان ریاست میں ریڑھ کی ہڈی کا مقام رکھتے تھے۔ بڑے خوف و دہشت کا ماحول پیدا ہوا۔ حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور پریشان ہو کر قائد اعظم محمد علی جناح کو مدعو کیا تا کہ معاملہ فہمی ہو جائے۔ قائد اعظم ستمبر ۱۹۳۹ء میں تشریف لائے اور چند دنوں تک سرکاری مہمان رہے۔ بہادر یار جنگ، مجلس اور حکومت کے ارباب حل وعقد سے تفصیلی بات چیت کرنے کے بعد حضور نظام کو مشورہ دیا کہ مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی برتری رہے اور مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت ہو۔ صرف خاص کے نامزد ہونے والے نمائندے لازماً مسلمان ہوں۔ انتخابات مشترکہ نہیں بلکہ جداگانہ ہوں۔ یعنی مسلمان اپنے نمائندے اور ہندو اپنے نمائندے منتخب کریں۔ نظام نے مشورہ قبول کرتے ہوئے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کا تحریری تیقن دیا۔ دوسری طرف قائد اعظم نے بہادر یار جنگ کو مشورہ دیا کہ پرامن طور پر حکومت حیدرآباد پر دباؤ ڈالیں کہ برصغیر ہند کے سیاسی نقشہ واضح ہونے تک اصلاحات ملتوی رکھے جائیں۔ اس دوران دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا۔ حکومت نے اس پوری اسکیم کو موقع پا کر معرضِ التواء میں ڈال دیا۔

یہ مجلس اتحاد المسلمین کی بڑی سیاسی کامیابی تھی جس کی وجہ سے مجلس کا سیاسی اثر ریاست میں قائم ہو گیا اور مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بن گئی۔ بہادر یار جنگ کی قیادت بہت بلند ہوئی اور ان کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا۔

مجلس اور بہادر یار جنگ کی فراست و قیادت اس حقیقت کو خوب پہچان گئی تھی کہ ذمہ دارانہ حکومت یا جمہوریت کی لڑائی اس وقت حیدرآباد کا مسلمان نہیں لڑ سکتا چوں کہ یہ شدید اقلیت میں تھا

اس لئے اس کا مفاد اسی میں تھا کہ حیدرآباد کا آزادانہ مقام جو تاریخ کے ہر دور میں رہا ہے واپس لیا جائے اور سلطنت کا سربراہ آصفیہ خاندان سے ہو۔ یہ مطالبہ ایک اُصول اور حق کی بنیاد پر تھا کہ سلطنت حیدرآباد انگریزوں کی حلیف تھی نہ کہ باجگزار اور ماتحت۔ اس لئے جب انگریز اقتدار عوام کو منتقل کر کے واپس جانا چاہتے تھے تو از روئے معاہدہ حیدرآباد کو اپنے اصلی مقام پر واپس ہونا تھا۔ یہ دلیل بڑی قوی تھی۔ مجلس اتحاد المسلمین کبھی بھی نظام کو ہٹانا نہیں چاہتی تھی بلکہ ان کے قائم رہنے میں مسلمانوں کا مفاد مضمر تھا۔ اس لئے آصفیہ خاندان کے فرد کو بادشاہ کی حیثیت سے متمکن رکھنے کا مطالبہ تھا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ نظام شکی المزاج تھے وہ دورخی پالیسی پر قائم تھے اپنا علحدہ راستہ بنالیا تھا۔ فراست تو اس میں تھی کہ ایک مستقل اور مضبوط پالیسی اختیار کی جاتی۔ غالباً یہ سمجھ کر کہ جمہوریت قائم ہو تو نظام کا باقی رہنا مشکل ہے اس لئے پیشگی اقدام کرتے ہوتے اصلاحات کمیٹی کی آڑ میں اقتدار ایسی ذمہ دارانہ حکومت کے حوالے کرنا چاہتے تھے جس کے سربراہ خود برقرار رہیں۔ ایسے ہی جیسے کہ برطانیہ میں بادشاہ سربراہ ہوتا ہے یعنی نظام ان کا اقتدار اور ان کا رتبہ باقی رہے چاہے مسلمان اقلیت میں آ کر سینکڑوں سال کے اقتدار سے محروم کیوں نہ ہو جائیں۔ مجلس اور نظام میں یہی بڑا گہرا ٹکراؤ تھا۔ مجلس مسلمانوں کی سیاسی برتری کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس ٹکراؤ کا لازماً نتیجہ دو کی لڑائی میں تیسرے کے فائدے کے مصداق والی بات تھی۔

مجلس اتحاد المسلمین ایک طاقتور تنظیم بن چکی تھی مسلم اقتدار اور سیاسی برتری کے لئے جو راستہ اس نے اختیار کیا تھا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ اس میں مسلمان اور نظام دونوں کا مفاد تھا اور دونوں مشترک تھے۔ اس مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے لازم تھا کہ نظام مجلس سے تعاون کرتے اور مل جل کر کام کرتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بہادر یار جنگ کو اس کا شدید احساس تھا کہ کوئی بھی سیاسی جماعت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ نظام اپنے مفاد اور مطلب کے لئے دوغلی پالیسی اختیار کرتے رہے۔ یہ مجلس کے لئے بڑا دھکہ اور صدمہ تھا۔ مجلس، مسلمانوں کی زندگی اور موت کی لڑائی میں ایک ایسے سرکش گھوڑے پر سوار تھی جو اس کے کنٹرول میں نہ تھا اور کسی وقت بھی زیر کر سکتا تھا۔ نظام کے تعاون اور دونوں کے مشترکہ عمل سے ہی یہ اہم لڑائی لڑی جاسکتی تھی۔ مگر افسوس کہ ایسا ہو نہیں پایا۔ حیدرآباد کے زوال کے اسباب میں یہ بھی ایک اہم سبب تھا۔

نقصان عظیم

مجلس اتحادالمسلمین ایک مضبوط، بااثر اور مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت کی حیثیت سے ۱۹۴۰ء میں سرگرم ہوگئی اور اس نے اقتدار کے موجودہ تین مراکز (نظام، دربار اور ریزیڈنسی) میں ایک اور مرکز کی حیثیت اختیار کرلیا۔ مجلس کا مقصد واضح تھا کہ مسلم اقتدار اور نظام کو اس کے سربراہ مملکت کی حیثیت سے باقی رکھا جائے۔ مجلس جس نے اصلاحات کو نامنظور کیا تھا وہیں اس نے نظم و نسق کی وہ فرسودگی کی طرف حکومت کو توجہ دلاتے ہوئے اصلاحات نظم ونسق کا مطالبہ کیا تھا۔ مجلس وزراء ایک عرصہ سے چند خاندانوں کی اجارہ داری بنی ہوئی تھی جو مسلمانوں کے نام سے اپنے ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لئے قانون اور نظم ونسق پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ اسی لئے مجلس نے یہ محسوس کیا کہ مملکت کی عاملہ کی مشنری میں جسے باب حکومت کہا جاتا تھا تبدیلیاں اور اصلاحات لائی جائیں تاکہ عوامی بھلائی اور مفاد کے کام جو غیر کارکرد افراد کی وجہ سے متاثر تھے انھیں درست کیا جائے۔ موجودہ مجلس وزراء میں ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جس سے اہل ملک کو اطمینان ہو۔ یہ عام دستور ہے کہ آئے دن نظم ونسق کے چلانے میں اصلاح ہوتی رہے۔ اکثر وزراء اور ارکان باب حکومت طویل عرصہ سے کارگذار تھے۔ ان کی وجہ سے کاروبار میں تعطل ہو رہا تھا اس لئے جن معزز ارکان کی مدت قریب الختم ہو انھیں توسیع نہ دی جائے اور ان کی جگہ کارکرد افراد سے پر کی جائے۔ وزراء کی مدت زیادہ سے زیادہ پانچ سال کردی جائے تاکہ کارکرد اور ترقی پذیر تخیلات اور تصورات کے حامل اشخاص کی خدمات سے استفادہ کیا جائے۔ ان وجوہات کی بناء پر مجلس نے نظام سے درخواست کی کہ نظم ونسق کی خرابیوں کو حالات کے مدنظر درست کرنا ضروری ہے اس تحریک کی ہندوؤں نے بھی تائید کی اور سب نے محسوس کیا کہ ضروری اصلاح میں تاخیر نہ ہو۔

دوسری عالمی جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ کانگریس نے بھی انگریزوں پر ایسے موقع پر بڑا

دباؤ بنائے رکھا کہ آخر جنگ کا مقصد کیا ہے اور جنگ کے بعد ہندوستان کی آزادی دی جائے ورنہ ہندوستان کا جنگ میں حصہ لینا بے کار و بے مقصد ہوگا۔ انگریزوں نے دوران جنگ آزادی دینے کے وعدہ کیا۔ جنگ کے دوران نظام نے بھی انگریزوں کی دل کھول کر مالی اور فوجی مدد کی تھی وہ متوقع تھے کہ انگریز اس کا صلہ دیں گے۔ ۱۹۱۹ء کی جنگ عظیم میں نظام کے گرانقدر احسانات اور امداد کا صلہ انگریزوں نے سوائے یار وفادار اور ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے خطابات کے کچھ نہ دیا تھا۔ نظام کو انگریزوں پر کامل بھروسہ تھا کہ وہ ان کی ان خدمات کے صلے میں وفاداری سے کام لے کر اقتدار کی منتقلی کے وقت ان کا ساتھ دیں گے اور ان کے حاصل کردہ علاقہ جات واپس کرتے ہوئے ان کا سابقہ آزادانہ موقف بحال کردیں گے۔ یہ صرف ان کی خوش فہمی تھی۔

مجلس جس کو مسلم مملکت کی بحالی کی فکر تھی وہ ان خوش فہمیوں میں مبتلا ہونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس حقیقت کو جان گئی تھی کہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ حیدرآباد کو آزادانہ حیثیت نہ دی جائے تو بہ زور طاقت آزادی حاصل کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ اگر آزادی دی جائے تو اُسے قائم رکھنے کے لئے دفاع کی ضرورت بھی ہوگی۔ اسی لئے دفاع کو مستحکم کرنے حکومت سے مطالبہ کرتے ہوئے ایک اہم یادداشت مورخہ ۲۶ر جمادی الثانی ۱۳۵۹ء (۱۹۴۰ء) صدر اعظم باب حکومت کو دی تھی کہ :

(۱) ''جنگ نے مسلمانان حیدرآباد کو مملکت آصفیہ اسلامیہ کے حال اور مستقبل سے متعلق نہایت اہم مسائل سے دوچار کردیا ہے۔ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مجلس عاملہ اتحادالمسلمین کی خواہش ہے کہ حکومت آصفیہ کو ان مسائل کی نسبت مجلس کے نقاط نظر سے مطلع کردیا جائے تاکہ حکومت ان پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائے۔

(۲) حکومت مسلمانان حیدرآباد کے اس مستحکم ایقان سے ناواقف نہیں کہ ہٹلریت کے خلاف برطانیہ کی مہیب کشمکش نہ صرف اس کی اپنی حریت کی بقاء کی خاطر بلکہ اس کے ہر اتحادی اور حلیف کے تحفظ کے لئے جاری ہے مسلمان اس حقیقت کو معلوم کر کے مطمئن اور مسرور ہیں کہ حیدرآباد کے فوجی اور دیگر وسائل

اپنے حلیف کی اعانت کے لئے وقف کردیئے گئے ہیں لیکن قلق اس امر کا ہے کہ یہ اعانت مملکت کے وقار کے اعتبار سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔

(۴) یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حیدرآباد کی حربی طاقت اور حق اسلحہ سازی پر خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں، بروئے معاہدات کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ عہد ماضی کی حکمت عملی میں سہل انگاری کے باعث حیدرآباد کو اپنی مدافعت کے لئے بیش از بیش برطانوی حلیف کا دست نگر ہونا پڑا اور نیتجتاً آج بڑی ندامت کے ساتھ ہم مشاہدہ کرر ہے ہیں کہ حیدرآباد کے نام سے ایک حقیر فوج محاذ جنگ پر جاتی ہے جس کے لئے تعجب ہے کہ آلات حرب تمام وکمال ممالک غیر سے فراہم کیے جاتے ہیں اس لئے مجلس کی رائے میں باعتبار اقتضائے وقت اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ جہاں تک فوجی اُمور کا تعلق ہے حکومت کے موجودہ طریقہ عمل کا جائزہ لیا جائے اور ملک میں حکومت کی جانب سے بلا تاخیر بہ تعداد کثیر کارخانوں کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ جدید حربی ضروریات کے مطابق مملکتی افواج کے لئے آلات حرب مہیا ہوسکیں۔ ایک واضح حقیقت ہے کہ تاوقتیکہ اس کا انتظام نہ ہو اہل ملک بکمال شوق جنگ میں حصہ لینے کے لئے زیادہ سے زیادہ قوت نہیں صرف کرسکتے اس لئے مجلس اپنی رائے میں مناسب تصور کرتی ہے کہ وہ ساری مالی اعانت جو جنگ کے سلسلے میں حکومت یا اہل ملک کی جانب سے حاصل ہو فوجی طاقت کی توسیع اور مجوزہ حربی کارخانوں کے قیام کے لئے استعمال کی جائے۔"

(تاریخ اتحاد المسلمین دارالاشاعت سیاسیہ صفحہ ۲۲۲ تا ۲۲۴)

جنگ کے موقع سے فائدہ اُٹھا کر حربی طاقت میں اضافہ کرنے کا یہ اچھا مشورہ مجلس نے حکومت کو دیا تھا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت نے سہل انگاری سے کام لیا اور موقع سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ بدر شکیب نے لکھا:

"بہادر یار جنگ نے حکومت حیدرآباد کی تائید کرتے ہوئے امداد جنگ کے بہانے مسلمانوں کو عسکری حیثیت سے منظم کرنے کی پوری کوشش کی۔ ان کی اس زمانہ کی

تقاریران کے ان جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ علاوہ ازیں دوران جنگ جب برطانوی حکومت نے ہندوستان کو قلمروی مرتبہ دینے کا اعلان کیا تو بہادر یار جنگ کے سمند ناز کو ایک اور تازیانہ لگا۔ انھوں نے پیراموئنٹسی کے تار و پود بکھیرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ علاقہ جات مفرضہ کی واپسی کے مطالبہ میں شدت پیدا کی گئی۔'' ایک تقریر کا اقتباس ملاحظہ ہو :

''گذشتہ جنگ کے مقاصد اور آج کی لڑائی کے مقاصد میں بہت بڑا فرق ہے۔ آج کی لڑائی حق و صداقت کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ برطانیہ کے ارباب حل و عقد نے ایک سے زائد مرتبہ اعلان کیا ہے کہ وہ معاہدات کا احترام کرانے کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ان واضح اور صاف مقاصد جنگ کی موجودگی میں ہماری یہ امداد سابقہ امداد کی طرح رائیگاں نہیں جاسکتی۔ جنگ کے دو ہی نتائج ہو سکتے ہیں فتح یا شکست۔ ہم کو فتح کا یقین ہے۔ برطانیہ کی فتح ہماری زندگی ہے اور اس کی شکست ہماری تباہی۔ اگر فتح یقینی ہے تو اس کے نتائج کیا ہوں گے؟ سب سے پہلی چیز جو ہوگی وہ یہ ہے کہ حسب وعدہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو قانون ویسٹ منسٹر کے مطابق مقبوضاتی مرتبہ عطا کر دے گی جس کے یہ معنی ہیں کہ اب ہمارے اطراف راست برطانوی حکومت کی بجائے ہندوستانی حکومت کارفرما ہوگی اور یہ امر مسلم ہے کہ ہمارے تمام معاہدات تاج برطانیہ کے ساتھ ہیں۔ مقبوضاتی مرتبہ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو اختیارات مدافعت بھی کاملاً مل جائیں گے اور ہم نے اپنی مدافعت کے اختیارات اپنی رضامندی سے تاج برطانیہ کے تفویض کئے تھے۔ ان تمام حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ چوں کہ حکومت برطانیہ راست ہماری مدافعت کے قابل نہ ہوگی اور اس بات کے ہم مجاز ہیں اور ہوں گے کہ جدید ہندوستانی حکومت سے جس قسم کے تعلقات مناسب سمجھیں قائم کریں۔ اس لئے لازمی طور پر وہ تمام معاہدات منسوخ ہو جائیں گے۔ جو ہم نے مدافعت کے سلسلہ میں تاج برطانیہ سے کئے ہیں اور اس کا دوسرا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ چوں کہ اب خود ہم کو اپنی مدافعت کا سامان کرنا ہوگا اس لئے وہ تمام مقبوضات جو ہم نے مدافعتی افواج کے اخراجات کے لئے یا کسی اور طریقہ پر انعاماً و عطاءً تاج برطانیہ کے تفویض

کئے تھے ہم کو واپس مل جائیں گے۔

اگر خدانخواستہ برطانیہ کو شکست ہوئی اور ہندوستان پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوگئی ہندوستان میں نراج پیدا ہوگا اور سارا ملک ان خطرات سے دوچار ہونے لگے گا جو آج ہم کو دور نظر آرہے ہیں تو معاہدات کی روشنی میں جو حکومت برطانیہ نے ہم سے کئے ہیں ہم اس سے کس امداد کی توقع کرسکتے ہیں؟ خصوصاً جب کہ معاہدات کی رو سے حکومت برطانیہ اس وقت ہماری امداد پر مجبور نہیں ہے جب کہ اس کی فوجیں دوسری طرف مشغول ہیں۔ کیا ہم اتنے طاقتور ہیں کہ ایسی طوائف الملکی کا مقابلہ کریں؟

اس شبہ کو موجودہ امداد سے خارج نہیں تصور کیا جاسکتا کیوں کہ ہماری حکومت آج بھی مجبور نہیں ہے کہ اپنی فوجی طاقت میں اضافہ نہ کرے۔ حکومت کو چاہئے کہ حالت کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے فوراً اپنے یہاں سامان حرب تیار کرنے والے کارخانے قائم کرے۔ اپنے توپ کے سانچے، بندوق سازی کے ٹوٹے ہوئے کارخانوں کو دوبارہ زندہ کرے اور اپنے ملک کو اس قابل بنائے کہ اپنے حلیف کی اس پریشانی میں وہ بوقت ضرورت اپنی آپ حفاظت کرسکے۔ ہم کو یقین ہے اور برطانیہ سے اس یقین کے قائم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو آلات حرب ہم تیار نہیں کرسکتے اور جن کی موجودہ زمانہ میں شدید ضرورت ہے مثلاً ہوائی جہاز، مشین گن، دبابے، ہوائی مدافعت کے سامان، اینٹی ایر کرافٹ توپیں وغیرہ وہ ہم کو فراہم کئے جائیں گے بلکہ بعجلت ممکنہ فراہم کئے جائیں کیوں کہ زمانہ کی رفتار خطرات کو کچھ زیادہ دور نہیں بتارہی ہے۔''

(حیدرآباد کا عروج وزوال صفحہ ۲۹۹ تا ۳۰۱)

ایک اور تقریر کا اقتباس :

''دوسری عالمگیر جنگ آج صفات انسانیت کی تباہی کا سامان پیدا کررہی ہے، مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں کرنی ہے کہ دو متحارب فریقوں میں کون برسر حق ہے بس مجھے یہ ضرور دیکھنا ہے کہ اس عظیم الشان جنگ کے نتائج وعواقب ہندوستان اور حیدرآباد پر کیا مرتب ہوں گے۔ جو سوال کبھی حیدرآبادی مسلمان کے دل میں کھٹک جاتا ہے اور اس کو بے

چین کر دیتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان کی بے ریا، مخلصانہ اور وفادارانہ دوستی کا تاریخ کے ہر دور میں ان کو کیا صلہ ملا اور آئندہ وہ کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔

اگر اس جنگ عظیم کا نتیجہ یہی ہے کہ دو سو سال کا غلام ہندوستان دنیا میں پھر ایک مرتبہ زیر سرپرستی تاج برطانیہ آزادی کی سانس لے تو اس کا دوسرا لازمی نتیجہ یقیناً یہ ہونا چاہئے کہ حیدرآباد نے جتنے اقتدارات، ذمہ داریاں اور جتنے علاقہ جات ومقبوضات تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنے حلیف کے تفویض کئے تھے وہ سب بلا کسی شرط کے اس کو واپس کردیئے جائیں۔ اس کے دوسرے الفاظ میں یہ معنی ہوں گے کہ ایک طرف حیدرآباد کے جغرافیائی حدود میں برار شمالی سرکار اور مچھلی پٹن داخل ہوں گے اور دوسری طرف حیدرآباد ایک آزاد اسلامی سلطنت کی حیثیت سے آزاد ہندوستان اور دنیا کے دوسرے آزاد ممالک سے اپنے سیاسی تعلقات قائم کرنے کا مجاز ہوگا۔"

(سوانح بہادر یار جنگ حصہ دوم از نذیرالدین احمد صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴)

اہم یادداشت مورخہ ۲۶/ جمادی الثانی ۱۳۵۹ھ میں مزید اہم اُمور کا مطالبہ حکومت حیدرآباد سے کیا گیا تھا کہ مملکت کی آزادانہ حیثیت کی واپسی کے سلسلہ میں اقدامات کئے جائیں اور وہ علاقہ جات جو معاہدات کے تحت انگریزوں نے بضمن خدمات دفاع حاصل کئے تھے استرداد کے اقدامات کئے جائیں۔ چوں کہ ہندوستان کے سیاسی حالات انقلاب انگیزی سے گزر رہے ہیں اور مابعد جنگ وعدہ کے مطابق برطانیہ ہندوستان کو آزادی دے دے۔ حیدرآباد کے یہ دو اہم معاملے ادھورے نہ رہ جائیں اور نئی حکومت ہند سے ان کے تصفیہ کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ یہ بڑے اہم اُمور تھے جس کی جانب مجلس نے بروقت حکومت کی توجہ مبذول کروائی۔ لیکن حکومت حیدرآباد نے کوئی توجہ نہ دی اور بے عملی کا شکار رہی۔

جنگ کے حالات کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں سیاسی تبدیلیاں بڑی تیز رفتاری سے رونما ہورہی تھیں۔ اسی دوران نواب بہادر یار جنگ کی حرکیاتی قیادت کا سکہ جم چکا تھا اور وہ حیدرآباد کی سیاست پر چھائی ہوئی شخصیت بن چکے تھے۔ ۱۹۳۷ء کے صوبہ واری انتخابات کے بعد کانگریس کا رویہ بڑی حد تک مخالف اقلیت بن گیا تھا۔ سیاسی اقتدار میں اکثریت کی بنیاد پر حکومتیں بنائی گئیں تھیں۔

خاص طور پر صوبہ بہار اور بمبئی میں اقلیتوں کو سیاسی اقتدار سے بے دخل کر کے اکثریتی طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کو چیف منسٹر بنایا گیا تھا جس پر تنقید کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب India Wins Freedom میں صاف طور پر لکھا کہ اس حرکت نے تقسیم ہند کے بیج بوئے۔ کانگریس پر سے مسلمانوں کا اعتماد اُٹھ گیا اور مسلمان مسلم لیگ کے زیر سایہ متحد ہونے لگے۔ ہندوستان کے مسلم مفاد سے کیسے بہادر یار جنگ دور رہ سکتے تھے چنانچہ وہ مسلم لیگ کی تحریک میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ تحریک قیام پاکستان کے سلسلہ میں بڑی خدمات انجام دیں۔ زور خطابت، خلوص اور جذبہ خدمت نے مسلمانان ہند کا دل جیت لیا۔ ان کا قائداعظم محمد علی جناح کے با اعتماد اور قریب ترین شخصیت میں شمار ہونے لگا۔ قائد ملت کے خطاب سے موسوم ہوئے اور قائداعظم کے بعد ہندوستان کی دوسری بڑی شخصیت کے حامل کہلانے لگے۔ حیدرآبادیوں کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا فخر ہوسکتا تھا۔ لیکن ان کی اس بلندی پر نظر بد نے وار کیا۔ اقتدار کے ایوان اور سازشی ٹولے نے جو انھیں اپنی راہ کا کانٹا سمجھ رہا تھا ۲۵ر جون ۱۹۴۴ء کو حقہ کے ایک کش سے اس نیک نفس، بلند مقام اور فراست مومن کے جیتے جاگتے نمونہ کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بہادر یار جنگ کی موت حیدرآباد کی موت تھی۔ اس سے بڑھ کر حیدرآباد کی اور کیا بدقسمتی ہوسکتی تھی کہ اس نازک وقت پر جب کہ ساری اُمیدیں ان سے وابستہ ہوگئی تھیں انھیں راستہ سے ہٹا دیا گیا۔ یہ ہوتے تو حیدرآباد کی مسلم مملکت اس طرح نیست و نابود نہ ہوتی۔ کوئی نہ کوئی ایسی صورت گری ہوتی جس سے حیدرآباد تباہی سے محفوظ رہتا۔ اللہ پاک جب اپنے منصوبوں کی پذیرائی کرنا چاہتے ہیں تو ایسے افراد کا انتخاب کرتے ہیں جو اُن کے منصوبوں کی پذیرائی میں کارگر ہوں۔ نواب بہادر یار جنگ اس کام کو نہ کر سکتے تھے اس لئے اللہ پاک نے بڑے شان و شوکت سے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔

نذیرالدین احمد نے اپنی کتاب سوانح بہادر یار جنگ جلد سوم میں نواب بہادر یار جنگ کی موت پر (۲۰۰) سے زیادہ صفحات پر بڑا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ۲۵ر جون ۱۹۴۴ء اتوار کے دن حسب معمول اپنی کوٹھی پر درس اقبال کی محفل کے بعد مغرب کی نماز ادا کر کے اپنے ایک دوست ہاشم علی خان جج ہائیکورٹ کے گھر بنجارہ ہلز پر دعوت پر تشریف لے گئے۔ نواب صاحب ڈاکٹر رضی الدین کی برابر والی کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔ اس دعوت میں کئی مشہور ہستیاں شریک تھیں جن میں

اوروں کے علاوہ ڈاکٹر مس مقبول علی بھی تھیں جو یہودن تھیں ۔ان کے مراسم آرتھر لوتھیان ریذیڈنٹ حیدرآباد سے دوستانہ تھے ۔موضوع سخن اقبال ہی تھے۔اسی دوران اس خاتون نے نواب صاحب کو حقہ پیش کیا۔نواب صاحب نے پہلا کش لیا اور اسی کش کے ساتھ ہی ایک زبردست جھٹکا لگا اور اپنے رب سے جاملے۔

حقہ سے تیز زہر دیا گیا۔وہ حقہ فوری مقام واردات سے ہٹا دیا گیا پھر بعد میں دستیاب بھی نہ ہوا۔بیگم صاحبہ بہادر یار جنگ نے پوسٹ مارٹم کی اجازت نہ دی اور سارے واقعہ کی کوئی تحقیقات بھی نہیں ہوئیں اور نہ ابوالحسن سید علی جیسے پایہ کے مجلسی رہنما نے گرفتاری کے ڈر سے تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ ان تمام اسباب وعلل اور شخصیات جن پر اس بھیانک جرم کے مرتکب ہونے پر شک کیا جاسکتا تھا نذیرالدین احمد نے تفصیلی جائزہ لیا۔

نواب زادہ لیاقت علی خان جنرل سکریٹری مسلم لیگ (جو بعد میں وزیراعظم پاکستان ہوئے) اور نواب بہادر جنگ میں شدید اختلافات تھے ۔چوں کہ بہادر جنگ قائداعظم سے بہت قریب ہوگئے تھے اور لیاقت علی خاں سے زیادہ قائداعظم کا اعتماد ان پر تھا۔قیاس آرائی تھی کہ اس اختلاف کی وجہ سے لیاقت علی خاں ممکن ہو لیاقت اللہ قریشی ایڈوکیٹ کے ذریعہ بہادر یار جنگ کو راستہ سے ہٹانے کا کام کیا۔لیاقت اللہ قریشی گوالیار ریاست کے جج تھے استعفیٰ دے کر حیدرآباد میں ایڈوکیٹ کی حیثیت سے کام کرنے کے لئے آئے ان کو بہادر یار جنگ نے قریب کیا اور ان کی بڑی مدد کی ۔نیشنلسٹ مسلم رہنما جیسے اکبر علی خان ،قاضی عبدالغفار روزنامہ پیام وغیرہ جو بہادر یار جنگ سے سیاسی شدید اختلافات رکھتے تھے ان پر بھی اس مذموم حرکت میں ملوث ہونے کی قیاس آرائیاں تھیں نذیرالدین احمد صاحب نے اپنے تفصیلی تجزیہ میں ان اصحاب کی ملوث ہونے کی تردید کی۔

بہادر یار جنگ ، انگریزوں کے مفاد کے خلاف آواز بلند کئے تھے ۔انگریز ریذیڈنٹ اور وائسرائے شدید مخالف تھے ۔کانگریس اور کانگریسی رہنماؤں کا موافق رہنا بعید از قیاس تھا۔نظام کا درباری سازشی ٹولہ اپنے ذاتی اور سیاسی مفاد کے لئے انگریز اور کانگریسیوں سے ہاتھ ملائے ہوئے حیدرآباد کے خلاف سازشوں میں ملوث تھا۔نذیرالدین احمد نے چند خاص ہستیوں کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے جن میں سالار جنگ آخر، ہوش بلگرامی (ہوش یار جنگ) علی یاور جنگ وغیرہ شامل ہیں۔

علی یاور جنگ اس ٹولہ کا دماغ تھے اور بہادر یار جنگ ان کو الذہن الخبیث کہتے تھے۔ سالار جنگ اس ٹولہ کے سرپرست اعلیٰ تھے اور اس ٹولہ کے اکثر افراد آپس میں رشتے دار تھے۔ ان سب میں عقائد اور مفادات کا بھی اشتراک تھا۔ اس ٹولے کے افراد حکومت کے کلیدی عہدوں پر تھے اور دربار میں بڑا رسوخ رکھتے تھے۔ ان کے ذاتی اور سیاسی مفادات تھے۔ یہ ٹولہ بہادر یار جنگ کی سیاسی زندگی کے آغاز ۱۹۳۸ء سے لے کر موت تک شدید مخالف رہا۔ بہادر یار جنگ نے جب حیدرآباد میں مسلم سیاسی برتری کا اعادہ کیا تو اس ٹولے نے مخالفت شروع کی۔ حیدرآباد کی مستقبل کی صورت گری اگر بہادر یار جنگ اور قائداعظم کے نقشہ کے مطابق ہوتی تو اس ٹولہ کا باقی رہنا مشکل تھا اس لئے یہ ٹولہ اپنے مفادات حاصلہ کے لئے کانگریس سے جڑا ہوا تھا۔

بہادر یار جنگ کے سیاسی عروج، اندرونی اور بیرونی مقبولیت کے بعد اس ٹولہ کو یقین ہو گیا کہ حیدرآباد کی مستقبل کی صورت گری بہادر یار جنگ کے ہاتھ رہے گی اور اس روز اس ٹولہ کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا بلکہ قہر مذلت میں گر جائے گا۔ اس لئے اس نے بہادر یار جنگ کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھ کر اقتدار میں آنے سے قبل صفحۂ ہستی سے مٹانے کا منصوبہ بنایا۔ اس ٹولہ نے حضور نظام کو باور کروالیا کہ نواب صاحب کے وجود سے نظام کے تخت وتاج کو شدید خطرہ ہے۔ نعرۂ انا الملک[1] کو غلط انداز سے ہوا دی گئی کہ ''ہم بادشاہ ہیں اور کنگ کوٹھی کا ساکن صرف قوم کا مظہر ہے۔'' حضور نظام کے ذہن میں تخت وتاج کے لئے خطرہ کی بات بٹھا دی گئی اور اسی خطرہ کو بنیاد بنا کر زہر دینے کا مذموم منصوبہ خود بہادر یار جنگ کے دوست ہاشم علی خان جج ہائیکورٹ کے مکان پر بنا کر عملی جامہ پہنایا گیا اس طرح سے نذیر الدین احمد اپنے تجزیہ میں نظام اور اس سازشی جتھے کے ملوث ہونے کو قرین قیاس سمجھتے ہیں۔ نذیر الدین احمد لکھتے ہیں کہ ہاشم علی خان کو ممکن ہو منصوبہ کی پذیرائی ہونے تک منصوبہ کا

---

[1] جمہوریت یا ذمہ دارانہ حکومت کے مقابلہ میں حیدرآباد کے مسلمانوں کا جو کمزور سیاسی موقف تھا اس کی بقاء تخت وتاج آصفی سے وابستگی پر ہی ممکن تھا اسی لئے بہادر یار جنگ نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ''ہم دکن کے بادشاہ ہیں اعلیٰ حضرت بندگان عالی کا تخت وتاج ہمارے سیاسی اور تمدنی اقتدار کا مظہر ہے۔ اعلیٰ حضرت ہماری بادشاہت کی روح اور ہم ان کی بادشاہت کے جسم اگر وہ نہیں تو ہم نہیں اور ہم نہیں تو وہ نہیں۔'' ایک اور مقام پر فرماتے ہیں ''میں تخت وتاج آصفی اور اقتدار شاہانہ آصفیہ پر اس لئے قربان ہونا چاہتا ہوں کہ میں اس اقتدار کو ملت اسلامیہ کا اقتدار اور اس تخت وتاج کو ملت اسلامیہ کے اقتدار کا مظہر تصور کرتا ہوں'' اس کو انا الملک کے نعرہ سے تعبیر کیا گیا اور غلط رنگ دے کر ہم نہیں تو وہ نہیں جیسی بات پھیلائی گئی

علم نہ تھا ہوگا لیکن بعد میں جب انھیں اس کا علم ہوا تو ان کے ذہن پر اتنا شدید اثر ہوا کہ وہ پاگل ہوگئے اور اس پاگل پن میں انتقال کر گئے۔[۲]

یہ سازشی جتھہ جو حیدرآباد کے زوال میں شروع ہی سے بڑا سرگرم تھا۔ انگریزوں اور کانگریسیوں کے ساتھ ملوث تھا، حیدرآباد کے زوال کے قبل بھی کلیدی عہدوں پر فائز تھا اور دربار میں بڑا رسوخ رکھتا تھا۔ زوال کے بعد بھی خوب نوازا گیا۔ گورنر بنے، وزارتیں ملیں، بڑے بڑے عہدوں پر خود فائز رہے اور اپنی اولاد کو فائز کروائے۔ زین یار جنگ کے صاحبزادے سعادت علی خاں جو بڑی مشکل سے میٹرک کامیاب کئے تھے اور انگلستان جا کر بھی کوئی ڈگری نہ لے سکے تھے بھارتی وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے پارلیمانی سکریٹری بنے اور بعد میں اس سے بھی بلند مرتبہ پر فائز ہوئے خدمات کا صلہ تو ملنا تھا ملتا رہا۔

بہادر یار جنگ حیدرآباد کے محبوب رہنماء تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں کا اعتماد انھیں حاصل تھا۔ یہ وقت کے سیکولر (Secular) رہنما تھے۔ ہندو ان کی عزت کرتے اور بات مانتے تھے۔ کوئی اور دوسرے رہنماء کو یہ مقام حاصل نہ تھا۔ ملک کے ان نازک لمحات میں حیدرآباد کو ایسے رہنماء کی شدید ضرورت تھی۔ اس لئے بہادر یار جنگ کی موت دراصل حیدرآباد کی موت تھی۔ حیدرآباد ۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو نہیں بلکہ ۲۵ جون ۱۹۴۴ء کو شہید ہوا۔

مجلس اتحاد المسلمین بام عروج پر پہنچ کر ایک عظیم سیاسی طاقت بن گئی تھی۔ اس نے ایک عظیم حرکیاتی رہنماء کو کھو دیا جس کا بدل اس کو نصیب نہ ہوسکا۔ بلکہ مجلس کی رہنمائی روبہ زوال ہوئی اور فراست مومن سے محروم ہو کر اس نے نقصان عظیم اُٹھایا۔

حضور نظام اور ان کی عقل پر جتنا واویلا کیا جائے کم ہے۔ حضور نظام کو صرف اور صرف اپنے اقتدار کی بقاء سے دلچسپی تھی۔ اس کے لئے وہ بڑی سے بڑی قیمت چکانے تیار تھے۔ بہادر یار جنگ بادشاہت کی بقاء کے سارے سامان کر رہے تھے وہ حضور نظام کے مقابل نہیں آئے تھے۔ فراست تو یہی تھی کہ ایسے وقت ساری توانیاں بہادر یار جنگ کے ساتھ کردی جاتیں۔ ان پر کامل اعتماد کیا جاتا اور ان کی کامل حفاظت کی جاتی۔ سازشی جتھے کے بہکاوے میں آ کر اعتماد شکنی پیدا کر لینا موقع محل کے

---

[۲] سوانح بہادر یار جنگ جلد سوم صفحہ ۳۶۷ تا ۴۱۷

لحاظ سے حقائق کا صحیح تجزیہ نہ کرنا محرومی فراست کی نشاندہی کرتا ہے جو ایک بیدار مغز بادشاہ کے لئے موت کا پیغام سے کم نہیں۔ نظام، اقتدار اور رتبہ کے لئے پے در پے غلطیاں کرتے رہے۔ انھیں کی ان سنگین غلطیوں نے آخر کار مسلم ریاست کا خاتمہ کیا۔

مجلس اتحادالمسلمین کی قیادت

بہادر یار جنگ کے انتقال کے بعد صدارت کا انتخاب پر سکون انداز میں طے کر لیا گیا۔ ابوالحسن سید علی مجلس میں صدر کے عہدہ سے قبل معتمدی کے خدمات انجام دے چکے تھے۔صدارت کا عہدہ قائم ہونے پر بہادر یار جنگ اس عہدے پر متمکن ہوئے اور جب سیاست میں بام عروج پر پہنچے تو نظام نے ابوالحسن سید علی کو بہادر یار جنگ کے مقابل کھڑا کیا۔ دربار میں حاضری کے لئے طلب کئے جانے لگے۔ دونوں میں اختلافات پیدا ہوئے اور بہادر یار جنگ کافی بدظن رہے اور عاملہ میں پھر شریک نہیں کئے گئے۔ اپنی جانشینی کے لئے فضل حسین ایڈوکیٹ کو نامزد کیا تھا۔ بہادر یار جنگ کی موت کے بعد گمنامی سے نکل کر ابوالحسن سید علی ایڈوکیٹ نے ان لوگوں کی پیشوائی کی جو بہادر یار جنگ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے لاش پر حاضر ہوئے تھے۔اس طرح وہ پھر مجلس میں نمودار ہوئے۔صدر کے انتخاب کے لئے دارالسلام میں ارکان شوریٰ کا غیر رسمی اجلاس ہوا۔ فضل حسین کی نامزدگی کی نشاندہی کے باوجود چند اصحاب اور قاسم رضوی نے ابوالحسن سید علی کے نام پر اصرار کیا۔ اختلافات ہونے لگے تو بابو خاں اور لایق علی نے ثالثی کے فرائض انجام دے کر ابوالحسن سید علی کے انتخاب کے لئے موافق فضاء بنائی۔ انتخاب کا اعلان ہوا اور ابوالحسن سید علی بڑے خوشگوار ماحول میں صدر منتخب کر لئے گئے اور بعد میں کوئی اختلاف باقی نہ رہا۔

جس وقت انھوں نے صدارت کا عہدہ سنبھالا ملک بڑے اہم اور نازک دور سے گذر رہا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے ختم ہونے کے آثار تھے اور ہندوستان آزادی کے لئے پر تول رہا تھا۔ ایسے وقت حیدرآباد کے لئے ایک فرلیس اور تجربہ کار قائد کی سخت ضرورت تھی۔ ابوالحسن سید علی مجلس کے معتمدی کے خدمات انجام دے چکے تھے۔ دستوری مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مستقبل میں ہونے والے واقعات کا اندازہ کرتے ہوئے حکومت میں عوامی عنصر کو داخل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مجلس عاملہ وشوریٰ

کی منظوری اور علم واطلاع کے بغیر ریاستی کانگریس کے لیڈر راما چاری سے سرسالار جنگ کی سرپرستی میں ان ہی کی دیوڑھی پر خفیہ معاہدہ کرلیا کہ دو ہندو اور دو مسلم فوراً باب حکومت (Cabinet) میں لئے جائیں گے۔ مفاداتی کے بجائے علاقہ واری طریقہ انتخاب اختیار ہوگا اور مقننہ کے اختیار میں بجٹ کی منظوری دی جائے گی۔ یہ معاہدہ مجلس کی معلنہ پالیسی کے خلاف تھا جس کے ذریعہ ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے لئے راہ ہموار ہورہی تھی۔ ابوالحسن سید علی نے مجلس عاملہ اور شوریٰ کی منظوری کے بغیر ایسا معاہدہ طے کرنے کی بڑی غلطی کی تھی اسی لئے مجلس اور مسلمانوں میں ان کے خلاف شدید جذبات اُبھرے۔ حکومت میں معتمدین اور اعلیٰ حکام جو کرسی وزارت کے ملتظر تھے سب خلاف ہوگئے۔ اخبارات نے واویلا مچایا۔ مجلس عاملہ کے اراکین مستعفی ہونے لگے۔ ابوالحسن سید علی یکا وتنہا ہوگئے اور مجبوراً مستعفی ہونا پڑا۔

حالات کا لحاظ کرتے ہوئے عوامی عنصر کو داخل کرنے جو منصوبہ تھا وہ بُرا نہ تھا۔ بلکہ عملی تھا۔ لیکن جس بھونڈے انداز میں منصب صدارت کے زعم میں طریقہ کار اختیار کیا گیا وہ غلط تھا۔ انھیں چاہئے تھا کہ عاملہ اور شوریٰ کے ارکان کو اعتماد میں لیتے بحث ومباحث کے بعد منظوری لی جاتی۔ بجائے سالار جنگ کے گھر کے کسی اور موزوں مقام کا انتخاب ہوتا تو کامیاب ہوجاتے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی کمزوریوں میں ایک کمزوری جاہ طلبی تھی وہ اس مصالحت کے ذریعہ مسلم نمائندے کی حیثیت سے باب حکومت میں داخل ہونا چاہتے تھے اسی لئے خفیہ معاہدہ کرلیا تھا۔

ابوالحسن سید علی منصب صدارت پر چند ماہ رہے۔ منصب صدارت سے ہٹ کر وہ خاموش نہ رہ سکے۔ انھوں نے مجلس میں اپنا گروپ بنالیا تھا جس کی قیادت سید محمد قاسم رضوی ایڈوکیٹ کررہے تھے۔ مجلس دو گروپ میں تقسیم ہوکر انتشار کی طرف جارہی تھی اراکین شوریٰ میں اس وقت مولانا مظہر علی کامل کے سوائے کوئی ایسی شخصیت موجود نہ تھی جو اس انتشار کو ختم کرتی۔ اسی لئے علیل ہونے کے باوجود انتشار کو ختم کرنے کے لئے راضی ہوگئے۔ مولانا ایک عالم باعمل اور دارالقضاء بلدہ کے کامیاب ایڈوکیٹ تھے۔ ولولہ انگیز مقرر، باکردار، مجلس کے احیاء کے بعد سے رکن عاملہ اور بہادر یار جنگ کے بااعتماد رفیق اور معتمد تھے۔ صدارتی انتخاب میں بہ غلبہ آراء قاسم رضوی کو شکست دے کر منتخب ہوئے۔ مولانا جمہوری طرز پر کاربند، اعتدال پسند اور کوئی چیز عاملہ کی منظوری کے بغیر نہ کرتے

تھے۔ دوسرے سال بھی صدارت کے لئے منتخب ہوئے اور سر مرزا اسمٰعیل کے صدر اعظم بننے تک صدارت کے عہدہ پر اگست ۴۶ء تک فائز رہے۔ ان کے دور صدارت میں ابوالحسن سید علی نے قاسم رضوی کے تعاون سے اپنا اختلافی گروپ بنائے رکھا اور کچھ نہ کچھ مصیبت کے سامان پیدا کرتے رہے۔ مولانا کے دور صدارت میں مسجد ڈ چپلی[1] کے مسئلہ پر اسی مجلسی گروپ کے ذریعہ شاہ منزل جلانے کا واقعہ پیش آیا جس کے بعد نواب چھتاری کو صدر اعظم سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ان ہی کے دور صدارت میں کابینی مشن بھی آیا تھا جس نے ہندوستان کے ہونے والے سیاسی نقشہ کی سفارش کی تھی۔ قریب ڈیڑھ سال کی صدارت کے بعد مولانا پھر صدارتی انتخاب کے لئے کھڑے نہیں ہوئے۔

مجلس میں ایک گروپ اصحاب خمسہ کے نام سے تھا جن میں حکیم الدین انصاری، احمد عبداللہ المسدوسی، عبدالکریم تماپوری، محمد اعظم اور انیس الدین احمد تھے۔ اس گروپ کو اپنی فکر و دانش پر غلط فہمی تھی کہ حکومت کی کرسیوں کے لئے اپنے آپ کو سب سے زیادہ اہل ترین سمجھتے تھے۔ مجلس کے اندر مقتدر حیثیت حاصل کرنا اور باہر حکومت سے ربط ضبط قائم کئے ہوئے تھے۔ یہ گروپ مولانا مظہر علی کامل کی تائید میں اور ابوالحسن سید علی گروپ کے خلاف تھا۔ مولانا مظہر علی کامل کے بعد صدارت کے انتخاب کا وقت آیا تو یہ بھی اپنا اُمیدوار انیس الدین احمد صدر مجلس بیڑ کو بنایا۔

صدارتی انتخاب کے وقت اُمیدواری کے میدان میں ابوالحسن سید علی گروپ کی طرف سے قاسم رضوی، مخالف گروپ کی طرف سے عبدالرحمٰن رئیس مدیر وقت اور اصحاب خمسہ کی طرف سے انیس الدین احمد میدان میں تھے۔ قاسم رضوی نے جنھیں علی گڈھ یونیورسٹی کے طالب علمی کے زمانہ سے انتخابات لڑنے کا تجربہ تھا بڑی کامیابی سے مہم چلائی اور ۱۹۴۶ء میں صدر منتخب ہوئے۔ یہ بڑے جوشیلے اور جذباتی تھے۔ جس وقت یہ صدر بنے اس وقت حیدرآباد بڑے نازک دور میں تھا اور ایک تجربہ کار سیاست داں کی عہدہ صدارت پر ضرورت تھی۔ اس وقت قاسم رضوی اس اہم ذمہ داری کو پر کرنے کے قابل نہ تھے۔

مجلس اتحادالمسلمین حیدرآباد کی نہایت طاقتور تنظیم تھی جس نے سلطنت حیدرآباد کے باقی رکھنے کی اہم ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔ اس کو بہادر یار جنگ جیسی فریس قیادت بھی میسر تھی جس پر

---

[1] مسجد ڈ چپلی واقعہ کی تفصیل صفحہ ۹۸ باب ''انگریزوں کا فریب اور اعلان آزادی حیدرآباد'' میں دیکھا جائے

حیدرآباد بجا طور پر فخر کرسکتا تھا اور صحیح معنوں میں پرُامید تھا کہ حیدرآباد کو اس نازک وقت میں کامیابی سے ہمکنار ہونے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔ لیکن افسوس کہ حکومت حیدرآباد کی ناعاقبت اندیش سازشوں نے حیدرآباد کو ایک بڑے سانحہ سے دوچار کیا۔ بہادر یار جنگ کے بعد جو بھی قیادت آئی وہ ان کی بدل نہ بن سکی۔ مجلس باوجود مستحکم ہونے کے بہادر یار جنگ جیسی قیادت سے محروم رہی۔

نواب میر عثمان علی خاں بہادر

(آصف سابع)
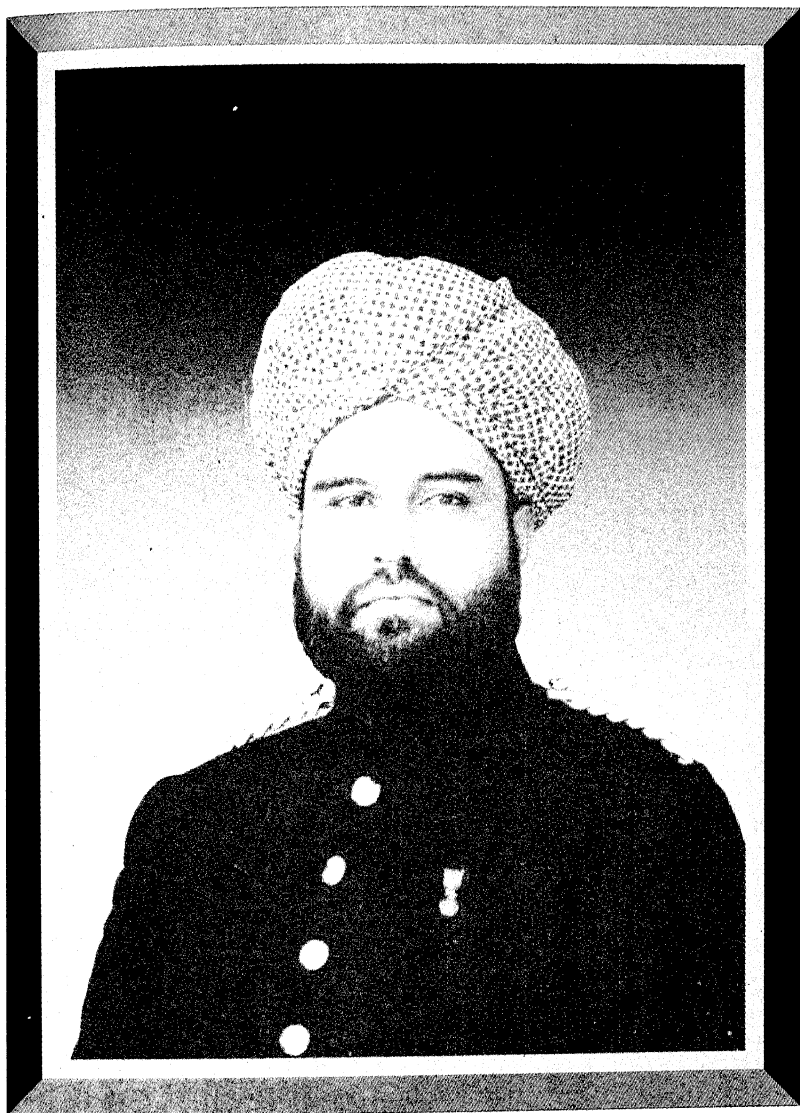
بہادر یار جنگ

سید محمد قاسم رضوی

میر لایق علی

(صدر اعظم)

انگریزوں کا فریب اور اعلان آزادی حیدرآباد

دوسری جنگ عظیم مئی ۱۹۴۵ء کے ابتدائی دنوں میں ختم ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں بڑی سرعت آمیز سیاسی تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ انگریز اگرچہ کہ جنگ میں کامیاب ہوئے لیکن ان کا سیاسی اثر ساری دنیا میں بری طرح متاثر ہوگیا اور وہ نوآبادیاتی نظام (Colonization) کو برقرار رکھنے کے قابل نہ رہے۔ جنگ کی وجہ سے مالی بوجھ اور ہندوستان کی تحریک آزادی سے نبرد آزما ہونا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ اسی لئے ہندوستان کی آزادی کا اعلان کردیا گیا اور ۱۵/اگسٹ ۴۷ء کو ہندوستان کی تقسیم کے ذریعہ آزادی دی گئی۔ دیسی ریاستوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ آزاد رہیں یا ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کرلیں۔ اتنی تیز سیاسی تبدیلی انگریزوں سے غیر متوقع تھی۔

۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۵/اگسٹ ۴۷ء تک کا زمانہ دیسی ریاستوں کے لئے بڑا نازک تھا۔ ان دیسی ریاستوں میں آبادی اور آمدنی کے لحاظ سے سب سے بڑی اور مستحکم حکومت حیدرآباد تھی۔ تاج برطانیہ اور ان دیسی ریاستوں کے درمیان تعلقات ان معاہدوں کی بنیاد پر تھے جو دونوں کے درمیان ہوئے تھے جس کے دونوں پابند تھے۔ یہ بڑی بے وفائی بلکہ شرمناک حرکت تھی کہ جب انگریز اپنا اقتدار ختم کرکے جانا چاہتے تھے تو دیسی ریاستوں کے حقوق استرداد کئے بغیر حکومت ہند کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلتے بنے۔

یہ زمانہ ریاست حیدرآباد کے لئے بہت نازک اور خطرناک تھا سوال یہ تھا کہ اس کی بقاء کا کیا انتظام کیا جائے۔ ایک بڑے مدبر، فریس اور دوررس سیاست دان کی ضرورت تھی۔ قاسم رضوی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے اہل نہ تھے۔ مجلس کی طے شدہ پالیسی تھی کہ حیدرآباد فی الحال آزاد رہے اور منتظر تھی ہندوستان کے اُس سیاسی نقشہ کی جو مابعد جنگ اُبھرنے والا تھا۔ برٹش انڈیا کی حد تک سیاسی نقشہ ذمہ دارانہ حکومت کے قیام پر ہونے والا تھا لیکن دیسی ریاستوں کا معاملہ سلجھایا نہ گیا تھا کہ

دیسی ریاستوں کے لئے وفاق ہوگا یا اور کوئی حل۔

نظام کا دربار جو ایک سیاسی طاقت رکھتا تھا سازشوں میں ملوث تھا۔ جب تک انگریز تھے ان کا وفادار تھا اور جب حکومت ہند آئی تو حکومت ہند اور خاص طور پر کانگریسیوں سے ہاتھ ملائے ہوئے تھا۔ اتحاد المسلمین کو جو حیدرآباد کے آزاد رہنے کا خواب دیکھ رہی تھی اس سازشی طبقہ نے نظام اور ان کی حکومت سے قریب ہونے نہ دیا۔ اہم سیاسی اُمور میں مشاورت بھی نہ ہوتی تھی ۔ یہ شکایت بہادر یار جنگ کو بھی اور ان کے بعد بھی باقی تھی۔ اسی لئے قاسم رضوی نے حکومت میں مجلس کے اثر کو قائم کرنے کے لئے مداخلت کرنی شروع کردی۔

اس وقت نواب سعید احمد خاں چھتاری صدر اعظم تھے (ستمبر ۱۹۴۱ تا ۱۵ / مارچ ۱۹۴۶ء اور پھر جون ۱۹۴۷ء تا ۳۱ / اکٹوبر ۱۹۴۷ء) ۔ نواب صاحب چھتاری بڑے نازک اور اہم دور میں صدر اعظم رہے۔ اگر وہ چاہتے تو مسلم مفاد کے لئے بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن چوں کہ ان کا تعلق اُتر پردیش سے تھا اور وہاں کے جاگیردار ہونے کی حیثیت سے ان کا اپنا ذاتی مفاد تھا۔ اسی لئے جب تک انگریز رہے ان کا ساتھ دیتے رہے اور جب کانگریس برسر اقتدار آئی تو ان کے مفاد کے خلاف بھی کام نہ کیا۔ نواب بہادر یار جنگ نے مسلمانوں کی بازآبادکاری کی تجویز انھیں بھیجی تھی جس کا تذکرہ گذشتہ باب میں ہو چکا ہے نواب چھتاری نے کچھ نہ کیا۔ یہ چاہتے تو اپنے تقریباً (۶) سالہ دور میں حیدرآباد کو ایک طاقتور ریاست بناتے ، اسی لئے بہادر یار جنگ اور مجلس کو یہی شکایت تھی کہ حیدرآباد میں کسی چیز کی کمی نہیں اور اگر کمی ہے تو کارکردباب حکومت اور بہی خواہوں کی۔ ڈچپلی (نظام آباد) کی مسجد کے ایک معمولی واقعہ[1] کی وجہ سے درباری سازش نے ہنگامہ کھڑا کیا اور نواب چھتاری

---

[1] یہ واقعہ ۱۵ / مارچ ۴۶ء کا تھا۔ موضع ڈچپلی (نظام آباد) میں انگریز مشنری کا ایک جذامیوں کے لئے دواخانہ تھا۔ اس میں مسلمان جذامی بھی تھے۔ نماز کے لئے ایک مقام پر چھپر ڈال کر نماز کی سہولت پیدا کی گئی تھی۔ دواخانہ کی توسیع کے سلسلہ میں اس جگہ کی ضرورت تھی۔ متبادل انتظام کرتے ہوئے یہ جگہ حاصل کرلی گئی تھی۔ عبدالرحمٰن رئیس اس واقعہ کا بتنگڑ بنا کر مسجد کو شہید کئے جانے کا ہنگامہ کھڑا کیا۔ حکومت مشنری اور مجلس کے درمیان مشاورتی اجلاس ہوا جس میں عبدالرحمٰن رئیس بھی شریک تھے اور تصفیہ ہوا کہ مسجد نئی جگہ بنائی جائے گی۔ ایک بڑا مجمع میٹنگ کی جگہ فیصلہ کا منتظر تھا۔ عبدالرحمٰن رئیس نے باوجود تصفیہ سے مطمئن ہونے کے میٹنگ سے باہر آکر مجمع کو ورغلایا نتیجتاً مجمع بے قابو ہوا ، شاہ منزل کو نذر آتش کیا گیا اور صدر اعظم سے برا سلوک کیا گیا۔ مشتاق احمد خاں لکھتے ہیں کہ نظام ، دین یار جنگ ، ہوش یار جنگ اور چند خاص ....

کو مستعفی ہونا پڑا اور ان کی جگہ سر مرزا اسمٰعیل سے پر کی گئی۔ سر مرزا اسمٰعیل کے لانے میں درباری سازش کا مقصد ہی یہی تھا کہ آنے والی حکومت ہند جو کانگریسی ہوگی ان کے ذریعہ سے استفادہ کیا جائے چوں کہ یہ سخت مخالف مسلم لیگ و پاکستان اور موافق کانگریس و حکومت ہند تھے۔ یہ دربار اور حضور نظام کی غلطی تھی۔ قائد اعظم کو اس تقرر کے خلاف احتجاج کرنا پڑا اور اسی لئے حیدرآباد آ کر نظام سے ان کے تقرر کے خلاف گفتگو کی جو ناکام رہی۔ دربار نے اس گفتگو کو قائد اعظم کا نظام کے سامنے سگریٹ پینے کی من گھڑت کہانی گھڑ کر گفتگو کے ناکام ہونے کا سبب بتایا جو غلط تھا۔ نظام نے مرزا اسمٰعیل کو موافق ہندو اور کانگریس اور مخالف مسلمان پایا اور انھیں مرزا اسمٰعیل سے وہ فوائد حاصل نہ ہو سکے جس کی توقع تھی اسی لئے نظام کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مرزا اسمٰعیل ٹک نہ سکے۔ مرزا اسمٰعیل جن کا تقرر جولائی ۱۹۴۶ء کو ہوا تھا مجبوراً چھٹی کے بہانے اپریل ۱۹۴۷ء میں بنگلور چلے گئے اور وہیں سے مئی ۱۹۴۷ء کو استعفیٰ بھیج دیا۔ ان کے بعد نواب چھتاری چند ماہ کے لئے دوبارہ عہدہ صدر اعظم سنبھالا لیکن مجلس کے معاہدہ انتظامیہ جاریہ کے لئے بنائے ہوئے وفد کے خلاف شدید احتجاج کی وجہ سے مستعفی ہو کر چلے گئے۔ ان کے بعد لائق علی کا انتخاب عمل میں آیا جو ۲۸/ نومبر ۱۹۴۷ء سے سقوط حیدرآباد ۱۸/ ستمبر ۱۹۴۸ء تک صدر اعظم رہے۔ یہی ایک صدر اعظم تھے جو حکومت ہند کے یا کانگریس مفاد کے حامل نہ تھے بلکہ مسلم مملکت کی پاسداری ان میں تھی۔ یہ مجلس کے نامزد کردہ بھی تھے۔

نظام، ان کا دربار، انگریز یا حکومت ہند اور مجلس طاقت کے چار زاویہ تھے جو ایک دوسرے کے مخالف رُخ میں کام کر رہے تھے جس کی وجہ سے مسلم مملکت کی بقاء ایک چیلنج بنی ہوئی تھی۔ مجلس اور نظام میں ایک نکتہ پر اتفاق تھا کہ نظام اور ان کا خاندان اس مسلم سلطنت کا سربراہ باقی رہے گا۔ اس ایک نکتہ پر ہی اگر نظام وہ سارے جتن کئے ہوتے جو مجلس اپنی سیاسی زندگی میں ۱۹۳۹ء سے کرتے رہی تو بہت کچھ ہوتا۔ دفاع اور سمندری راستہ مہیا کر لیا جاتا تو خطرہ سے مقابلہ کرنے کے قابل

..........درباریوں کی سازش کی وجہ سے یہ واقعہ پیش آیا تا کہ سر مرزا اسمٰعیل کے لئے راستہ ہموار کیا جائے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد نظام نے ہوش یار جنگ کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ شائد وہ اس واقعہ کے بعد صدر اعظم رہنا پسند نہیں کریں گے۔ چنانچہ نواب چھتاری فوری مستعفی ہوئے۔ (زوال حیدرآباد کی ان کہی داستان صفحہ ۳۱ و ۳۲)

ہوتے ۔لیکن حضور نظام کی ان اُمور پر بے عملی ، ان کے انگریزوں پر غیر متزلزل اعتماد پر مبنی تھی ۔وہ مطمئن تھے کہ انگریز ان احسانوں کے بدلے جو کہ سلطنت آصفیہ اور موجودہ نظام نے ابتداء سے لے کر آخر تک روا رکھے تھے وفاداری نبھائیں گے۔

کیابنیٹ مشن کی سفارشوں کے بعد اٹلی کی حکومت اور لارڈ ماونٹ بیٹن نے بڑے عجلت پسندانہ اقدامات کرتے ہوئے ہندوستان کو تقسیم کے ذریعہ (ہندوستان اور پاکستان) آزادی دے دی اور دیسی ریاستوں کو آزاد رہنے کا موقف عطا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ روسائے دیسی ریاستوں کو ۱۲ رمئی ۴۶ ء کو اطلاع دی گئی تھی کہ جب برطانوی حکومت ہندوستان سے تسلط چھوڑے گی تو پیرامونٹسی (اقتدار اعلیٰ) جو اس کو دیسی ریاستوں پر حاصل تھا وہ اس کے جانشین حکومتوں (ہندوستان اور پاکستان) کو منتقل نہیں کرے گی بلکہ پیرامونٹسی ختم ہوجائے گی اور دیسی ریاستیں اس حالت پر لوٹ آجائیں گی جو معاہدات سے قبل تھیں یعنی وہ آزاد ہوجائیں گی ۔اسی سفارش کو دفعہ (۷) قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء میں مدون کیا گیا کہ وہ آزاد رہیں یا دونوں میں کسی ایک آزاد سلطنت سے وابستہ کرلیں ۔محض قانون میں دفعہ رکھ دینا کافی نہ تھا بلکہ حکومت برطانیہ کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ تمام علاقہ جات اور واجبات جو مختلف تہہ ناموں کے تحت روسائے ریاستوں سے حاصل کئے تھے عملاً واپس کردیئے جاتے تو عہدوفا ہوتا۔ انگریزوں نے سلطنت آصفیہ کے ان احسانوں کا کچھ بھی لحاظ نہ رکھا جوان کے برے وقت کام آیا تھا نظام کو بے یارو مددگار چھوڑ کر چلتے بنے۔دکن پر انگریزوں کا تسلط نظام دوم کا مرہون منت تھا جو ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزوں کے ساتھ دینے کی وجہ سے تھا۔ ساحلی اور کئی زرخیز علاقے مختلف معاہدات کے تحت انگریزوں کے حوالے کئے جس کا وہ صلہ نہ ملا جس کا استحقاق تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں نظام نے حکومت کے سارے ذرائع انگریزوں کے حوالے کئے۔ (۶۲) کروڑ روپئے سے زیادہ مالی اور فوجی امداد کی ۔ دوسری جنگ عظیم میں اس سے کہیں بڑھ کر تعاون کیا۔ بڑی فوج دی گئی جس کے چرچے ہوئے۔ سوادوسو سال کے عرصہ میں سلطنت آصفیہ کے تاجداروں نے انگریزوں کا جس فراخ دلی سے تعاون کیا ہندوستان کی کسی اور دیسی ریاست نے نہیں کیا۔ان احسانات کا خیال کرتے ہوئے انگریزوں کو چاہئے تھا کہ نظام سے حاصل کردہ علاقہ جات، سریکاکول، راجمندری، ایلور، مچھلی پٹنم، نظام پٹن، گنٹور، اننت پور، کڑپہ، کرنول، بلاری، برار وغیرہ

عملاً واپس کردیتے احسان فراموشی نہ ہوتی۔ یہ کہہ دینا کہ قانون آزادی ہند کے تحت دیسی ریاستیں اپنے سابقہ مقام پر واپس ہوگیں تو وہ علاقہ جات جو مختلف معاہدات کے ذریعہ حاصل کئے گئے تھے کیوں حکومت ہند کو حوالے کئے گئے یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔

بدر شکیب لکھتے ہیں :

''جس طرح حکومت برطانیہ نے ریاستوں سے استمزاج کے بغیر ان پر پیرامونٹسی مسلط کردی تھی اسی طرح ان سے کئے ہوئے سارے معاہدات کو جن کے متعلق اصراراً یہ بیان کیا جاتا تھا کہ وہ نا قابل خلاف ورزی اور نا قابل تنسیخ ہیں ان کو یکطرفہ ریاستوں کی ایماء کے بغیر دفعہ (۷) قانون آزادئ ہند کے ذریعہ ختم کردیا گیا۔ حیدرآباد سے کئے ہوئے معاہدات کی نوعیت دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں مختلف تھی لیکن نظام دکن یا ان کے نمائندوں کو قبل از قبل اس تنسیخ کی اطلاع نہیں دی گئی۔ چنانچہ ۹ ر جولائی ۱۹۴۷ء کو نظام نے نمائندہ تاج برطانیہ کے نام ایک سخت خط لکھا جس میں حیدرآباد کو نوآبادیاتی درجہ عطا کرنے کے مطالبہ کا اعادہ کیا گیا۔ بجز خط کی وصولی کے اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا اور مسلسل یاددہانیوں پر آٹھ ماہ کے طویل عرصہ کے بعد کہا گیا کہ دفتر کی غلطی کی بناء پر یہ خط ملک معظم کی حکومت کو روانہ نہیں کیا جاسکا۔ کتنا مجرمانہ جواب ہے جو ایک ایسے ہی شخص کی جانب سے دیا جاسکتا ہے جس کا ضمیر مردہ اور جو شرافت اور انسانیت کے جوہر سے عاری ہو۔ نظام کا خط درج ذیل کیا جاتا ہے :

(۱) ''مسودہ قانون ہند کی دفعہ (۷) کا علم مجھے ابھی چند دنوں قبل اخبارات کے ذریعہ ہوا مجھے افسوس ہے کہ (جیسا گذشتہ چند ماہ میں ایسا بارہا ہوا ہے) اس دفعہ پر برطانوی ہند کے لیڈروں سے کافی طویل مباحث کئے گئے لیکن مجھ پر اس کا نہ اظہار کیا گیا نہ مجھ سے یا میرے کسی نمائندہ سے خصوص میں بحث کی گئی۔ مجھے یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ اس دفعہ میں نہ صرف برطانوی حکومت کی جانب سے ان معاہدات کی جو برسوں سے میری ریاست اور خانوادہ کو برطانوی حکومت سے وابستہ رکھا تھا یکطرفہ تنسیخ عمل میں آئی ہے بلکہ اس میں اس امر کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ تاوقتیکہ میں دونوں جدید

مملکتوں میں سے کسی ایک میں شریک نہیں ہوتا اس وقت تک میری ریاست برطانوی دولت عامہ کا جزو نہیں بن سکتی۔ وہ معاہدات جن کے بموجب ایک عرصہ قبل برطانوی حکومت نے میری ریاست اور میرے خانوادہ کی بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری قبول کی تھی ان کا اس زمانہ میں خصوصاً ۱۹۴۲ء میں سر اسٹرافرڈ کرپس کی جانب سے مسلسل اور اقرار صالح کے طور پر اعادہ کیا جاتا رہا۔ مجھے یہ یقین دلایا گیا تھا کہ میں برطانوی اسلحہ اور برطانوی قول پر کاملاً اعتماد کر سکتا ہوں اور نتیجتاً مجھے حال حال تک اپنی فوج کی تعداد میں اضافہ کرنے اور اسلحہ سازی کے کارخانوں کے قیام سے باز رکھا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود دفعہ (۷) میں معاہدات کی تنسیخ نہ صرف میری رضامندی کے بغیر ہوئی ہے بلکہ مجھ سے یا میری حکومت سے اس خصوص میں گفتگو تک نہ کی گئی۔

(۲) جیسا یور اکسلنسی کو معلوم ہے کہ آپ کی انگلستان کو روانگی کے قبل اور وہاں کے دوران قیام میں میں نے یہ دریافت کیا تھا کہ ہندوستان سے برطانیہ کے چلے جانے پر میری ریاست کو نوآبادیاتی درجہ عطا ہونا چاہیئے۔ میں نے اب تک ہمیشہ یہی محسوس کیا کہ ایک صدی سے زیادہ کے وفادارانہ اشتراک عمل کے بعد جب کہ میں نے انگریزوں پر کامل اعتماد کیا تھا مجھے یقیناً برطانوی دولت عامہ میں شریک رہنے کا موقع دیا جائے گا۔ دفعہ (۷) تو مجھے اس حق سے محروم کرتی ہے۔ مجھے اب بھی اُمید ہے کہ ملک معظم کی حکومت سے راست تعلقات قائم کرنے میں کوئی مشکل حائل نہ ہوگی۔ مجھے حال ہی میں یہ بتلایا گیا کہ یور اکسلنسی نے ایسے تعلقات کے قیام کے متعلق پارلیمنٹ سے اعلان کرانے کا وعدہ کیا ہے۔ میری توقع یہ ہے کہ ان تعلقات کے قیام کے بعد میری ریاست اور تاج برطانیہ کے درمیان قریبی اتحاد و یگانگت میں ترقی ہوگی کیوں کہ برسوں سے میں وفادارانہ طور پر تاج سے وابستہ ہوں۔

(۳) اس اثناء میں میں جدید مملکت سے عملی طور پر گفت وشنید جاری رکھنے کا وعدہ کرتا ہوں تاکہ عبوری دور میں کوئی مناسب اور قابل عمل انتظام ہو جائے جو ممکنہ طور پر ایک منظم

طریقہ سے دیسی ریاستوں اور ہندوستان کے مستقبل کی طمانیت کا ضامن ہو سکے۔

(۴) میں یور اکسلنسی سے یہ احتجاج کرنے میں حق بجانب ہوں کہ کس طرح میری ریاست کو اس کا قدیم حلیف نظر انداز کر رہا ہے اور ان بندھنوں کو توڑا جا رہا ہے جنھوں نے مجھے ملک معظم سے وابستہ رکھا تھا۔ مجھے اُمید ہے کہ یور اکسلنسی میرے اس خط کو ملک معظم کی حکومت کی خدمت میں روانہ فرمائیں گے۔ سر دست میں اس خط کو شائع نہیں کر رہا ہوں مبادا میرے قدیم احباب اور ساتھی دنیا کے سامنے رُسوا ہوں لیکن بعد میں اپنی ریاست کے مفاد میں اس کی اشاعت کے حق کو میں محفوظ رکھتا ہوں۔"

(حیدرآباد کا عروج وزوال صفحہ ۷۶ تا ۷۸)

حضور نظام کے اس خط سے جہاں انگریزوں کی مکاری اور فریب پر ضرب پڑتی ہے وہیں نظام کی وہ دلی خواہش بھی کھل کر سامنے آتی ہے جس کا خواب نظام دیکھ رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے انگریز جاتے ہوئے انھیں ایک آزاد خود مختار بادشاہ (His Majesty) کا مقام عطا کریں گے اور دولت مشترکہ کا رکن بنائیں گے۔ انگریزوں کی بے وفائی نے نظام کو بڑی ٹھیس پہنچائی اور ان کے وہ خواب چور چور ہو گئے جو کہ وہ آزاد بادشاہ کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس وقت نظام کو سر علی امام کا نوآبادکاری کے ذریعہ مسلم تناسب کے اضافہ کا منصوبہ، بہادر یار جنگ اور مجلس کے وہ مطالبے جو دفاع کے بنانے اور مقبوضات کے استرداد کے تھے یاد آ گئے ہوں گے اور ان کی اہمیت کا اندازہ ہوا ہوگا جو نظام کی بے عملی اور درباری سازشوں کے شکار ہو گئے تھے۔ ان اہم اُمور کی پذیرائی ہوتی تو نظام کو کف افسوس ملنا نہ پڑتا تھا۔

اب نظام کے لئے کوئی اور راستہ نہ تھا اس لئے از روئے دفعہ (۷) قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء، ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کو حیدرآباد کی آزادی کا فرمان جاری کیا اور یہ بھی اعلان کیا کہ وہ تو نہ ہندوستان میں اور نہ پاکستان میں شریک ہوں گے اور دونوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھیں گے۔ ہندوستان سے ہر معاملہ میں بوجہ ہمسائیگی تعاون کی پالیسی پر عمل پیرا ہوں گے۔ چنانچہ ایک وفد نواب چھتاری، علی یاور جنگ اور سر والٹر مانکٹن پر مشتمل ۱۱ر جولائی ۱۹۴۷ء گفت وشنید کے لئے دہلی روانہ

کیا۔ اس وفد میں بعد میں عوامی نمائندوں کے دو وزراء عبدالرحیم اور پنگل وینکٹ رام ریڈی شامل کئے گئے۔ گفتگو تین اُمور پر رہی (۱) استرداد برابر ہو (۲) حیدرآباد کو ڈومینین اسٹیٹ کا موقف حاصل ہو یعنی ہندوستان اور پاکستان کے مماثل آزاد مملکت کا موقف اور (۳) حیدرآباد ہندوستان میں شرکت کرے یا نہ کرے۔ ماونٹ بیٹن نے صاف کہہ دیا کہ استرداد برابر بغیر عوام کی مرضی کے ممکن نہیں۔ دولت مشترکہ میں شرکت جب تک ہندوستان یا پاکستان سے شرکت نہ ہو ممکن نہیں اور شرکت کے تعلق سے کہا کہ ہندوستان اور حیدرآباد کے مفاد میں ہوگا کہ اگر حیدرآباد تین اُمور یعنی دفاع، اُمور خارجہ اور مواصلات کی حد تک ہندوستان میں شرکت کرلے۔ وفد راضی نہ ہوا کہ اس سے حیدرآباد کی آزادی متاثر ہوتی ہے۔ ماونٹ بیٹن حیدرآباد کے جغرافیائی حدود کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ان تین اُمور کے شرکت پر اصرار کیا۔ لیکن وفد راضی نہ ہوا اور کہا کہ دباؤ ڈالا جائے تو حیدرآباد پاکستان میں شرکت پر غور کرے گا۔ ماونٹ بیٹن نے کہا کہ اس کا اختیار نظام کو ہے مگر وہ اس موقعہ سے فائدہ نہ اُٹھائیں گے تو آئندہ چار پانچ سال میں خطرناک نتائج سے دوچار ہوں گے۔ وفد راضی نہ ہوا۔ چنانچہ گفتگو نتیجہ خیز نہ رہی۔ وفد نے معاہدہ انتظامیہ جاریہ (Stand Still Agreement) کی خواہش کی جس کو حکومت ہند نے ٹالنے کی کوشش کی۔ ماونٹ بیٹن (جو اس وقت تاج برطانیہ کے نمائندہ وائسرائے تھے) نے ہندوستان کی کابینہ سے گفت وشنید کرنے مزید دو ماہ کی مہلت لی۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو برطانیہ کا اقتدار ختم ہوا اور ماونٹ بیٹن گورنر جنرل ہندوستان کے عہدہ پر فائز کئے گئے۔ اب وہ تاج برطانیہ کے نمائندے نہ تھے بلکہ حکومت ہند کے گورنر جنرل تھے اور حکومت ہند کے مشوروں پر کام کرنا تھا۔

”انگریز ۱۵ر اگست ۴۷ء کو ہندوستان سے دامن جھٹک کر چلے گئے اور ہندوستان میں ریاستوں کی فریاد سننے اور قانون آزادیٔ ہند کی دفعات کی خلاف ورزی پر احتجاج کرنے اور ریاستوں کو اس قانون کے تحت اپنے حقوق تسلیم کرانے کے لئے نہ کوئی نمائندہ تاج تھا اور نہ برطانوی قوت تھی جو ان کی دستگیری کرتی۔ چھوٹی ریاستوں کو تو چھوڑیئے بڑی بڑی ریاستیں تک حکومت ہند کی ریاستوں کے انضمام کی اسکیم سے لرزہ براندام تھیں۔ نظامِ دکن نے برطانوی دولت عامہ میں شریک رہ کر آزادی حاصل کرنے کے جتنے بھی جتن کئے

تھے جس کا قانوناً انھیں حق بھی حاصل تھا وہ سارے نقش برآب ثابت ہوئے۔

علی یاور جنگ نے اپنی کتاب میں اس ناکامی کا ایک بلیغ جملہ میں تجزیہ کیا ہے :

”حیدرآباد نے کابینی مشن کی پیراموٹنس والی یادداشت پر بڑا تکیہ کیا اور اس امر کو بالکل فراموش کردیا کہ آزادی یا تو میدان جنگ میں حاصل کی جاتی ہے یا اس کو تسلیم کرایا جاتا ہے صلح نامہ یا تو نوکِ خنجر سے لکھایا جاتا ہے یا گفت وشنید کے ذریعہ طے ہوتا ہے لیکن موخر الذکر صورت میں فریق ثانی کو بھی اپنی مرضی سے دستخط کرنی پڑتی ہے۔ جہاں تک رقبہ، آبادی، آمدنی، ذرائع، دیگر وسائل، اعزازات اور جنگی کارناموں کا من حیث المجموعہ تعلق ہے حیدرآباد کی حیثیت جو کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست تھی، ہندوستان کے مقابلہ میں بہر حال ایک بونے سے زیادہ نہ تھی جو ایک دیو سے صلحنامہ کی بابت گفت وشنید کررہا ہو۔“

حقیقت یہ ہے کہ طاقت وقوت اور وسائل کے اعتبار سے ہندوستان اور حیدرآباد کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ حیدرآباد قطعاً اس موقف میں نہیں تھا کہ اپنی شرائط منواسکتا یا ان پر اصرار کرتا۔ لیکن اس کے باوجود تقسیم ہند کے ہنگامہ خیز واقعات کے چوکھٹے میں ہندوستان کے نزدیک حیدرآباد کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ہندوستان کو سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ کہیں حیدرآباد پاکستان میں شرکت نہ کرلے کیوں کہ قانوناً اس کو یہ حق حاصل تھا اور گفت وشنید کے ابتدائی دور میں حیدرآباد کے وفد نے اس تاثر کو پیدا کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔

(حیدرآباد کا عروج وزوال صفحہ ۸۴ و ۸۵)

حکومت ہند کا معاندانہ رویہ اور معاہدہ انتظام جاریہ

دفعہ (۷) قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کے لحاظ سے تمام والیان دیسی ریاستوں کو قانونی حق حاصل تھا کہ وہ آزاد رہیں یا ہندوستان یا پاکستان میں شرکت کریں۔ سوائے کشمیر کے تمام دیسی ریاستیں ہندو اکثریت والی تھیں۔ اس کے باوجود وہ آزاد رہ سکتی تھیں۔ لیکن باوجود جہاں اکثر نے ہندوستان میں شرکت کر لی وہیں بیشتر پر دباؤ ڈال کر اور دھمکا کر شرکت کے لئے مجبور کیا گیا۔ کشمیر، جونا گڑھ اور حیدرآباد شریک نہیں ہوئے۔ جونا گڑھ نے پاکستان سے الحاق کر لیا تھا لیکن اُسے جس انداز سے ہڑپ کیا گیا وہ تاریخ کا ایک باب ہے۔ کشمیر اور حیدرآباد باقی رہ گئے تھے اور دونوں بھی اپنے آزادانہ موقف کو برقرار رکھنے کے لئے حق بجانب تھے۔ یہ امر بھی طے شدہ تھا کہ شرکت کے لئے دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔ ماونٹ بیٹن نے نظام کو یقین دلایا تھا کہ دباؤ یا معاشی ناکہ بندی حربوں سے کام نہیں لیا جائے گا۔ لیکن نظام کے ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کے آزاد رہنے کے اعلان کے ساتھ ہی دباؤ کے وہ حربے استعمال کئے گئے جس کے نہ کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

حکومت برطانیہ کے اعلان آزادی کے ساتھ ہی نہرو اور پٹیل نے دیسی ریاستوں کو ضم کرنے کے لئے سرعت کے ساتھ اقدامات شروع کر دیئے۔ گاندھی جی، نہرو، سردار پٹیل اور اکثر چوٹی کے رہنما حیدرآباد کو آزاد دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ نہرو اور پٹیل نے تو اپنی تقاریر میں سخت لب ولہجہ استعمال کر رکھا تھا۔ قانوناً حیدرآباد کو آزاد رہنے کا پورا حق تھا۔ یہاں تو قانون کو بالائے طاق رکھ کر طاقت کے بل بوتے پر بات ہو رہی تھی۔ حیدرآباد کو اپنی آزادی برقرار رکھنا ہو تو جنگ یا صلح جوئی کی پالیسی اختیار کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہندوستان کی برتر فوجی طاقت کے مقابلہ جنگ کا جوکھم مول لینا عقلمندی نہیں تھی صرف صلح جوئی کی پالیسی ہی موزوں تھی۔ جسے اختیار کیا گیا اور ایک وفد اسی غرض کے تحت ۱۱ر جولائی ۱۹۴۷ء کو بھیجا گیا جس کا تذکرہ سابقہ باب میں ہے۔ اسی مقصد کو آگے

بڑھاتے ہوئے نظام نے ۸؍اگست ۱۹۴۷ء کو ایک خط ماونٹ بیٹن کو تاج برطانیہ کے نمائندہ کی حیثیت میں روانہ کیا اور صلح نامہ کی پیشکش کی گئی جس کی رو سے دفاع کی حد تک فوجی امداد دینے، خارجی پالیسی ہندوستان سے ہم آہنگ کرنے اور رسل و رسائل کو کل ہند بنیاد پر لانے کے ساتھ مزید تین شرائط شامل تھیں (۱) اگر ہندوستان و پاکستان میں جنگ چھڑ جائے تو حیدرآباد غیر جانبدار رہے گا (۲) حیدرآباد کو بیرون ممالک ایجنٹ جنرل مقرر کرنے کے اختیار ہوگا (۳) اگر ہندوستان دولت مشترکہ سے علحدہ ہو تو حالات کا جائزہ لینے میں آزاد ہوگا۔ اور یہ بھی شکایت کی کہ حکومت ہند سوائے شراکت کے گفتگو کے لئے آمادہ نہیں اور اس عبوری دور میں ہندوستان معاہدہ انتظام جاریہ کرنے بھی راضی نہیں تھا جو کابینی مشن کی سفارشات کے مغائر تھا۔ ان سفارشات کی روشنی میں ہی حیدرآباد نے معاہدہ انتظامیہ جاریہ کا پیشکش کیا تھا۔ والیسرائے ہند نے جواب میں ۱۲؍اگست ۴۷ء کو یہ اطلاع کی کہ ۱۵؍اگست کو تاج برطانیہ کی نمائندہ کی حیثیت ختم ہوگی لیکن انھوں نے حیدرآباد کے مسئلہ کو گفت و شنید کے لئے دو ماہ کی مہلت لے رکھی ہے اس مہلت میں انھیں توقع ہے کہ کوئی سمجھوتہ ہوجائے گا۔

نظام، ماونٹ بیٹن پر بڑا تکیہ کئے ہوئے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ ان کے لئے بڑے کارآمد مددگار بنیں گے۔ نظام اس حقیقت کو نظر انداز کئے ہوئے تھے کہ حکومت ہند کی طاقت کا اصل مرکز نہرو اور پٹیل تھے اور ماونٹ بیٹن کو حکومت ہند کے مشوروں اور مزاج کے تحت کام کرنا تھا۔ ماونٹ بیٹن کو حکومت ہند نے محض دیسی ریاستوں کے روساء کو ہموار کرنے کی غرض سے گورنر جنرل کے عہدے پر فائز کیا تھا۔ جیسے جیسے دن گذرتے گئے نظام کو ماونٹ بیٹن سے بڑی مایوسی ہوتی گئی۔ نواب چھتاری صدراعظم تھے جو یوپی کے جاگیردار تھے۔ جب یہ حیدرآباد کے مفاد کے لئے دلچسپی لینے لگے تو اس وقت کے یوپی کے چیف منسٹر نے بالواسطہ وارننگ دی کہ بعض جاگیردار اور دیگر لوگ حکومت ہند کے مفاد کے خلاف کام کررہے ہیں انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی پاداش میں یوپی کے جیل کے دروازے کھلے رکھے گئے ہیں۔ نواب چھتاری نے بھی خاموشی اختیار کی۔ نظام کے مصاحب یا درباری جو دہلی میں تھے نظام کو صحیح حالات سے باخبر بھی نہیں رکھتے تھے۔

نظام نے حکومت ہند سے گفتگو اور صلح نامہ کے لئے جو وفد تشکیل دیا اس میں نواب چھتاری صدراعظم علی یاور جنگ اور سر والٹر مانکٹن (مشیر قانونی) تھے۔ بعد میں دو عوامی وزراء عبدالرحیم اور

پنگل وینکٹ رام ریڈی کو شامل کیا گیا۔ نواب علی یاور جنگ دربار کے سازشی گروہ کے سربراہ سمجھے جاتے تھے اور مسلمانوں کا ان پر بالکل اعتماد نہ تھا۔ نواب چھتاری اور سر والٹر مانکٹن غیر حیدرآبادی تھے۔ سر والٹر مانکٹن نظام کے قانونی مشیر تھے تاج برطانیہ و ماونٹ بیٹن سے خاص مراسم رکھتے تھے۔ وہ معاہدہ طے کرنے میں کافی معاون ہو سکتے تھے۔ علی یاور جنگ کانگریسی حلقوں اور اربابِ حکومت ہند سے قریب تھے۔

معاہدہ یا صلح نامہ جو بھی ہو وہ حیدرآباد کے مفاد میں ضروری تھا۔ یہ بڑا نازک اور اہم معاملہ تھا۔ ضروری تھا کہ عوامی جماعت کے صدر اور نمائندوں سے گفتگو کی جاتی انھیں اعتماد میں لیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ نظام، باب حکومت اور دربار کی یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ عوامی جماعت اتحادالمسلمین اس وقت جو حیدرآباد کے مفاد کے لئے اپنے تن من دھن کی بازی لگا چکی تھی اس کے صدر اور اہم نمائندہ سے گفتگو کر کے اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ اس کے صدر کو حالات سے آگاہی کے لئے وزیر عبدالرحیم پر ہی انحصار کرنا پڑتا تھا جو زیب نہیں دیتا تھا۔ اسی لئے قاسم رضوی نے جو اس وقت تک مجلس کے طاقتور رہنما بن گئے تھے وفد کے خلاف شدید ہنگامے کھڑا کئے۔ مجلس اتحادالمسلمین کو اعتماد میں لئے بغیر حیدرآباد کے مستقبل کے تعلق سے اہم فیصلے کر لینا نظام اور ان کی حکومت کی بڑی غلطی تھی۔

حیدرآبادی وفد ۸/ اگسٹ کو ملاقات کر کے نظام کے معاہدہ کا مسودہ لارڈ ماونٹ بیٹن کے حوالے کر کے جب حیدرآباد پہنچا تو قاسم رضوی نے سرکاری ارکان پر شدید نکتہ چینی کی اور غداری کا الزام لگایا کہ اگر عبدالرحیم اور پنگل وینکٹ رام ریڈی وفد میں نہ ہوتے تو حیدرآباد فروخت ہو گیا ہوتا۔ یہ الزام بھی لگایا کہ وہ خط جو نظام نے معاہدہ کے لئے لکھا تھا اس کی بجائے ایک دوسرا خط جس میں ملک سے غداری کی گئی تھی دیا جانے والا تھا۔ ان دو وزراء نے اس خط کو روک دیا۔ اس الزام کی کوئی بنیاد نہیں تھی یہ محض اس لئے عائد کیا گیا تھا کہ وفد کے انتخاب میں مجلس کا دخل نہیں تھا۔ صحافت میں اس اعلان کے بعد سرکاری اراکین بشمول صدر اعظم، سر والٹر مانکٹن اور علی یاور جنگ نے ۱۷/ اگسٹ ۴۷ء کو استعفیٰ دے دیا جب کہ وفد کو ۲۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو گفتگو کے لئے دہلی طلب کیا گیا تھا۔ وفد کے یہ اراکین نے اس وقت تک استعفے واپس نہیں لیا جب تک نظام نے اپنے فرمان کے ذریعہ اعتماد کا

اعلان نہیں کیا اور حالات سے ماونٹ بیٹن کو واقف نہیں کرا دیا۔ قاسم رضوی نے نواب چھتاری پر دباؤ ڈالا کہ دستوری اُمور کا قلمدان علی یاور جنگ کی بجائے معین نواز جنگ کو دیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ علی یاور جنگ کو وفد سے ہٹایا جائے۔ نظام نے وفد کی ہئیت ترکیبی ہی بدل ڈالی وفد میں نواب چھتاری، سر والٹر مانکٹن اور سر سلطان کو شامل کیا گیا۔ اس طرح قاسم رضوی کو بڑی سبکی ہوئی۔ اس وفد نے دہلی جا کر حکومت ہند اور ماونٹ بیٹن سے گفتگو کی اور یقین دلایا کہ نظام کو اُمور خارجہ، دفاع اور مواصلات کی حد تک ہندوستان میں شمولیت کے لئے آمادہ کرلیا گیا ہے بشرطیکہ اس کی صراحت معاہدہ میں کی جائے اور اس معاہدہ کو شرائط شرکت (Instrument of Accession) کی بجائے معاہدہ مفاہمت یا دوستی (Article of Association) رکھا جائے۔ مسلسل (۳) ماہ گفتگو کے بعد بھی نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل شراکت کے لئے مصر تھے ان کا استدلال تھا کہ دوسری ریاستوں سے ہٹ کر حیدرآباد سے اس قسم کے معاہدہ سے دوسری ریاستوں کے لئے یہ شکایت کا موقعہ ملے گا کہ شرکت نہ کرنے والی ریاستیں فائدہ میں رہیں۔ لیکن اس وقت حکومت ہند شمالی ہند میں کئی مسائل سے دوچار تھی۔ فوج کا بڑا حصہ شمالی ہند کے علاقے میں تھا اور جنوب میں فوری کوئی فوج متعین کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جونا گڑھ کی وجہ سے پاکستان سے لڑائی کا اندیشہ تھا کشمیر کا معاملہ بھی الجھا ہوا تھا۔ اسی لئے وی۔ پی۔ مینین[1] نے سردار پٹیل کو مشورہ دیا کہ ان خراب حالات کے پیش نظر حیدرآباد سے اُلجھنے کی بجائے کوئی عارضی معاہدہ کرلیا جائے جس سے انضمام کی راہیں نکلتی ہوں اس طرح تو کچھ مدت کے لئے جنوب سے اطمینان کا سانس لیا جاسکے گا۔ چنانچہ سردار پٹیل راضی ہوگئے۔ حکومت ہند نے ان حالات میں حیدرآباد سے اُلجھنے کی بجائے مذاکرات جاری رکھتے ہوئے ایک عارضی معاہدہ جسے معاہدہ انتظام جاریہ (Stand Still Agreement) کہا جاتا ہے طے کرلینا موزوں سمجھا تاکہ جنوب سے کچھ مدت کے لئے اطمینان کا سانس لیا جاسکے[2]۔ چنانچہ اس ضمن میں

---

[1] وی۔ پی۔ مینین (ملاباری) ۱۹۱۴ء میں ہوم ڈپارٹمنٹ کی معمولی جائیداد سے ملازمت کی ابتداء کی۔ اپنی قابلیت کی وجہ سے ترقی کرتے ہوئے آزادی کے وقت اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل نائب وزیر اعظم ہند جن کے تحت اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ تھا ان کے بڑے اعتماد کے شخص تھے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کے ساتھ دیسی ریاستوں کے انضمام میں بڑی خدمات انجام دیں۔

[2] Integration of the Indian States صفحہ 326-327 اور Autocracy to Integration صفحہ 186-187

اوائل اکتوبر ۴۷ء سے تیسرے ہفتہ تک کئی مسودات تیار کیے گئے ۔آخر کار حکومت ہند کے اتفاق سے ایک معاہدہ کا مسودہ اور اس کے ساتھ دو خطوط جس کی منظوری ماونٹ بیٹن نہرو اور پٹیل نے دی تھی ۲۲/اکتوبر کو حیدرآباد کے وفد کے حوالے کیے گئے جو دہلی سے اس وعدہ کے ساتھ واپس ہوا کہ اس معاہدہ پر نظام کے دستخط لے کر وہ ۲۶/اکتوبر بروز یکشنبہ دہلی آئے گا۔

یہ مسودے حیدرآباد آتے ہی نظام کو پیش کیے گئے ۔نظام نے وزراء کونسل کی رائے طلب کی۔وزراء کی کونسل نے تین دن تک یعنی ۲۳/اکتوبر تا ۲۵/اکتوبر غور کیا اور تین کے مقابلہ چھ ارکان کی تائید سے انھیں منظور کیا اور اسی شام نظام کو کونسل کی رائے سے مطلع کیا گیا۔نظام نے کونسل کی رائے سے اتفاق کیا لیکن معاہدہ پر دستخط دوسرے دن کرنے کا وعدہ کیا جب دوسرے دن وفد نے یاد دہانی کرائی کہ وہ ۲۷/اکتوبر کی صبح دہلی جانے والا ہے۔نظام نے دوسرے دن بھی دستخط کو ٹال دیا اور وفد کے دہلی جانے کی تاریخ ۲۸/اکتوبر مقرر ہوئی۔

ٹال مٹول کی وجہ یہ کہی جاتی ہے کہ ایک وفد مجلس کی جانب سے قائداعظم کے پاس معاہدہ کے تعلق سے مشورہ لینے کے لئے بھیجا گیا تھا جو اس وقت تک واپس نہیں ہوا تھا۔وفد دوسرے دن شام واپس ہوا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قائداعظم نے معاہدہ کو اس کی موجودہ شکل میں منظور نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔نظام،حیدرآباد کے آزاد رہنے کے حامی تھے اور مجلس بھی یہی چاہتی تھی۔معاہدہ کا مسودہ جو نظام کی منظوری کے لئے بھیجا گیا تھا اس میں حکومت کے اہم معاملات یعنی دفاع ،اُمور خارجہ اور رسل ورسائل حکومت ہند کے حوالے کرنے کی تجویز تھی اس سے حکومت ہند کی نہ صرف ریاست میں مداخلت ہوتی تھی بلکہ ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے دروازے بھی کھل رہے تھے۔ایک مرتبہ معاہدہ پر دستخط ہو جائیں تو پھر حیدرآباد کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا اور انگریز تو ہاتھ اُٹھا ہی چکے تھے۔ان ہی خدشات کے تحت معاہدہ کو ٹالا جارہا تھا۔اس موقعہ پر معاہدہ کو روکنا یا ٹالنا ہو تو یہ کام مجلس ہی کرسکتی تھی۔[۳] اسی لئے غالباً قاسم رضوی نے نظام کے اشارہ پر ایک ہنگامہ کھڑا کیا جس کو وی۔پی۔مینین ایک جذبات انگیز ڈرامہ[۴] (Melodrama) کہا۔

---

[۳] Autocracy to Integration صفحہ 188-191

[۴] Integration of the Indian States صفحہ 327

تین وزراء جنھوں نے معاہدہ کے خلاف رائے دی تھی وہ عبدالرحیم، معین نواز جنگ اور پنگل وینکٹ رام ریڈی تھے جو مجلس کی نمائندگی کرتے تھے۔ وزراء کی کونسل کے اجلاس کے بعد مجلس اتحادالمسلمین کی عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں معاہدہ کا جائزہ لیا گیا اور یہ نتیجہ نکالا گیا کہ یہ معاہدہ بھی وہی معاہدہ شراکت (Instrument of Accession) ہے جو دوسری ریاستوں سے حاصل کئے گئے تھے اور یہ شراکت غلامی کے سوا اور کچھ نہیں (اس معاہدہ کی تفصیلات دستیاب نہیں یا کسی کتاب میں لکھے نہیں گئے تاکہ تفصیلات کا علم ہو سکے۔ صرف یہی کہا گیا کہ یہ معاہدہ شراکت تھا)۔ عاملہ کے اجلاس کے بعد ہی رضا کاروں کو شاہ منزل (صدر اعظم کی قیام گاہ) اور ہوائی اڈہ پر جمع ہونے کا حکم ہوا۔ راتوں رات رضا کار شاہ منزل، ارکان وفد کے گھروں اور ہوائی اڈہ پر جمع ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ منزل پر دس ہزار کا مجمع تھا۔ پولیس موجود نہ تھی بڑا عجیب منظر تھا۔ بعد نماز فجر مجمع کو اطلاع دی گئی کہ جو معاہدہ بعد دستخط دہلی لے جایا جا رہا تھا وہ حیدرآباد کے مفاد کے مغائر تھا اور اس کے پیچھے سازش تھی۔ مجمع نظم وضبط کے ساتھ پرامن رہا اور اس وقت تک واپس نہیں ہوا جب تک کہ یہ اعلان نہیں کیا گیا کہ وفد دہلی نہیں جائے گا۔ قاسم رضوی نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا کہ انھیں بڑی دیر سے معاہدہ کی تفصیلات کا علم ہوا جب کہ دوسرے دن صبح وفد یہ معاہدہ لے کر دہلی جانے والا تھا اسی لئے یہ ہنگامی صورت پیدا ہوئی۔ آپ نے نظم وضبط اور اتحاد کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ قابل تحسین ہے جس کی وجہ سے وفد کی روانگی ملتوی ہو گئی۔ اب پریشانی کی بات نہیں اور قریب عرصہ میں ایک باوقار اعلان کا امکان ہے۔ وفد کا اس طرح سے جانا رُک گیا۔ حکومت حیدرآباد نے ۲۸/ اکتوبر کو اعلان کیا کہ حیدرآباد کا فیصلہ کسی بھی یونین (ہندوستان یا پاکستان) میں شرکت کا نہیں ہے۔

نظام نے ماونٹ بیٹن کو ٹیلی گرام دیا کہ بعض ناگزیر حالات کی وجہ وفد مقررہ تاریخ پر نہ آسکا۔ ۳۰/ یا ۳۱/ اکتوبر کو آئے گا۔ نظام نے ۲۸/ اکتوبر کو ارکان وفد سے کنگ کوٹھی میں ملاقات کی اور دوران گفتگو قاسم رضوی کو بھی طلب کیا اور دریافت کیا تو قاسم رضوی نے کہا کہ معاہدہ حیدرآباد کے خاتمہ کے مماثل ہے۔ وفد تبدیل کیا جائے اور از سر نو گفتگو کی جائے۔ جب ان سے اصرار کیا گیا کہ کچھ تو وجہ بتائیں قاسم رضوی نے کہا کہ اس وقت حکومت ہند کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں وہ کشمیر کی جنگ میں ملوث اور پریشان ہے (کشمیر میں قبائلیوں نے ۲۳/ اکتوبر کو حملہ کیا تھا اور ہندوستانی فوج

۲۶/ اکتوبر ۴۷ء کو روانہ کی گئی تھی) اس لئے یہ موقع ہے کہ مطالبات منوا لئے جائیں۔ وفد کے ارکان نے قاسم رضوی کی باتوں کو خیالی اور غیر صحیح قرار دیا۔ جب وفد کے ارکان نے دیکھا کہ نظام قاسم رضوی کی طرف توجہ دے رہے ہیں تو نواب چھتاری، سر والٹر مانکٹن اور سر سلطان احمد مستعفی ہو گئے۔ ان کی جگہ دوسرا وفد نواب معین نواز جنگ، عبدالرحیم، پنگل وینکٹ رام ریڈی پر مشتمل تھا تشکیل دیا گیا۔

اسی دوران نظام نے حکومت ہند کو ایک دھمکی آمیز خط لکھا کہ معاہدہ طے نہ ہو تو وہ پاکستان سے معاہدہ کر لیں گے۔ اس وقت حکومت ہند واقعتاً کشمیر پر حملہ کی وجہ سے پریشان تھی موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر بجائے معاہدہ انتظام جاریہ کے ایک مبسوط مستقل معاہدہ کر لیا جاتا بڑی فراست ہوتی۔ نظام نے اس اہم موقع سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔

قاسم رضوی مجلس اتحاد المسلمین جیسی ایک مضبوط تنظیم کے سربراہ تھے۔ ان سے اور ان کے ذمہ داروں سے ایسے نازک موقع پر بڑی فراست اور ہوشمندی کی توقع تھی۔ اس اہم موقع سے فائدہ اُٹھا کر دانشمندانہ اقدام کرتے ہوئے مستقل معاہدہ کی راہیں ہموار کرتے اور نظام کو غیر دانشمندانہ اقدام سے روکتے تو قیادت کا حق ادا ہوتا۔ قوم اس نازک لمحہ میں مصیبت سے نکل آتی۔ لیکن ان کے منفی اور غیر دانشمندانہ رویے نے ہونے والے معاہدہ کو نہ صرف روکا بلکہ حکومت ہند کو شکوک میں ڈال دیا جو بعد میں چل کر نقصان کا سبب بنا۔ چنانچہ جب نیا وفد ۳۱/ اکتوبر ۴۷ء کو دہلی پہنچا تو اس کے ساتھ سرد مہری کا برتاؤ کیا گیا۔ ماونٹ بیٹن کی برہمی کا یہ عالم تھا کہ وہ وفد کو اسی جہاز سے واپس کر دینا چاہتے تھے۔ پہلا وفد جو قابل ہستیوں (نواب چھتاری، سر والٹر مانکٹن اور سر سلطان احمد) پر مشتمل تھا حکومت ہند کے پاس وقار اور وزن رکھتا تھا دوسرے وفد کا وہ موقف نہیں تھا۔ اس لئے حکومت ہند نے وہ اہمیت نہیں دی جو کہ اس نے پہلے وفد کو دی تھی۔ دوسرا وفد جو معاہدہ لے گیا تھا اس میں سابقہ مسودہ کے مقابلہ میں معمولی تبدیلی تھی۔ ماونٹ بیٹن نے صاف کہا کہ وہ سابقہ مسودہ میں کسی قسم کی تبدیلی کے لئے تیار نہیں۔ آخرکار معاہدہ انتظام جاریہ ۲۸/ نومبر ۱۹۴۷ء کو حکومت ہند اور نظام کے درمیان تکمیل پایا۔ معاہدہ کی تفصیلات ذیل میں درج ہیں۔

تمہید میں حکومت ہند اور نظام نے اس مقصد اور پالیسی کا اعلان کیا کہ دونوں حکومتیں باہمی

مفاد کے لئے مل کر اشتراک، تعاون اور خوش دلی سے کام کریں گی۔ معاہدہ پانچ دفعات پر مشتمل تھا۔

دفعہ (۱) نئے انتظامات یا معاہدات تک ان سارے مشترکہ معاملات اور انتظامی اُمور بشمول اُمور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے ضمن دونوں حکومتوں کے تعلقات ان ہی بنیادوں پر قائم رہیں گے جو تاج برطانیہ اور نظام کے درمیان ۱۵ اگست ۴۷ء سے قبل تھے۔ مگر حکومت ہند کو یہ حق نہ ہوگا کہ اندرونی شورش اور امن کی برقراری کے لئے فوج روانہ کرے یا فوجی امداد دے۔ بجز زمانہ جنگ کے حکومت ہند کی کوئی فوج نہ رکھے گی۔

دفعہ (۲) دونوں حکومتوں نے اتفاق کیا کہ اس معاہدہ کی بہتر عمل آوری کے لئے حیدرآباد اور دہلی میں اپنے ایجنٹ جنرل مقرر کریں گے انھیں تمام سہولتیں مہیا کریں گے۔

دفعہ (۳) حکومت ہند کسی امر میں پیراموئنٹسی (اقتدار اعلیٰ) کے اختیارات استعمال نہیں کرے گی

دفعہ (۴) کوئی نزاع جو اس معاہدہ یا ایسے معاہدات اور انتظامات کے تعلق سے پیدا ہو تو تصفیہ ثالثی کے سپرد کیا جائے گا۔

دفعہ (۵) معاہدہ فی الفور نافذ العمل ہوگا اور ایک سال تک نافذ العمل رہے گا۔

معاہدہ کے ساتھ جو خطوط روانہ کئے گئے تھے اس میں نظام نے ادعا کی کہ وہ کسی طرح مستقل حیثیت میں اپنی آزادی کو متاثر نہیں کر رہے ہیں۔ البتہ چند معاملات میں معاہدہ تک اپنے اختیارات کے استعمال کو معطل کر رہے ہیں۔ غیر ممالک سے سفارتی اور تجارتی نمائندوں کا تقرر ریذیڈنسی کی واپسی، اسلحہ کی فراہمی، حیدرآباد سے ہندوستان کی فوج کی واپسی، چھاونیوں کا استرداد، کرنسی، سکہ، ٹپہ وغیرہ کے حقوق کا استقرار بھی شامل تھے۔

اگر معاہدہ انتظام جاریہ وہی تھا جو اُوپر تحریر کردہ ہے تو نظام کا ٹال مٹول کرنا اور قاسم رضوی کا طوفان برپا کرنا بے کار تھا۔ جو بعد میں چل کر حیدرآباد کے لئے نقصان دہ بنا۔ میری رائے میں اسی معاہدہ کو بجائے انتظام جاریہ کے مستقل معاہدہ کی شکل دی جاتی تو بہتر تھا چوں کہ حکومت ہند سے مزید مراعات ملنا دشوار تھا۔ حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سابقہ وفد کے ذریعہ ان ہی اجزاء پر مشتمل مستقل معاہدہ حاصل کر لینا دشوار نہ تھا، حاصل کر لیا جاتا تو حیدرآبادی وفد کو مستقل معاہدہ کے لئے جو پاپڑ آئندہ بیلنے پڑے ضرورت نہ ہوتی۔

سردار ولبھ بھائی پٹیل ۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قانون ساز کونسل (Constituent Assembly) میں معاہدہ معہ خطوط پیش کئے جو اس وقت موجودہ پارلیمنٹ کی جگہ کام کررہی تھی اور تقریر کرتے ہوئے کہا کہ حکومت ہند حیدرآباد کی مشکلات سے واقف ہے اور معاہدہ مختصر مدت کے لئے ہی سہی بغیر کسی دباؤ کے آپسی مفاہمت کے ذریعہ حاصل ہوا اور توقعات کا اظہار کیا کہ آئندہ ایک سال میں مزید تعلقات قریب ہوں گے اور شمولیت کی راہیں ہموار ہوں گی۔ مزید کہا کہ حیدرآباد پاکستان میں شمولیت نہیں چاہتا۔ ماونٹ بیٹن کی بڑی تعریف وتوصیف کی۔ نہرو نے کہا کہ کم ازکم ایک سال کے لئے تو سکون ملے گا۔

سرحدی شورشیں، معاشی ناکہ بندی اور مبالغہ آمیز پروپگنڈہ

معاہدہ انتظام جاریہ کے وقت حکومت ہند پر خلوص اور نیک نیت نہیں تھی۔ وہ صرف اپنے مفاد اور مقصد کے تحت اجرائے کار چاہتی تھی چوں کہ اس کی (۳) لاکھ فوج پاکستانی سرحد اور کشمیر میں اُلجھی ہوئی تھی اس لئے مزید کوئی محاذ کھول کر اُلجھنوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ معاہدہ انتظام جاریہ کے ذریعہ ایک سال کی مہلت مل گئی تھی۔ حکومت ہند پر خلوص ہوتی اور مفاہمت و خیرسگالی جذبہ سے کام کرتی تو حیدرآباد کے لئے کوئی مسائل پیدا نہ ہوتے اور دوسو سال سے زیادہ قدیم ہندو مسلم بھائی چارہ قائم رہتا۔

ادھر حیدرآباد اپنے کمزور موقف کی بناء پر دوستانہ ماحول میں رہنا چاہتا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی طاقت بڑھا کر وقت ضرورت کھڑا ہونے کے موقف میں آنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے مہلت کی ضرورت تھی اور ایک سال کی مدت معاہدہ سے فائدہ اُٹھا کر وہ اپنی طاقت بڑھانا چاہتا تھا۔

معاہدہ کے مطابق کے۔ یم۔ منشی کو حکومت ہند نے اپنا ایجنٹ جنرل نامزد کیا۔ وہ جب حیدرآباد آئے تو اپنے آپ کو ریذیڈنٹ کا قائم مقام سمجھا اور ریذیڈنسی میں ٹھہرنے کا مطالبہ کیا۔ اس پر ایک جھگڑا کھڑا ہوا لیکن لائق علی نے اس کو حل کرلیا اور منشی کو بلارم ریذیڈنسی کے قریب ایک شاندار محل ''دکن ہاوز'' (جو برٹش کمانڈر کی قیام گاہ تھی) رکھا گیا۔ کے۔ یم۔ منشی نے اس کا نام تبدیل کر کے ''دکھشن سدن'' رکھا اور ابتداء ہی شرارتوں سے ہوئی۔ منشی بمبئی ہائیکورٹ کے ایڈوکیٹ تھے اور ۱۹۳۷ء میں صوبہ بمبئی کے وزیر داخلہ بھی رہ چکے تھے۔ مخالف مسلم رویہ سے ان کا کردار داغدار تھا۔ سردار پٹیل کی قربت کی وجہ سے ایجنٹ جنرل نامزد ہوئے تھے۔ حیدرآباد آ کر نظام اور لائق علی پر ریذیڈنٹ جیسی دھونس جمانے کی کوشش کی اور ناکام رہے۔ سرکاری حلقوں سے مایوس ہوکر عوامی حلقوں میں اثر بڑھانے لگے اور مقامی کانگریس کے درپردہ مشیر بھی بن گئے۔ کانگریس ان کے

اشاروں پر کام کرنے لگی۔ ایجنٹ جنرل کا دفتر اور قیام گاہ کانگریسیوں اور دیگر شر پسندوں کی آماجگاہ بن گئی۔ ماونٹ بیٹن اور نہروان کی حرکات سے ناخوش ہو کر ہٹانا چاہتے تھے لیکن سردار پٹیل کی سرپرستی کی وجہ سے عہدہ پر برقرار رہے۔ مذموم سیاسی حرکتیں جیسے شرارت، رخنہ اندازی، جھوٹا پروپگنڈہ اور حکومت حیدرآباد کو اندرون و بیرون ملک بدنام کرنے کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ ساری تخریبی سرگرمیاں ان ہی کے اشارہ پر ہوتی تھیں۔ ان کی قیام گاہ دہلی کے لئے جاسوسی اور خفیہ اطلاعیں پہنچانے کا اہم مرکز بن گئی تھی۔

کے۔ یم۔ منشی اپنی کتاب (The End of an Era) میں نظام کے دربار سے تعلق رکھنے والے اصحاب کا تذکرہ کیا ہے جو ان سے ربط ضبط رکھے ہوئے تھے اور خفیہ ملاقات کرتے تھے۔ منشی حیدرآباد کی فوج کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو ''خاموش آواز'' سے تعبیر کیا ہے (نام نہیں بتایا) جو اس سے ملتا تھا اور فوج کے سارے راز وہ انھیں دیتا تھا۔ العیدروس اور بیگم عیدروس سے تو ان کے بڑے مراسم تھے۔ منظور جنگ کے میل جول کا انھوں نے کئی بار تذکرہ کیا ہے۔ ہوش یار جنگ کے بارے میں یہاں تک لکھا کہ ایک دفعہ رات کو وہ ننگے سر کرتے پاجامے میں ملازمین کے آنے جانے کے راستہ سے ان کے گھر آئے۔ ان سب کے ربط ضبط اور تعلقات آخر کس لئے تھے خفیہ جاسوسی کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔ ظہیر احمد جو اس وقت کے وزارت خارجہ کے سکریٹری تھے ان کے تعلق سے لکھا کہ وہ ۲۸ رمئی کو ملاقات کے لئے آئے اور بھارت اور حیدرآباد کے درمیان مصالحت کروانے کی درخواست کی ایل۔ این۔ گپتا کا جو اس وقت معتمد مالیات کے کلیدی عہدے پر تھے منشی سے ربط تھا۔ کرنل ڈاکٹر واگھرے، راجہ بہادر آئینگار وغیرہ ان سے ملنے والوں میں تھے۔ غرض کے۔ یم۔ منشی نے حیدرآباد میں جاسوسی کے وہ سب اہم فرائض انجام دیئے جس کی وجہ سے حکومتِ حیدرآباد کے سارے منصوبوں کے راز حکومت ہند کو مل گئے اور حکومت ہند کو حیدرآباد کے زیر کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

اس کے برخلاف ادھر دہلی میں حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل زین یار جنگ تھے۔ جو درباری سازشی گروپ کے ایک رکن تھے اور کانگریس سے قریب تھے۔ یہ ایجنٹ جنرل حیدرآباد حکومت کے لئے کوئی مناسب خدمت انجام نہ دے سکے۔ دہلی سے کوئی مواد یا کارآمد اطلاع نہ پہنچا سکے۔ یہاں

تک کے حکومت ہند کی فوجی تیاریوں کے علم کے باوجود صحیح اطلاع دینے سے گریز کیا (جس کا تذکرہ بعد کے باب میں ہوگا) اور حکومت ہند کو حیدرآباد کے راز سے واقف کرانے میں ممد و معاون بنتے رہے اور اپنے شخصی تعلقات نہرو اور پٹیل سے ہموار کرتے رہے۔ مشتاق احمد خاں لکھتے ہیں کہ ان کے کراچی پر تقرر کے بعد جب دہلی میں ان سے ملاقات رہی تو وہ لایق علی، ان کی حکومت اور مجلس کے خلاف زہر اُگل رہے تھے۔ حیدرآباد کی حکومت کا نمائندہ بجائے حیدرآباد کی حکومت کی پالیسی کی تائید کرتا اور اسی پالیسی کی پذیرائی کے لئے کام کرتا خلاف میں زہر اُگل رہا تھا۔ لایق علی کو انھوں نے اس شخص کے کردار سے واقف کروایا۔ لایق علی کی یہ بڑی فاش غلطی تھی جس کا انھیں بہت بعد احساس ہوا۔

حیدرآباد ایجنٹ جنرل پاکستان (مشتاق احمد خاں) کا تقرر معاہدہ انتظام جاریہ کے قریب چار ماہ بعد ہوا۔ ۱۰/اپریل ۴۸ء سے کام شروع ہوا۔ باوجود تاخیر کے کراچی کے اس مشن نے بہت سے کام انجام دیئے جب کہ دہلی کا مشن خاموش رہا۔

معاہدہ انتظام جاریہ کے بعد حیدرآباد کو زیر کرنے کے لئے حکومت ہند نے جو ہتھکنڈے استعمال کئے ان میں سرحدی شورش، معاشی ناکہ بندی، مبالغہ آمیز پروپگنڈہ اور مقامی ہندوؤں کو حکومت کے خلاف اُکسانا جیسے اقدامات شامل تھے۔

اسٹیٹ کانگریس پر جو امتناع ۱۹۳۸ء میں عائد کیا گیا تھا ماہ جولائی ۱۹۴۷ء کو اُٹھالیا گیا تا کہ ہندو بھی حیدرآباد کی آزادی میں شایان شان حصہ لیں۔ لیکن کانگریس نے اس کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر حیدرآباد کو ہندوستان میں شرکت کرنے کا مطالبہ کیا بصورت دیگر راست اقدام کرنے کی دھمکی دی۔ ایک ورکنگ کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے حیدرآباد کے متصلہ صوبوں کا دورہ کر کے سیول نافرمانی کی تحریک کے انتظامات کئے اور اوائل اگسٹ ۴۷ء میں ذمہ دار لیڈر روپوش ہو گئے۔ تینوں ذیلی مراکز متعلقہ صوبوں کو منتقل کئے گئے۔ علاقہ تلنگانہ کی شاخ وجے واڑہ، مہاراشٹرا کی منماڑ اور کرناٹک کی شاخ گدک منتقل کی گئی۔ ان کے علاوہ اطراف حیدرآباد، بمبئی، مدراس، ناگپور، شولاپور اور دیگر شہروں میں مراکز قائم کئے گئے۔ جہاں سے مقامی زبانوں میں حیدرآباد کے خلاف پمفلٹ اور مقامی اخباروں کو اشتعال انگریز خبریں فراہم کی جاتی تھیں اور لوگوں کو حیدرآباد کے خلاف اُکسایا جاتا

تھا۔ اس کے علاوہ ریڈیو، ٹرانسمیٹر بھی تھے جس کے ذریعہ نظام کے خلاف بغاوت کے لئے عوام کو اُبھارا جاتا تھا۔ پروپگنڈہ میں عورتوں کی عزت ریزی، مندروں کی بے حرمتی، قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ شامل تھی۔

سیول نافرمانی تحریک ۷/ اگست ۴۷ء سے شروع ہوئی۔ سوامی رامانند تیرتھ صدر کانگریس نے خود کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرفتاری کے لئے پیش کیا۔ ماہ اکٹوبر میں تشدد کا راستہ اختیار کیا گیا۔ محاصل نہ دینے، ملازم سرکار کو مستعفی ہونے، طلباء کو مدارس اور کالج چھوڑنے وکلاء کو عدالتوں میں کام نہ کرنے جیسے اقدامات شروع کئے گئے۔ ہندو رضا کاروں کو آتشیں اسلحہ کی ٹریننگ دی جانے لگی۔ نومبر میں سرحدی مواضعات پر شورشیں شروع ہوئیں۔ کروڑ گیری چوکیوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا جا کر ایک ہزار چوکیوں میں سے سات سو کو بے کار کیا گیا۔ ان حملوں میں مسلح پولیس بھی تھی جو جدید ترین فوجی اسلحہ اسٹن گن، رائفل، ریوالور اور دستی بم استعمال کرتی تھی۔ ان اسلحہ کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ جوابی حملہ کے بعد یہ اسلحہ چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ ریل گاڑیوں پر حملے ہوتے اور کئی مسلم مسافر قتل کئے جاتے۔ حد یہ ہوئی کہ خود نظام پر حیدرآباد کی شاہ راہ عابڈس پر ۴/ ڈسمبر ۴۷ء پر بم پھینکا گیا۔ آئے دن سرحدی شورشیں بڑھتی گئیں اور حکومت کے لئے امن و امان کا قائم رکھنا ضروری ہو گیا۔ چاروں طرف سے ہندوستان سے گھری ہوئی سلطنت حیدرآباد کی طویل سرحد جو تقریباً (۲۰۰۰) میل تھی، شورشوں پر قابو پانا مشکل ہونے لگا تو حکومت نے رضا کاروں کو مسلح کرنا چاہا تا کہ یہ پولیس اور فوج کے لئے امداد کا کام کرسکیں۔ قاسم رضوی نے رضا کار تنظیم میں جان ڈالی اور قلیل عرصہ میں سارے حیدرآباد میں رضا کار تنظیم کو منظّم کیا جو اگرچہ سرحد پار کے حملہ آوروں کے مقابل مسلح نہ تھے۔ یہ صرف بھالے، برچھے اور کہیں کہیں بھرمار بندوقوں سے مسلح تھے۔ جب یہ میدان عمل میں آئے اور مسلح حملوں کو پسپا کرنے لگے تو رضا کاروں کے خلاف شدید پروپگنڈہ کیا گیا اور اسی کو بنیاد بنا کر آخر کار ریاست پر فوجی کارروائی کرنے کا جواز بھی نکالا گیا۔ تھوڑی ہی مدت میں ان رضا کاروں نے سرحدی شورش پر کنٹرول کر لیا تھا جو ایک بڑا کارنامہ تھا۔

اخبارات اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع استعمال کرتے ہوئے رضا کاروں اور حکومت حیدرآباد کے خلاف شدید مخالفانہ پروپگنڈہ کے ذریعہ عوام کے جذبات کو اُبھارا گیا۔ بعض ہندو لیڈر

اربابِ حکومت کے بیانات پر تیل چھڑکنے کا کام انجام دیتے تھے۔ پروفیسر رنگا، پرکاشم چیف منسٹر مدراس، ارونا آصف علی، رام منوہر لوہیا، جے پرکاش نارائن جیسے قائدین نے زہر افشانی کرتے ہوئے حیدرآباد پر فوج کشی کا مطالبہ کیا۔ ان پر تشدد حملوں کا ثبوت ذمہ دار کانگریسی لیڈر رام چندر راؤ کے بیان سے مل جاتا ہے جو اخبار میزان ۴/ اکتوبر ۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔

''حیدرآباد پر تشدد حملوں کو تین مرحلوں میں تشکیل دیا گیا تھا جن کا مقصد یہ تھا کہ حیدرآباد پر ہندوستان کے فوجی حملوں کے لئے زمین ہموار کی جائے۔ پہلے مرحلے میں ہم نے (۹۰۰۰) رضا کار حیدرآباد کے اندر بھیجے جنھیں تشدد آمیز کارروائیوں کے ساتھ قید و بند کو قبول کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ تین ماہ تک اس پروگرام پر عمل رہا۔ دوسرے مرحلے میں ان ارضی موانعات کو دور کرنے کی کوشش کی گئی جو ہندوستان اور حیدرآباد میں مصنوعی طور پر حائل تھے یعنی کروڑگیری کے ناکوں کو تاراج کرنا۔ مدراس اور بمبئی کے علاقوں میں متعدد ایسے کیمپ قائم کئے گئے جہاں رضا کاروں کی فوجی تربیت کا انتظام کیا گیا تھا۔ حیدرآباد کی (۱۵۰۰) میل طویل سرحد پر (۷۵۰) کروڑگیری کے ناکے قائم تھے جن میں سے (۵۰۰) کو بالکل مسمار کر دیا گیا۔ جدوجہد کا آخری مرحلہ تخریبی کارروائیوں اور رسل و رسائل کے ذریعوں کے انہدام پر مشتمل تھا۔ اس کام کے لئے ہم نے (۳۰۰۰) کیڈیٹس کو مکمل طور پر تربیت دے کر حیدرآباد کے اضلاع میں پھیلا دیا تھا۔ چنانچہ صرف ایک دن یعنی ۲۶/ فبروری ۱۹۴۸ء کو (۸۲) مقامات پر رسل و رسائل کو منقطع کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد ہندوستان سے کٹ گیا۔''

(حیدرآباد کا عروج و زوال صفحہ ۱۱۵)

حکومت ہند کے تمام ذرائع ابلاغ ریڈیو، اخبارات حتی کہ بیرون ملک میں ہندوستانی سفارت خانوں نے حیدرآباد کے خلاف مبالغہ آمیز پروپگنڈہ میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اس پروپگنڈہ سے متاثر ہوکر جب بیرونی اخبارات کے نمائندے حیدرآباد آئے اور حالات کا جائزہ لیا تو پروپگنڈے کو غلط پایا اور دونوں فرقوں کی بھائی چارے اور میل ملاپ میں کوئی فرق نہ پایا حتی کہ حیدرآباد کے آزاد رہنے کے خلاف اور حکومت ہند میں شامل ہونے کے جذبات میں بھی شدت

محسوس نہیں کی جیسے کہ پروپگنڈہ کیا جارہا تھا۔

ٹائمس آف انڈیا نے جھوٹے پروپگنڈہ میں کوئی کسر اُٹھانہ رکھی تھی۔ اس اخبار نے صوبہ بمبئی میں بیجاپور کے موضع ملنور میں ایک ہنگامہ کی یہ اطلاع شائع کی کہ حیدرآباد کی فوج نے حملہ میں حصہ لیا اور ہندوستانی فوج کے سپاہیوں کا اغوا کیا۔ اس واقعہ کی جب متفقہ تحقیقات ہوئیں تو ظاہر ہوگیا کہ ۵/جون ۴۸ء کو ہندوستان کے (۲۰۰) غیر سماجی عناصر نے پولیس کی مدد سے اس موضع پر حملہ کیا تھا اور مقابلہ کے بعد چھ لاشیں اور اسلحہ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ان میں پانچ لاشیں ہندوستانی پولیس کی تھیں۔ جب یہ متفقہ رپورٹ صحافت میں شائع ہوئی تو حکومت ہند نے وضاحت کی کہ ہندوستانی عہدیدار رپورٹ پر دستخط تو کی ہے لیکن وہ اس سے اتفاق نہیں کرتی۔

سخت معاشی ناکہ بندی کی گئی جو عام طور پر حالت جنگ میں ہوا کرتی ہے۔ ۱۸۰۲ء کے تجارتی معاہدہ کے تحت برطانوی حکومت اور حیدرآباد میں درآمد اور برآمد پر کسی قسم کا امتناع نہ تھا اور یہی گنجائش دفعہ (۷) قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء میں رکھی گئی تھی۔ معاہدہ انتظام جاریہ میں اس عہد کو جاری رکھنے کا بھی وعدہ تھا۔ کوئی بندرگاہ نہ ہونے کی وجہ سے حیدرآباد کو یہ سہولت لازمی تھی جو کو حکومت برطانیہ نے دے رکھی تھی۔ حیدرآباد غلہ کی حد تک تو خود مکتفی تھا۔ حیدرآباد سے کپاس، روغن اور روغن کے بیج بڑی مقدار میں برآمد کئے جاتے تھے۔ دواؤں، پٹرول، ڈیزل، کار اور اس کے پرزے، مشنری اور بچوں کی غذائیں بمبئی سے درآمد کی جاتی تھیں۔ معاہدہ انتظام جاریہ کے قبل ہی ہلکی سی ناکہ بندی کی گئی تھی تاکہ شرکت کے لئے آمادہ کیا جائے۔ اس سخت ناکہ بندی کا اثر نہ صرف (۱۵) فیصد مسلمانوں پر تھا بلکہ (۸۵) فیصد ہندو آبادی بھی متاثر ہورہی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ پٹرول اور ڈیزل مہیا نہ ہو تو سارا مواصلاتی نظام معطل ہوجائے گا۔ لیکن قابل تعریف بات یہ ہے کہ حیدرآباد کی آبادی نے بڑی دلیری سے اس کا مقابلہ کیا اور دنیا کو تعجب ہوا کہ حیدرآباد کے کارخانوں نے پاور الکحل تیار کر کے گاڑیاں چلائیں۔ جب نمک بند کردیا گیا تو ایک ضلع کی مٹی سے نمک نکالا گیا۔ اسی طرح سے سخت معاشی ناکہ بندی کا مقابلہ کیا گیا۔

ان اقدامات کا مقصد ظاہر تھا کہ ڈرایا جائے، دھمکایا جائے اور دباؤ ڈالا جائے تاکہ حالات سے خوف کھا کر حیدرآباد ہندوستان میں شرکت کرلے۔

مستقل معاہدہ کی تلاش

معاہدہ انتظام جاریہ کے قریب (۳) ماہ گذرنے کے بعد ریاست حیدرآباد کی جانب سے مستقل معاہدہ کے لئے کوششیں شروع کی گئیں۔ اس وقت حالات بدل چکے تھے۔ کشمیر میں ہندوستان نے قدم جما لئے تھے۔ بدامنی اور فسادات پر قابو پالیا گیا تھا دیسی ریاستوں کے انضمام کے مسائل حل ہوچکے تھے۔ اب فوج کو دوسرے مقامات پر منتقل کیا جاسکتا تھا۔ مہلت جس مقصد سے حاصل کی گئی تھی اس میں کامیابی ہوئی۔ اس دوران سرحدی شورشوں، معاشی ناکہ بندی اور مبالغہ آمیز پروپگنڈہ کے ذریعہ جو دباؤ ڈالا جارہا تھا اس کا مقصد ہی ڈرادھما کر زیر کرنا تھا۔

اِدھر حیدرآباد اپنے کمزور موقف کی وجہ سے ٹکر لینے کی پالیسی نہیں چاہتا تھا بلکہ ایک دوستانہ ماحول میں موزوں معاہدوں کے ذریعہ تعاون کے ساتھ پرامن رہنا چاہتا تھا۔ ماسوا یہ کہ اس کو طاقت آزمائی کے لئے مجبور کیا جائے۔ کمزور تھا اس لئے وقت ضرورت استعمال کے لئے اپنی طاقت بنائے رکھنا چاہتا تھا۔ معاہدہ انتظام جاریہ نے دونوں کو ایک سال کے لئے سانس لینے کا موقعہ عطا کیا تھا۔

معاہدے کے بعد دونوں حکومتیں ایک دوسرے سے شکوک وشبہات میں مبتلا تھیں۔ خلاف ورزیوں سے دونوں کا دامن پاک نہ تھا۔ معاہدہ کے مطابق ہندوستان نے دو اُمور صحیح طور سے انجام دے ایک سکندرآباد کنٹونمنٹ سے فوج کی واپس طلبی اور دوسرے ریذیڈنسی بلڈنگ کی حیدرآباد کو واپسی۔ حیدرآباد کے دو تین فیصلوں کو معاہدے کی خلاف ورزی قرار دے کر ہنگامہ کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی۔ وی۔ پی۔ مینین نے ۲۳ / مارچ کو ایک مراسلہ حیدرآباد کی خلاف ورزیوں سے متعلق لکھا جس کا لب ولہجہ دھمکی آمیز تھا۔ شکایت چار فقروں پر تھی۔ پہلا فقرہ پاکستان کو (۲۰) کروڑ روپئے کا قرض اور کراچی میں پبلک ریلیشن آفیسر کے تقرر پر تھا یہ اُمور خارجہ پالیسی سے متعلق تھے۔ دوسرا دفاع کے بارے میں تھا کہ فوج کی مقررہ تعداد میں اضافہ کیا گیا اور پولیس کی تعداد کے متعلق سالانہ

رپورٹ حکومت ہند کو روانہ نہیں کی گئی جس پر عمل درآمد حکومت برطانیہ سے چلا آرہا تھا۔ تیسرا حکومت ہند سے امتزاج کئے بغیر امریکہ سے حیدرآباد میں ریڈیو اسٹیشن کے قیام کا معاہدہ اور آخر میں سونے اور قیمتی دھاتوں کی برآمد اور ہندوستانی کرنسی کے حیدرآباد میں چلن پر امتناع تھا۔ لایق علی نے اس کا ۱۵/اپریل کو تفصیلی اور مدلل جواب دیا اور حکومت ہند پر اُلٹا الزام لگایا کہ معاشی ناکہ بندی سخت کردی گئی۔ حیدرآبادی سرحدوں کے اطراف حکومت ہند کی فوج متعین کردی گئی۔ بمبئی، مدراس وغیرہ سے مال کی درآمد پر روک لگادی گئی جس کی وجہ سے دوائیں اور بچوں کی غذائیں اور دیگر ضروریات کی عدم دستیابی کی وجہ سے لوگوں کی صحت پر بڑا اثر پڑ رہا ہے اور مطالبہ کیا کہ ان اُمور کو ثالثی کے حوالے کیا جائے۔

ان حالات کے باوجود حیدرآباد ایک مستقل دوستانہ معاہدہ کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ لایق علی کی درخواست پر سر والٹر مانکٹن خدمات کے لئے راضی ہوئے۔ سر والٹر مانکٹن کو مسودے میں مہارت اور ماونٹ بیٹن کی دوستی کی وجہ سے ضروری سمجھا گیا۔ ان مسودات کی تیاری اور لایق علی کے ساتھ وہ گفتگو میں شریک رہے۔ لایق علی نے گفتگو اپنے ذمہ لی اور مسلسل دہلی کے چکر کاٹے۔ حیدرآباد کے وفد نے جنوری ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۴/جون ۴۸ء تک معاہدے کو قطعیت دینے کے لئے کوئی دس چکر کاٹے۔ ہر مرتبہ کوئی نئی شرط لگائی جاتی اور وفد واپس ہوتا۔ جب شرط تکمیل کر کے آتا تو نیا مسئلہ کھڑا کیا جاتا اور نئی شرط شامل کی جاتی۔ یہ تفصیل لایق علی نے اپنی کتاب میں لکھی ہے جو مختصراً درج ذیل ہے۔

(۱) گفتگو کا آغاز ۲۹/جنوری ۴۸ء کو مہاتما گاندھی جی سے لایق علی کی ملاقات سے ہوا۔ بڑے مشفقانہ اور دوستانہ ماحول میں گاندھی جی نے طویل گفتگو کی اور دریافت کیا کہ موجودہ ماحول میں نظام کب تک شاہیت برقرار رکھیں گے اور کیوں نہیں جمہوری طریقہ اختیار کیا جاتا۔ لایق علی نے کہا کہ حیدرآباد کے مخصوص تہذیبی و تمدنی حالات جو سات سو سال سے قائم ہیں متقاضی ہیں کہ بتدریج تبدیلی لائی جائے اور مسلمانوں کے معاملات کا تحفظ کیا جائے تاکہ ان کی تہذیب اور تمدن باقی رہے۔ حیدرآباد ان حالات کی وجہ سے دوستانہ ماحول کے ساتھ رہنا چاہتا ہے اسی لئے کوئی دوستانہ معاہدے کی تلاش میں ہے۔ گاندھی جی

نے جب پاکستان سے الحاق کے بارے میں دریافت کیا تو صاف کہا گیا کہ حیدرآباد کا پاکستان سے الحاق کا کوئی ارادہ نہیں ۔ گاندھی جی نے پاکستان کو دیئے گئے (۲۰) کروڑ روپئے کے قرض پر اعتراض کیا ۔ بہرحال تفصیلی گفتگو کے بعد دونوں مطمئن ہوئے اور گاندھی جی نے خواہش ظاہر کی کہ دونوں کے بیچ ایک اچھا معاہدہ طے پا جائے ۔ گاندھی جی نے کہا کہ پھر کل ملاقات ہوگی اور کوئی نہ کوئی بات طے پائے گی ۔ لایق علی بڑے مطمئن ہوئے کہ معاملہ جب گاندھی جی اپنے ہاتھ میں لئے ہیں تو حل ہو جائے گا ۔ وہ کل یعنی ۳۰رجنوری جس دن لایق علی گاندھی جی سے گفتگو کرنے والے تھے گاندھی جی کو گولی ماردی گئی ۔ لایق علی کی ساری توقعات پر پانی پھر گیا ۔

(۲) فبروری ۱۹۴۸ء کے ابتدائی دنوں میں معاہدے کے سلسلہ میں میٹنگ ہوئی جو کوئی نتیجہ خیز نہ رہی اور اس پر ختم ہوئی کہ ابھی کوئی ایسا وقت نہیں ہے کہ طویل معاہدے کی فوری ضرورت ہو اور معاہدہ انتظام جاریہ کے مطابق کام جاری رہے ۔ اسی دوران سرحدی شورشیں بڑھا دی گئیں اور ہتھیار سپلائی کرنے میں لیت ولعل سے کام لیا گیا ۔ ایک دوسرے پر خلاف ورزیوں کے الزامات عائد کئے جاتے رہے ۔

(۳) فبروری ۴۸ء کے آخری ہفتہ میں لایق علی اور سر والٹر مانکٹن دہلی گئے ۔ مانکٹن ماونٹ بیٹن سے ملنے گئے اسی دوران وی ۔ پی ۔ مینین ، لایق علی سے ملنے آئے اور غیر ضروری باتیں کرنے لگے ۔ لایق علی نے کہا کہ مقصد کی بات کیجئے تو کہنے لگے کہ پاکستان کو (۲۰) کروڑ روپئے[1] کا قرضہ تمام معاملات میں مخل ہو رہا ہے ۔ لایق علی نہرو سے ملے اور پٹیل سے تفصیلی

---

[1] تقسیم ہند کے وقت پاکستان کو (۵۰) کروڑ روپئے دینا طے پایا تا کہ نئی حکومت کو کاروبار چلانے میں دشواری نہ آئے ۔ لیکن اس کی ادائی حکومت ہند نے روک دی تا کہ روز اول سے ہی پاکستان کو مالی بحران میں مبتلا رکھا جائے ۔ عملہ کی تنخواہوں کا وقت قریب تھا اور پاکستان مالی پریشانیوں میں مبتلا تھا ۔ غلام محمد جو اس وقت پاکستان کے وزیر خزانہ تھے حیدرآباد آئے اور درخواست کی کہ (۱۰) کروڑ کے تمسکات بطور قرض دیئے جائیں تا کہ تنخواہوں کی ادائی ہو سکے ۔ نظام نے لایق علی سے مشورہ کیا تو لایق علی نے تمسکات دینے کی تائید کی ۔ نظام فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے (۱۰) کروڑ کے بجائے (۲۰) کروڑ کے تمسکات پاکستان کے حوالے اس نقطۂ نظر سے کئے کہ نئی اسلامی مملکت کو ممکن ہو مزید مالی ضرورت پڑے گی ۔ نظام کا یہ بڑا مستحسن اقدام تھا جو حکومت ہند کی رویہ کی وجہ سے وقوع پذیر ہوا ۔

گفتگو کی ۔ پٹیل نے کہا کہ وہ مسلم مخالف نہیں ۔ حیدر آباد کے سلسلہ میں دریافت کیا گیا تو کہا کہ الحاق کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ۔ گورنر جنرل اور وزراء کوئی دوسرا راستہ چاہتے ہیں لیکن وہ ممکن نہیں ۔ اس بیچ راجگوپال چاری آ گئے ۔ پٹیل کسی سے ٹیلی فون پر بات کرنے کے لئے جدا ہوئے تو لایق علی نے اس معاملہ میں راج گوپال چاری سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ حیدر آباد کے معاملہ میں سوائے سردار پٹیل کے اور کوئی مخالف نہیں اور وہ ہی اس مسئلہ کے طے کرنے میں رکاوٹ ہیں ۔ گورنر جنرل میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ سردار پٹیل کے خلاف کام کریں ۔ راج گوپال چاری نے سردار پٹیل سے کہا کہ وہ حیدر آباد کے معاملہ میں اپنا مزاج تبدیل کریں اور سمجھوتہ کرلیں لیکن وہ نہیں مانے ۔

(۴) ۲/ مارچ ۴۸ء کو حیدر آباد کا وفد جو لایق علی، معین نواز جنگ اور مانکٹن پر مشتمل تھا، ماونٹ بیٹن سے ملا تو وہ معین نواز جنگ پر پاکستان کو (۲۰) کروڑ قرضے کی فراہمی کے سلسلہ میں بڑے بگڑے اور کہا کہ اگر معاہدہ انتظام جاریہ کے قبل ہی معاملہ ہوا تھا تو معاہدے کے وقت صاف کر دینا تھا ۔ معین نواز جنگ نے کہا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ۔ حیدر آباد حکومت برطانیہ کے زمانہ سے دولت مشترکہ کے ممالک میں بغیر برطانوی حکومت کے اجازت سرمایہ مشغول کیا کرتا تھا ۔ لایق علی مخل ہوئے اور کہا کہ اگر صرف اسی وجہ سے معاہدہ طے نہیں پا رہا ہے تو وہ خود فوراً پاکستان جائیں گے اور دیکھیں گے کہ (۲۰) کروڑ روپئے کے تمسکات جو بطور قرض پاکستان کو دیئے گئے تھے وہ معاہدہ انتظام جاریہ کی مدت تک بھنائے نہ جائیں ۔ ماونٹ بیٹن بڑے خوش ہوئے اور سردار پٹیل بھی مطمئن ہو گئے ۔ دوسرا سوال حکومت ہند کی کرنسی کے چلن سے متعلق تھا جس پر روک لگا دی گئی تھی اس پر اعتراض ہوا کہ اس کی وجہ سے مسافروں کو ریل کے سفر میں بڑی تکلیف ہو رہی ہے تو معین نواز جنگ نے کہا کہ اس قانون میں تصحیح کی جا کر مسافروں کو پوری سہولت دی جائے گی ۔ لایق علی نے فوری پاکستان سے ربط پیدا کیا ۔ ۳/ مارچ ۴۸ء کو جناح سے ملاقات کا وقت لیا ۔ قائداعظم سے ۳/ مارچ کو تفصیلی گفتگو کی اور قائداعظم نے باوجود سخت مالی مشکلات کے تمسکات کو مدت معاہدہ انتظام جاریہ کے ختم ہونے تک نہ بھنانے کا فیصلہ کیا ۔

(۵) ۴؍ مارچ کو لایق علی کی پاکستان سے آمد کے ساتھ ہی حیدرآبادی وفد ماونٹ بیٹن سے ملا اور تمسکات نہ بھنانے کی خوشخبری دی۔ معین نواز جنگ کرنسی کے قانون میں تصحیح کا وعدہ کر چکے تھے۔ اب کوئی بات حکومت ہند کے لئے مانع نہ تھی۔ اس لئے یہ سمجھا جانے لگا کہ سرحدی شورش، معاشی ناکہ بندی کے خاتمہ اور اسلحہ کی سپلائی جیسے اقدامات ممکن ہوں گے کیوں کہ ماحول بڑا خوشگوار بن گیا تھا اور ماونٹ بیٹن نے کہا کہ حکومت ہند کے لئے اب کوئی موانعات نہیں اس لئے وہ تمام مراعات جو معاہدے انتظام جاریہ کے تحت ہوئے ہیں جاری کئے جائیں گے۔ درآمدات و برآمدت کی اجازت ہوگی اور ہتھیار کی سپلائی بحال کی جائے گی۔ سرحدی شورشوں پر کنٹرول کیا جائے گا اور یہ کوشش کی جائے گی کہ معاہدہ انتظام جاریہ پر موثر عمل ہو۔ سر والٹر مانکٹن نے کہا کہ ایک مشترکہ اعلامیہ ان تمام اُمور پر محیط دونوں کی منظوری کے بعد صحافت کو جاری کیا جائے۔ اس طرح سے کانفرنس بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔ ماونٹ بیٹن نے مشترکہ اعلامیہ کا مسودہ وی۔ پی۔ مینین کو دیا کہ حکومت ہند کی منظوری حاصل کرلے۔ اس خوشی میں حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل نے اسی رات ایک ڈنر ترتیب دیا جس میں وزراء، دوسرے ممالک کے سفراء، اعلیٰ شخصیتیں اور اعلیٰ عہدیدار مدعو کئے گئے تھے۔ کئی مدعوئین آئے۔ کچھ ہی دیر بعد افسوس کی انتہا نہ رہی جب یہ معلوم ہوا کہ مسودہ نہرو، پٹیل اور مینین نے بری طرح سے تبدیل کردیا ہے۔ نہرو چاہتے تھے کہ صرف ایک سطری اعلامیہ جاری کیا جائے اس کے سوا کچھ نہیں۔ ماونٹ بیٹن مجسم حیرت بن گئے اور ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ نہرو اور پٹیل کو اس بارے میں مجبور کرتے۔ اس طرح سے یہ ڈرامہ ختم ہوا اور وفد مایوس لوٹ گیا۔

(۶) حیدرآباد وفد کے مایوس لوٹنے کے بعد کے۔ یم۔ منشی نے لایق علی سے ربط پیدا کیا اور اصرار کیا کہ وہ دہلی جاکر ان تمام اُمور کی یکسوئی کرواکر واپس آئیں گے۔ چنانچہ انھوں نے لایق علی اور معین نواز جنگ سے تفصیلی بات چیت کی اور ایک معاہدہ پر پہنچے۔ معاہدہ کا مسودہ لے کر منشی اس وعدہ سے گئے کہ وہ حکومت ہند کی منظوری لے کر واپس ہوں گے۔ دہلی جاکر کافی عرصہ ہوا لیکن وہ واپس نہ ہوئے۔ دہلی کے زعماء نے انھیں منہ نہ لگایا اور بے نیل و

مرام ۲۶/ مارچ کو واپس ہوئے اور اپنے ساتھ وی۔ پی۔ مینین کا دستخط شدہ مراسلہ لائے جو مورخہ ۲۳/ مارچ کو حکومت ہند کی جانب سے لکھا گیا تھا اور اسے لایق علی کے حوالے کیا۔ مراسلہ سخت اور دھمکی آمیز تھا۔ اس میں وہ سب باتیں تھیں جو مختلف اوقات میں طے پا چکی تھیں مزید ان کے ساتھ اور کئی اُمور شامل کرتے ہوئے اتحاد المسلمین اور اس کی تمام شاخوں پر امتناع عائد کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ لایق علی نے منشی کو چائے پر مدعو کیا اور کھلے دل سے باتیں ہوئیں۔ منشی نے کہا کہ جو بھی بات ہوئی وہ خانگی ہے اس کو ریکارڈ پر نہ لایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اگرچیکہ ہندوستان ایک غیر مذہبی حکومت ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ایک ہندو اسٹیٹ ہے۔ اس میں حیدرآباد کیسے آزاد رہ سکتا ہے۔ حیدرآباد کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ ہندوستان میں ضم ہو جائے ورنہ حکومت ہند کو حملہ کے ذریعہ حاصل کر لینے میں کوئی دقت نہیں۔ حکومت ہند کو چاہئے کہ بجائے کشمیر پر زیادہ توجہ دینے کے حیدرآباد کا مسئلہ پہلے حل کر لیا جائے تو کشمیر میں کھوئی ہوئی ساکھ بن جائے گی۔ حیدرآباد کو حاصل کرنے میں حکومت ہند کو کوئی دشواری نہیں۔ تاخیر ہو تو حیدرآباد UNO کی مداخلت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس گفتگو کے بعد لایق علی نے نظام سے مل کر گفتگو کی روئیداد سنائی تو نظام نے کہا کہ ساری گفتگو ضبط تحریر میں لائی جائے۔ نجی گفتگو تھی سرکاری ریکارڈ میں نہ لانے کا وعدہ کیا گیا تھا مگر نظام کے حکم کو ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ منشی سے عدم اعتماد کا جوکھم مول کر لایق علی نے ساری باتیں تحریر میں پیش کیں۔ نظام نے اس تحریر کو اپنی یادداشت کے ذریعہ ماونٹ بیٹن کو بھیجا جس سے ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور منشی سے جب حکومت ہند نے دریافت کیا تو انھوں نے سفارتی انداز میں انکار کرتے ہوئے کہا کہ اس کا مطلب یہ نہیں تھا۔ نظام کو یہ حرکت نہیں کرنی چاہئے تھی۔

حکومت ہند کے ۲۳/ مارچ کے مراسلہ کا جواب نظام نے سخت انداز میں دیا جو سر والٹر مانکٹن نے لکھا تھا اور ماونٹ بیٹن سے کہا کہ اس قسم کا دھمکی آمیز رویہ مفاہمت کو بگاڑنے کا سبب بنے گا۔ جواباً کہا گیا کہ ۴/ مارچ کو تمسکات کو نہ بھنوانے اور سکہ کے چلن کے سلسلہ میں قانون میں تصحیح جیسے اقدامات حسب وعدہ کئے گئے لیکن حکومت ہند کی جانب سے

سرحدی شورشوں پر کنٹرول، معاشی ناکہ بندی کا خاتمہ اور درآمد و برآمد پر غیر مجاز پابندی کے ہٹانے کے اقدامات ابھی تک نہیں کیئے گئے۔ غرض ماونٹ بیٹن، نہرو، پٹیل وغیرہ کی توجہ ان تمام اُمور پر مبذول کروائی گئی۔ اس مراسلہ کو لے کر سر والٹر مانکٹن ۶/اپریل کو دہلی گئے چوں کہ ۷/اپریل کو گفتگو مقرر تھی۔ اسی دن یعنی ۷/اپریل کو ایک شرارت آمیز خبر ٹائمنر آف انڈیا میں جلی حرفوں شائع ہوئی کہ ۳۰/مارچ کو قاسم رضوی نے جلسہ ہفتہ اسلحہ منایا اور رضا کاروں کی ایک بڑی ریلی کو مخاطب کرتے ہوئے جہاد کی تلقین کی۔ بقول وی۔ پی۔ مینین اس تقریر کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ اگر ہندوستان کا حملہ حیدرآباد پر ہوگا تو سارے ہندوستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمان ہندوستان کے خلاف پانچویں کالم کا کام دیں گے۔ یہ خبر جھوٹی اور بے بنیاد تھی۔ نہ تو ہفتہ اسلحہ منعقد ہوا اور نہ ریلی اور نہ قاسم رضوی کی تقریر۔ اگر یہ واقعہ ہوتا تو کیا کسی ہندو یا مسلم پریس میں یہ خبر شائع نہ ہوتی؟ اس جھوٹی خبر کا مقصد یہی تھا کہ ۷/اپریل کو منعقد شدنی گفتگو کو متاثر کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا دہلی کا ماحول بڑا خراب ہوگیا اور وفد واپس ہوگیا۔ حیدرآباد آ کر والٹر مانکٹن نے تحقیقات کیں تو سارا معاملہ جھوٹا نکلا۔ لندن ٹائمنر کے نمائندہ نے ان دنوں حیدرآباد میں ایک ہفتہ گذارا اور قاسم رضوی سے طویل ملاقات کی اور دہلی جا کر ماونٹ بیٹن کو اطلاع دی کہ نہ تو ہفتہ اسلحہ منایا گیا اور نہ قاسم رضوی نے کوئی ریلی کو مخاطب کیا۔ سارا واقعہ من گھڑت اور جھوٹا ہے۔ یہ شاخسانہ کے۔ یم۔ منشی کی جانب سے کیا گیا تھا تاکہ نظام سے اس کارروائی کا بدلہ لیا جائے جس میں کے۔ یم۔ منشی کی نجی گفتگو کو ضبط تحریر میں لا کر ان کے خلاف حکومت ہند سے شکایت کی گئی تھی۔ قاسم رضوی بھلا ان الزام تراشیوں کو کب برداشت کرتے، مبینہ تقریر سے زیادہ سخت تقریر کر ڈالی جو ۱۲/اپریل کے اخباروں میں چھپی۔ کہا کہ وہ دن دور نہیں جب خلیج بنگال کی لہریں ہمارے بادشاہ کے قدم چومے گی اور پرچم آصفی دہلی کے لال قلعہ پر لہرائے گا۔ اس ناعاقبت اندیش جذباتی تقریر نے حکومت ہند کو حیدرآباد کے خلاف استعمال کرنے ایک بڑا حربہ مہیا کیا۔ قاسم رضوی کی ایسی ہی جذباتی تقاریر تھیں جنھیں حیدرآباد پر حملہ کرنے کا جواز بنایا گیا۔

(۷) حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل متعینہ دہلی نے وسط اپریل میں اطلاع دی اور مشورہ دیا کہ حالات دن بدن خراب ہورہے ہیں اورقریب میں انڈین کانگریس کا اجلاس بھی ہونے والا ہے بہتر ہے لایق علی دہلی آئیں، وزراء اور لیڈروں سے گفتگو کریں اور معاملہ کوسلجھانے کی کوشش کریں۔ نظام کی اجازت کے بعد لایق علی دہلی روانہ ہوئے۔ نہرو سے ملاقات سے قبل حسب روایت وی۔ پی۔ مینین سے گفتگو کی۔ وی۔ پی۔ مینین حسب عادت قدیم یہی دہرایا کہ حیدرآباد الحاق کرلے اور ذمہ دارانہ حکومت قائم کرے۔ نہرو سے ملاقات رہی۔ دنیا بھر کی سیاسی گفتگو کرتے رہے۔ قاسم رضوی کی اشتعال انگیزیوں کا حوالے دیتے رہے اور آخر کار کہا کہ الحاق کے سوا دوسرا راستہ نہیں۔ سرحدی شورشیں اور معاشی نا کہ بندی کی طرف توجہ دلائی گئی تو کہا کہ ایسی کوئی سخت نا کہ بندی یا شورش نہیں۔ سردار پٹیل نے بھی ملاقات میں ان ہی خیالات کا اظہار کیا اور بارہا کہا کہ لایق علی صاحب مستعفی ہوجائیں۔ دوسرے دن نہرو نے لایق علی کو لنچ پر بلایا اور گفتگو رہی اور کہا کہ قریب میں کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہونے والا ہے اس لئے اس معاملہ کی یکسوئی کے لئے کچھ تو پیش رفت ہونی چاہئے ذمہ دارانہ حکومت کے سلسلہ میں لایق علی صاحب نے کہا کہ نظام نے اس کی عمل آوری کے لئے فرمان جاری کیا ہے۔ ایک کمیٹی مقرر کی ہے تا کہ ذمہ دارانہ حکومت کے اقدامات کرے۔ اس کے بعد توقع تھی کہ معاہدہ کی راہ ہموار ہوگی اور کوئی مزید مشکلات نہیں ہوں گی۔ لیکن تعجب کی انتہا نہ رہی کہ نہرو نے ۲۴؍اپریل کو کانگریس کے اجلاس میں کہا کہ حیدرآباد کو الحاق کے سوا کوئی راستہ نہیں اور پھر ۲۶؍اپریل کے اجلاس میں کہا کہ حکومت کا صبر کا پیمانہ چھلکنے کے قریب ہے۔ حیدرآباد الحاق یا جنگ کے لئے تیار ہوجائے۔

(۸) وسط مئی ۴۸ء کو حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل متعینہ دلی کے اصرار پر لایق علی دہلی گئے اور ۱۲؍مئی کو ماونٹ بیٹن سے تفصیلی ملاقات کی۔ لارڈ ماونٹ بیٹن ڈرانے دھمکانے لگے کہ فوجی حملے کی تیاریاں ہوگئی ہیں اور فوج سرحدات کی جانب منتقل ہوگئی ہے۔ اگر سمجھوتہ نہ ہوتو نتائج برے ہوں گے اور حیدرآباد تباہ ہوجائے گا۔ نظام کی ذات کو کچھ نہ ہوگا اس لئے جلد از جلد معاملہ سلجھالیا جائے۔ ماونٹ بیٹن نے اس طرح سے ڈرادھمکا کر لایق علی پر بڑا نفسیاتی اثر

ڈالا۔ ماونٹ بیٹن اور نہرو سے گفتگو کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ دفاع، اُمور خارجہ اور مواصلات کے معاملہ پر حکومت ہند کے قوانین کے مطابق قانون سازی ہو۔ حیدرآباد باقاعدہ بیس ہزار فوج رکھے گا اور بے قاعدہ (۸) ہزار۔ دوسرا مشکل مسئلہ ذمہ دارانہ حکومت کا قیام تھا۔ حیدرآباد حکومت اور مجلس قانون سازی میں مساوی تناسب چاہتا تھا جب کہ نہرو کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو اقلیتی مقام لینا ہوگا چوں کہ کانگریس نے مقامی ہندوؤں سے ایسا ہی وعدہ کیا ہے۔ لایق علی صاحب نے کہا کہ دونوں سفارشیں لے کر حیدرآباد جائیں گے اور بعد گفتگو کے واپس ہوں گے۔

(۹) دہلی سے واپسی پر سارا معاملہ نظام اور ان کی کونسل میں رکھا گیا۔ دفاع، اُمور خارجہ اور مواصلات کی تجاویز کے ساتھ ذمہ دارانہ حکومت میں موجودہ حالات کے لحاظ سے مسلمانوں کے مساوی حصہ کے ساتھ منظوری دی گئی۔ معاہدہ کی تفصیلات کے ساتھ وفد جو لایق علی، سر والٹر مانکٹن، وینکٹ رام ریڈی اور عبدالرحیم پر مشتمل تھا دہلی گیا۔ ۷/ جون کو ماونٹ بیٹن سے مل کر معاہدہ کا مسودہ پیش کیا گیا۔ ماونٹ بیٹن نے پھر اپنا پینترہ بدلا اور کہا کہ مقامی ہندو ایسے معاہدہ کے مخالف ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ استصواب عامہ کے ذریعہ یہ تصفیہ ہو کہ عوام الحاق چاہتے ہیں یا آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ لایق علی نے لکھا ہے کہ حکومت ہند کے آئے دن کے قول و فعل کے تضاد سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے وہ نظام کے بغیر منظوری کے استصواب عامہ کے لئے تیار ہو گئے اور اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ ماونٹ بیٹن اور حکومت ہند کو توقع نہ تھی کہ حیدرآباد کا وفد اس کے لئے تیار ہوگا۔ اس طرح سے حکومت ہند کی چال بے کار ہو گئی۔ ماونٹ بیٹن اس تجویز پر میٹنگ کی تفصیلی تحریری روائیداد روانہ کی تو حکومت کے ایوان میں کھلبلی مچی کہ جو نہ ہونا تھا وہ ہو گیا۔ نہرو پریشان ہو گئے کہ کیا کیا جائے۔ ایسا خطرہ مول لیا گیا ہے کہ استصواب عامہ حکومت ہند کی مرضی کے خلاف میں جائے تو کیا ہوگا۔ پھر اپنے وعدہ سے پھر گئے اور وی۔ پی۔ مینین کے ذریعہ اطلاع دی گئی کہ پہلے الحاق ہو اور استصواب عامہ کے ذریعہ اس کی توثیق کی جائے کہ الحاق درست ہے یا نہیں۔ مینین سے تلخ گفتگو رہی۔ آخر کار ۹/ جون کو حیدرآباد کے مجوزہ معاہدہ کے

مسودے پر غور کرنا طے پایا۔ اس دن وفد جب ملا تو مینین نے حکومت ہند کی جانب سے چار اُمور پیش کیے (۱) حکومت حیدرآباد اُمور دفاع، اُمور خارجہ اور مواصلات کے لئے فوری الحاق کرلے (۲) ذمہ دارانہ حکومت کی تشکیل ہو (۳) رضا کاروں پر فوری پابندی ہو اور تنظیم ختم کی جائے (۴) حیدرآباد کی فوج (۲۰) ہزار ہوگی۔ یہ سب انتظامات عارضی ہوں گے اور جلد کامل الحاق اور ذمہ دارانہ حکومت قائم ہوگی اور یہ تصفیہ ابھی ہو۔ اس کے علاوہ حکومت ہند کوئی اور مسودہ دیکھنا نہیں چاہتی۔ اس پر وفد نے کہا کہ معاملہ نظام کو پیش کیا جائے گا اور ان کی منظوری کے بعد اطلاع دی جائے گی۔ وفد واپس ہوا۔

(۱۰) ۱۴؍ جون کو حیدرآباد کا وفد دہلی پہنچا۔ انھیں پھر ایک دوسرا مسودہ دیا گیا۔ پھر بعد میں اس میں تبدیلی کی گئی۔ یہ مسودہ سوائے الحاق کے کچھ نہ تھا۔ یہ مسودہ بالآخر منظور نہ ہوا، گفتگو ٹوٹ گئی۔

ان سارے اُمور کو بہ نظر غائر دیکھنے سے حکومت ہند کی نیت کا صاف پتہ چلتا ہے۔ وہ کوئی ایسا معاہدہ کرنا نہیں چاہتی تھی جس سے حیدرآباد کی آزادی کسی انداز میں قائم رہے۔ وہ تو شرکت چاہتی تھی یا طاقت کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ طاقت کے استعمال کے لئے وقت چاہتی تھی جو معاہدہ انتظام جاریہ کی تاریخ ۲۹؍ نومبر ۴۷ء سے ۱۴؍ جون ۴۸ء تک اسے مل گیا۔ اس مدت میں وہ سب فوجی تیاریاں کرلی گئیں جن کی ضرورت تھی اور خود ماونٹ بیٹن نے حیدرآباد کے وفد کو ڈراتے دھمکاتے ہوئے مطلع کیا تھا کہ حکومت ہند کی فوج سرحدوں کے قریب ہے اور تین گھنٹوں میں سرحد پار کرنے کے قابل ہے۔

معاہدہ انتظام جاریہ کے بجائے حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مستقل معاہدہ حاصل نہ کرنے کا الزام عام طور سے لگایا جاتا ہے جس کی ذمہ داری جہاں نظام پر عائد ہوتی ہے وہیں بڑی ذمہ داری قاسم رضوی پر عائد کی جاتی ہے۔ الزام درست تھا مگر حالات سے واضح ہوتا ہے کہ حیدرآباد کو ضم کرنا ہی حکومت ہند کی پالیسی تھی کسی بھی معاہدہ کی اہمیت اس کے پاس نہیں تھی۔ متذکرہ تفصیلات اسی بات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

مذاکرات کا انقطاع

وسط مئی ۴۸ء میں حکومت ہند نے جن شرائط کا مسودہ دیا اور وسط جون ۴۸ء تک جو مذاکرات ہوئے اور مسودات بنے اور اس کے بعد آخر کار مذاکرات کا انقطاع عمل میں آیا اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ ۲۵ر مئی ۱۹۴۸ء کو حکومت ہند کی جانب سے جو مسودہ دیا گیا تھا اس میں درج ذیل امور شامل تھے :

"الف : اُمور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے متعلق حکومت حیدرآباد ایسے قوانین کے نفاذ پر آمادہ ہو جو شیڈول کے مندرجہ ذیل کسی اور کے متعلق حکومت ہند حیدرآباد میں نافذ کرنے کی درخواست کرے۔

ب : اگر حکومت حیدرآباد ایسے قوانین کے نفاذ سے قاصر رہے تو حکومت ہند کو ان کے نافذ کرنے کا اختیار ہوگا۔ جس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ یہ حیدرآباد میں بھی قابل عمل ہیں۔

ج : حیدرآباد کی فوج کی تعداد (۲۰) ہزار سے زائد نہ ہوگی۔ حکومت ہند کو معائنہ کا حق حاصل ہوگا اور ساری افواج بے قاعدہ بشمول عسکری تنظیمات ختم کردی جائیں گی۔

د : حیدرآباد کے اندر حکومت ہند بہ جز مفاجاتی حالات کے اپنی افواج متعین نہیں کرے گی لیکن مفاجاتی حالت کا تصفیہ حکومت ہند کرے گی۔

ھ : حکومت ہند حیدرآباد کے خارجی تعلقات کی ذمہ دار ہوگی اور دنیا کے کسی ملک سے حیدرآباد کو سیاسی تعلقات قائم کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔

و : آپس کے مشترکہ معاملات کی انجام دہی موجودہ معاہدات اور انتظامی

سمجھوتوں کی بنیاد پر ہوگی۔

مسودہ کے دوسرے جزو میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ معاہدہ کی تکمیل کے بعد ہی حیدرآباد میں ایک عارضی حکومت تشکیل دی جائے گی۔ بشمول وزیراعظم، ارکان کابینہ میں نصف غیر مسلم ہوں گے۔ یہ عارضی حکومت یکم جنوری ۱۹۴۹ء کے قبل دستور ساز اسمبلی کے انعقاد کا اعلان کرے گی۔ جس کا انتخاب علاقہ واری بنیادوں پر وسیع حق رائے دہی کی بنیاد پر عمل میں آئے گا اور جس کے ارکان کی (۶۰) فیصد تعداد غیر مسلم ہوگی۔ دستور ساز اسمبلی کے انعقاد کے بعد عارضی باب حکومت اور مقننّہ کی تحلیل عمل میں آئے گی اور ایک جدید کابینہ تشکیل کی جائے گی جس کو دستور ساز اسمبلی کا اعتماد حاصل ہوگا۔ کابینہ کے کم از کم (۶۰) فیصد ارکان غیر مسلم ہوں گے۔ دستور ساز اسمبلی حیدرآباد کا دستور مدون کرے گی۔ مسلمانوں کے جائز مذہبی اور ثقافتی مفادات کا دس سال کے لئے تحفظ کیا جائے گا۔ جدید دستور کے قابل عمل ہونے کے پانچ سال بعد تک حکومت ہند اور نظام کے تعلقات کی بنیاد مسودہ شراکت کے جزو اول کی شرائط پر مبنی ہوگی۔ حیدرآباد میں سرکاری ملازمتوں بشمول فوج میں فرقہ واری تناسب کچھ اس طرح قائم کیا جائے گا کہ سارے فرقوں کو مناسب نمائندگی حاصل ہو جائے اور یکم جنوری ۱۹۵۴ء تک سرکاری ملازمتوں میں (۶۰) فیصد تک غیر مسلم تناسب قائم ہو جائے گا۔"

(حیدرآباد کے عروج و زوال از بدر شکیب صفحہ ۱۷۸ و ۱۷۹)

اس مسودہ کے ساتھ لایق علی دلی سے حیدرآباد واپس آئے تاکہ گفتگو کی جائے اور نظام کی منظوری حاصل کر کے دوبارہ دلی جائیں۔ لایق علی نے سارا معاملہ نظام کے سامنے پیش کیا اور ان سے کہا کہ چوں کہ حکومت ہند کے زعماء انھیں (لایق علی) کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ سارے معاملہ میں مخل ہیں اسی لئے وہ مستعفی ہونا چاہتے ہیں اس لئے بہتر ہے کہ نظام استعفیٰ قبول کرلیں تاکہ معاملت ہو جائے۔ یہ سن کر نظام نے ناراضگی کا اظہار کیا اور ان سے کہا کہ نہ تو وہ اور نہ سیدرآباد کی رعایا اس طرح کے اقدام کو برداشت کرے گی۔ چنانچہ استعفیٰ کی پیش کش کی بات یہیں ختم ہوگئی اور بعد منظوری نظام ایک مسودہ کے ساتھ وفد جو لایق علی، سر والٹر مانکٹن، پنگل وینکٹ رام

ریڈی اور عبدالرحیم پر مشتمل تھا دہلی پہنچا۔ ۷؍جون کو گفت وشنید کی تاریخ مقرر تھی۔

لایق علی کا دہلی سے لایا ہوا مسودہ ابھی حیدرآباد میں ہی زیر غور تھا کہ نہرو مسلسل مختلف بیانات دینے لگے انھوں نے ۲؍جون کو اوٹاکمنڈ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے حیدرآباد پر واضح کردیا ہے کہ حیدرآباد کے مسئلہ کی یکسوئی ہونی چاہیے۔ آخرکار حیدرآباد کو شرکت (الحاق) کرلینا ہوگا اور یہ کہ حیدرآباد میں ذمہ دارانہ حکومت قائم ہونی چاہیے۔ ایک اور تقریر میں جواہرلال نے کہا ہم نہیں چاہتے کہ جبر (Coercion) کا راستہ اختیار کریں سوائے اس کے ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کیا جائے چوں کہ ہندوستان کی سکیورٹی کا مسئلہ درپیش ہے۔ ۶؍جون کو دہلی میں ایک اور تقریر میں کہا کہ ہندوستان کے بیچوں بیچ ایک آزاد سلطنت خود ہندوستان کے تحفظ کے لئے خطرناک ہے۔ حیدرآباد سے نبٹنے کے لئے ہم نے فوج کو بھی طاقتور بنالیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ معاملہ پرامن اور دوستانہ ماحول میں طے پاجائے۔ اسی دوران سردار پٹیل دل کے دورہ سے صحت یاب ہونے کے لئے آرام کی خاطر دہرہ دون چلے گئے لیکن وہ حیدرآباد کے حالات سے خود کو باخبر رکھ رہے تھے۔ ویسے بھی ان کے بغیر یہ معاملہ طے ہونے والا نہیں تھا۔

حیدرآباد کا وفد جو تجاویز کے ساتھ دہلی پہنچ کر ۷؍جون کو گفتگو کرنے والا تھا ان تجاویز کی تفصیلات تو عدم دستیاب ہیں۔ تاہم لایق علی صاحب نے اشارتاً جو باتیں کہیں وہ تھیں حیدرآباد کی فوج کی طاقت میں اضافہ، معاشی، مالی اور تجارتی مکمل آزادی، کسی شکل میں اقتدار اعلیٰ (پیرامونٹسی) قائم نہ کی جائے، ہندوستان کی فوج حیدرآباد میں اس وقت رہے جب کہ حالت جنگ ہو، ثالثی کی گنجائش رکھی جائے اور ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے سلسلہ میں مسلمانوں کو حیدرآباد کے مخصوص حالات کے پیش نظر مساویانہ مقام حاصل ہو۔

۷؍جون کو لایق علی نے ماونٹ بیٹن سے کھری کھری بات کی۔ ماونٹ بیٹن نے طاقت کے استعمال اور فوجی حملے کے ڈر اور خوف کے ذریعہ لایق علی پر دباؤ ڈالنے اور اثر انداز ہونے کی کوشش کی تھی اور کہا تھا کہ ہندو سوائے الحاق کے اور کوئی معاہدہ نہیں چاہتے۔ مسلمان اقلیت میں ہیں اس لئے وہ ہندوؤں کے جائز حقوق کے درمیان حائل نہیں ہوسکتے۔ عام جمہوری طریقہ یہی ہے کہ ایسے معاملہ میں استصواب عامہ کے ذریعہ یکسوئی کی جائے اور یہی طریقہ دنیا میں رائج ہے۔ استصواب عامہ کے

ذریعہ یہ معاملہ حل ہونا چاہئے کہ حیدرآباد آزاد رہے یا پھر ہندوستان میں شرکت کرلے۔ بجائے حیدرآباد کی تجاویز پر گفتگو کرنے کے حکومت ہند نے پینترا بدلا اور گفتگو کا نیا انداز اختیار کیا تاکہ حیدرآباد کو حکومت ہند کی مرضی کے تابع کیا جائے۔ لایق علی کے لئے یہ بڑا چیلنج تھا۔ لیکن لایق علی اور ان کے وفد نے ان امکانی خدشات کے تحت استصواب عامہ کے مسئلہ کو بھی اپنے ذہن میں رکھا تھا تاکہ حکومت ہند کی طرف سے اگر مسئلہ اُٹھایا جائے تو کس طرح سے نمٹا جائے۔ قاسم رضوی نے بڑی شاطرانہ چال چلتے ہوئے وفد کو ایسی تجویز کو قبول کر لینے کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ ماونٹ بیٹن نے دباؤ کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے استصواب عامہ کا سوال اُٹھایا تو لایق علی نے نظام کی منظوری کے بغیر ہی تجویز قبول کرلی اور ماونٹ بیٹن کو اچھنبے میں ڈال دیا۔ کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ حیدرآبادی وفد کبھی بھی اس کے لئے تیار نہ ہوگا۔ اس شاطرانہ چال نے ماونٹ بیٹن کو زیر کیا۔ ماونٹ بیٹن نے اپنے سکریٹری کو طلب کیا اور میٹنگ کی روئیداد تحریر کروائی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

(۱) ''استصواب اس امر کا کہ آیا حیدرآباد ہندوستان میں شرکت کرے یا آزاد رہے۔

(۲) ایک طویل المیعاد سمجھوتہ کی حیثیت سے استصواب سے جو بھی فائدہ حاصل ہو وہ اس وقت تک مفید نہیں ہوسکتا جب تک ہندوستان اور حیدرآباد میں پوری طور پر خوش دلانہ تعلقات بحال نہ ہوں۔ اس لئے صرف ایک ہی بنیاد ہے جس پر کام ہوسکتا ہے اور وہ ایک عارضی سمجھوتہ ہے جو دوستی کو بحال کرنے کے لئے طے ہونا چاہئے۔

(۳) ایسے عارضی سمجھوتہ کی کامیابی کے لئے ہندوستان کی جانب سے اُمورِ ذیل انجام دیئے جاسکتے ہیں۔

الف : بعض عہدہ داروں کا تبدل

ب : گورنر جنرل کا حیدرآباد جانا

ج : نام نہاد ناکہ بندی کا خاتمہ اور فوری طور پر حیدرآباد کے مال کا روانہ ہونا۔

(۴) حیدرآباد کی جانب سے اس عارضی سمجھوتہ کو کامیاب بنانے اور آپس کے تعلقات کو بہتر شکل دینے کے لئے اہم قدم یہ اُٹھایا جائے گا کہ مساوات کی بنیاد پر نئی

حکومت تشکیل دی جائے گی۔ یہ تسلیم کیا گیا کہ مساوات کے لئے حکومت ہند کو اعتراض ہوگا لیکن حیدرآباد کے لئے اس سے آگے جانا ممکن نہیں ہے۔

(۵) نئی حکومت میں ۱۲ یا ۱۰ ارکان ہوں گے جن میں سے نصف بشمولِ وزیراعظم بڑے فرقے کے ہوں گے۔ قلمدانوں کی صحیح تقسیم ہوگی۔

(۶) دو یا تین ماہ کے اندر مساوات کی بنیاد پر مجلس دستور ساز قائم کی جائے گی۔

(۷) موجودہ مجلس مقنّنہ کو دستور ساز اسمبلی کے قیام تک طلب نہیں کیا جائے گا۔

(۸) استصواب کی نگرانی کسی بیرونی ادارہ کے ذمہ کیا جائے گا۔ اقوام متحدہ نامناسب ہے۔ دوسرے امکانات یہ تھے۔

الف : دولت عامہ

ب : عالمی عدالت کے ججوں کی جماعت

ج : سوئٹزرلینڈ یا سویڈن جیسے غیر جانبدار ملک سے کوئی کمیشن۔

(۹) استصواب کی تیاری کے لئے آزادیٔ تقریر، پریس اور ساری جماعتوں کو ریڈیو کے استعمال کی سہولت۔ کوئی حکومت یا حکومت کا امدادی ادارہ استصواب سے قبل فراہمی آراء کے لئے رقم صرف نہیں کرے گا، نہ رشوت دے گا نہ بیرونِ ریاست کے کسی ادارہ یا جماعت کو دخل دینے کا حق ہوگا۔"

(حیدرآباد کا عروج وزوال صفحہ ۱۹۹ و ۲۰۰)

جب یہ روئیداد حکومت ہند کے ایوانوں میں پہنچی تو کھلبلی مچ گئی جو ہونا تھا ہوا۔ نہرو پریشان ہوئے کہ حیدرآبادی وفد نے استصواب عامہ کی تجویز قبول کرکے بڑا وار کیا اور یہ کہ استصواب عامہ کا نتیجہ حیدرآباد کی آزادی میں آجائے تو حکومت ہند کا سارا منصوبہ ختم ہو جائے گا۔ حکومت ہند خاص طور پر نہرو اور پٹیل اس حقیقت سے واقف تھے کہ حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس، ہندو مہا سبھا اور آریہ سماج نے مل کر جو عوامی احتجاج کے بلند بانگ دعوے کئے تھے اور جسے حیدرآباد کے باہر پریس خاص طور پر ٹائمس آف انڈیا اور حکومت ہند کے ذرائع ابلاغ نے خوب اُچھال کر یہ تاثر دیا تھا کہ حیدرآبادی عوام موجودہ سیاسی نظام کے خلاف اور ذمہ دارانہ حکومت کے موافقت میں ہیں۔ استصواب عامہ کی

صورت میں صورت حال یہ تھی کہ مسلمان کے علاوہ شیڈ ولڈ کاسٹ اور قبائلی (جو آبادی کا ۳۶ فیصد تھے) کا ایک بڑا طبقہ جو اپنے رہنماء وینکٹ راؤ کے ساتھ تھا، خود کمیونسٹ (جن پر سے مئی ۱۹۴۸ء میں تحدیدات اُٹھالی گئی تھیں) اور ہندوؤں کا وفادار طبقہ حکومت حیدرآباد کی مخالفت اور حکومت ہند کے موافقت میں نہ تھا۔ خاص طور پر دیہاتی عوام جن پر مبالغہ آمیز پروپگنڈہ اور ستیہ گرہ کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا تھا اور حکومت حیدرآباد کے موجودہ نظام سے بالکل خوش تھے بادشاہ کے خلاف نہیں تھے (۹۰) فیصد سے زیادہ عوام موجودہ نظام کے موافق تھے۔ اس لحاظ سے استصواب عامہ کا نتیجہ حیدرآباد کی موافقت میں آنے کا یقین تھا۔ اس لئے فوراً پینترا بدلا گیا اور ماونٹ بیٹن کو اطلاع دی گئی کہ پہلے الحاق ہو اور اس کے بعد ہی استصواب عامہ کے ذریعہ اس کی توثیق ہو کہ الحاق صحیح ہوا ہے یا نہیں۔ وی۔ پی۔ مینین سے حیدرآباد کے وفد کی تلخ گفتگو ہوئی۔ آخر کار ۹/جون کو حیدرآباد کے مجوزہ مسودہ پر غور کرنا طے پایا۔ ۹/جون کو مینین نے حکومت ہند کی جانب سے یہ چار شرائط پیش کیں کہ :

(۱) دفاع، اُمورِ خارجہ اور مواصلات کے معاملہ میں حکومت ہند سے فوری الحاق ہو۔

(۲) ذمہ دارانہ حکومت کا فوری قیام ہو۔

(۳) رضاکار تنظیم فوری برخواست کی جائے۔

(۴) فوج کی مجموعی تعداد بیس ہزار ہوگی۔

اور کہا گیا کہ یہ عارضی انتظام ہے اور حکومت ہند چاہتی ہے کہ کامل الحاق ہو اور ذمہ دارانہ حکومت قائم کی جائے۔ ان سب اُمور کا تصفیہ ابھی اور اسی وقت کر دیا جائے۔ کوئی اور مسودہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ حکومت ہند کو جو سلوک کرنا تھا کیا۔ خود ان کے گورنر جنرل کی جو درگت بنی وہ قابل رحم تھی۔

سابقہ موقف سے حکومت ہند کے یکلخت انحراف سے ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی اور حیدرآباد کے وفد کے لئے ایک مشکل مسئلہ پیدا ہوگیا۔ وفد نے حکومت ہند پر واضح کیا کہ حیدرآباد کا وفد حکومت کی تجویز کے مطابق استصواب عامہ پر راضی ہوگیا تھا لیکن اب حکومت نئے شرائط کے ساتھ کامل الحاق اور ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے لئے اصرار کرتے ہوئے اپنے سابق موقف سے انحراف کر رہی ہے اور یہ ایسی باتیں ہیں جن کو قبول کرنے کا اختیار وفد کو نہیں ہے اس کا سارا اختیار نظام کو حاصل ہے اس لئے اس معاملہ کو نظام سے رجوع کیا جائے گا تا کہ وہ کوئی فیصلہ کریں۔

حیدرآبادی وفد واپس ہوا۔ اب کوئی ایسی توقع نہ تھی کہ ماونٹ بیٹن کی سبکدوشی یعنی ۲۱؍جون تک کوئی سمجھوتہ ہوجائے گا۔ وفد نے ساری تفصیلات نظام کو پیش کیں ۔ لائق علی نے ۱۱؍جون کو صحافتی کانفرنس میں حکومت ہند کے رویہ اور حیدرآباد کے موقف کی وضاحت کی اور کہا کہ آئندہ مذاکرات ہوں گے یا نہیں انھیں اس کا علم نہیں ۔ اسی دن نہرو نے نینی تال میں ایک جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے حیدرآباد کے تعلق سے عجیب عجیب باتیں کیں وہ یہ کہ حیدرآباد کا آزاد رہنا خطرہ سے خالی نہیں ۔ حیدرآباد کا آزاد رہنا ایک لغو بات ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہندوستان ختم ہوجائے ۔ بیرون ملک اور اندرون ملک کی صحافت پر بھی جو حیدرآباد کے موقف کی حامی تھی اور ہندوستان پر دھمکانے اور ڈرانے کے الزامات لگارہی تھی نہرو نے سخت تنقید کی۔

اسی دوران سرحدی شورشوں میں اضافہ کیا گیا۔ حیدرآباد کے وفد کے ساتھ مانکٹن واپس نہیں لوٹے بلکہ دہلی میں رہ کر ہی کسی نہ کسی سمجھوتہ کی کوشش میں لگے رہے۔ کچھ ہی دنوں میں مانکٹن نے نئی تجاویز کے ساتھ ایک طویل مسودہ روانہ کیا اور بتایا کہ وہ اور ماونٹ بیٹن چاہتے ہیں کہ ان کے جانے سے پہلے کوئی نہ کوئی معاہدہ طے پاجائے اس لئے وہ حیدرآباد کے وفد کی ۱۴؍جون کو دہلی میں آمد کے لئے بے چینی سے منتظر ہیں تاکہ وقت ضائع کئے بغیر کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کرلیا جائے۔ حیدرآباد کے وزراء کی کونسل نے ۱۳؍جون کو تجاویز پر غور کیا اور حکومت ہند کی بہت سی تجاویز قبول کرلیں تاہم بعض اقل ترین تحفظات کی خواہش ظاہر کی ۔ جن باتوں کو قبول کیا گیا اور تصفیہ کیا گیا تھا وہ درج ذیل ہیں :

"(۱) اُصول کی حد تک یہ طے کیا گیا کہ دفاع، اُمور خارجہ اور مواصلات میں متوازی قوانین حیدرآباد میں نافذ کئے جائیں گے۔

(۲) رضاکاروں کی فوجی نوعیت ختم کردی جائے گی اور رفتہ رفتہ اس جماعت کو برخواست کیا جائے گا۔

(۳) فوج کی ۲۰ ہزار کی تعداد بھی قبول کرلی گئی لیکن سابق کی طرح اگر اسلحہ اور امونیشن بروقت سپلائی نہ ہو تو حیدرآباد انھیں باہر سے درآمد کرے گا اور اس کی حمل و نقل کو ہندوستان میں روکا نہیں جائے گا۔

(۴) اس امر پر سختی سے اصرار کیا گیا کہ حیدرآباد کسی صورت میں اصولاً یا عملاً براہِ راست یا بالواسطہ ہندوستان کی بالادستی (پیرامونٹسی) کو تسلیم نہیں کرے گا۔

(۵) حیدرآباد کی معاشی آزادی کے استحکام کی ہندوستان ضمانت دے۔

(۶) ذمہ دارانہ حکومت کے جلد از جلد قیام کے سلسلہ میں نظام کے مجوزہ فرمان کا مسودہ بھی قبل از قبل حکومت ہند کے نمائندگان کو بتلا دیا گیا تھا جس میں بیان کیا گیا تھا کہ ۱۹۴۹ء میں ایک منتخب دستور ساز جماعت حیدرآباد کے لئے ایک جمہوری دستور بنانے کے لئے قائم کی جائے گی جو "حیدرآباد کی روایات کے مطابق اور اس بنیاد کے بموجب جو میں (نظام) بعد میں طے کروں گا"۔ دستور مرتب کرے گی خط کشیدہ الفاظ کو ماونٹ بیٹن اور زعماء ہند نے ابتدائی مباحث میں قبول کرلیا تھا اور ہندو اور مسلمانوں کی نشستوں کا جو تناسب ہونا چاہیئے وہ بھی ان کے ذہنوں میں تھا۔

(۷) فریقین میں اختلاف کی صورت میں ثالثی کرائی جائے گی جس کے فیصلہ کے دونوں پابند ہوں گے۔"

(حیدرآباد کا عروج وزوال صفحہ ۲۰۲)

ایٹم نمبر (۶) میں جو خط کشیدہ جملہ "حیدرآباد کی روایت کے مطابق اور اس بنیاد کی بموجب جو میں (نظام) بعد میں طے کروں گا" لکھا گیا تھا وہ بڑی طویل بحث کے بعد اور نہرو کی ایماء پر حکومت ہند کے وفد نے قبول کیا اور لکھا گیا۔ سابقہ مسودہ جو ۲۵ رمئی ۴۸ء کو مرتب ہوا تھا اس میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام میں اور دستور ساز اسمبلی میں غیر مسلموں کی تعداد (۶۰) فیصد اور مسلمانوں کی (۴۰) فیصد رکھی گئی تھی جو دونوں فریقین کی جانب سے طویل بحث کے بعد (۵۰)، (۵۰) فیصد کردی گئی تھی اور لایق علی نے اصرار کیا تھا کہ یہ تعداد صاف صاف فرمان میں لکھ دی جائے۔ لیکن نہرو کی ایماء پر حکومت ہند کے وفد نے کہا کہ اگر مساویانہ تعداد لکھ دی جائے تو ہندوستان کے رہنماؤں کے لئے ہندوؤں کو مطمئن کرنا بڑا مشکل ہو جائے گا کہ کس طرح اقلیتی طبقہ اکثریتی طبقہ کے مساوی حصہ پاسکتا ہے۔ اس لئے یہ بات مذبذب ہی رکھا جائے۔ اسی بنیاد پر خط کشیدہ کا جملہ رکھا گیا تاکہ اکثریتی

طبقہ کو مطمئن کیا جا سکے۔ اگر یہ جملہ نہ لکھا جاتا تو حسب تصفیہ مساوی مساوی تعداد لکھنا پڑتا جو حکومت ہند کے لئے قابل قبول نہ ہوتا۔

نظام نے وزارتی کونسل کی تجاویز کا بغور مطالعہ کیا اور اس نقطہ نظر سے کہ حکومت ہند سے سمجھوتہ ہو جائے کونسل کی تجاویز کو منظور کر لیا اور وفد کو دہلی روانہ کیا تاکہ ۱۴ ارجون کو سمجھوتہ پر دستخط کئے جائیں۔ وفد ان تجاویز کے ساتھ دہلی پہنچا۔ ماونٹ بیٹن نے وفد کا گرمجوشانہ استقبال کیا اور بتایا کہ انھوں نے اس معاملہ میں خاص دلچسپی لے کر سردار پٹیل سے دہرہ دون میں ملاقات کی ہے اور معاہدہ پر ان کی رضامندی حاصل کی ہے۔

مینن نے جیسے کہ ان کی عادت ہے پہلے تو خوشگوار انداز میں ملاقات کی لیکن جب گفتگو چھڑی تو حیدرآباد کی تجاویز کا مسودہ انھوں نے ایک طرف رکھ دیا، اپنا ایک دوسرا ہی مسودہ پیش کیا۔ لایق علی اچنبھے میں پڑ گئے چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ سابقہ مسودہ میں بنیادی تبدیلی کی گئی اور جن اُمور پر تصفیہ ہو گیا تھا وہ تبدیل کر دیئے گئے۔ جس میں سب سے اہم فوج کے تعلق سے تھا۔ حکومت ہند بیس ہزار فوج رکھنے کے لئے مان گئی تھی اب اس میں اضافہ فوجی اسکیم بابت ۱۹۳۹ء (State Forces Scheme '39) کے لاگو ہونے کی شرط بڑھا دی گئی جو اس سے قبل نہ تھی۔ یہ اسکیم انگریزوں کی جانب سے حیدرآباد کی فوج پر کنٹرول قائم کرنے بنائی گئی تھی جس کے ذریعہ فوج پر اقتدار اعلیٰ (پیرامونٹسی) کی بالادستی قائم کی گئی تھی اور فوج پر کنٹرول رکھا گیا تھا۔ اس طرح سے فوج کے دروازے سے حکومت ہند پیرامونٹسی برقرار رکھنا چاہتی تھی جب کہ حیدرآباد اس کے بالکل خلاف تھا اور یہ امر طے پا چکا تھا۔ مینن بہ ضد تھے کہ یہ اسکیم معاہدہ میں شامل کی جائے۔ لایق علی نے سمجھوتے کی خاطر اس کے بعض حصے شامل کرنے راضی ہو گئے لیکن وہ ساری اسکیم شامل کرنے پر مصر تھے۔ دوسری جدید شرط یہ تھی کہ ہندوستان کو کسی مفاجاتی حالت میں حیدرآباد کے کسی علاقہ پر فوج متعین کرنے کا حق ہوگا۔ یہ بات طے پا چکی تھی کہ صرف کسی بیرونی جنگ کی صورت میں ریاست حیدرآباد میں فوج رکھی جائے گی۔ لیکن حکومت ہند کا اصرار تھا کہ جب کبھی کسی وجہ سے حکومت ہند مفاجاتی حالات (Emergency) کا اعلان کرے تو اسے ریاست میں فوج بھیجنے کا حق ہوگا۔ اس وقت سرحدوں پر شورش اور حالات ایسے بنائے جا رہے تھے کہ مفاجاتی حالات کا اعلان کیا

جا سکے۔اس طرح سے حیدرآباد میں مستقل فوج رکھنے کی صورت نکالی جارہی تھی۔حیدرآباد معاشی، مالی اور تجارتی اُمور میں آزادی کا تیقن چاہتا تھا اسی لئے ان امور کو شریک معاہدہ کرنا چاہتا تھا لیکن حکومت ہند اس کو معاہدہ کا منسلکہ (Collateral) بنا کر ہمدردانہ غور کا وعدہ کررہی تھی اور یہ آزادی دینا نہیں چاہتی تھی۔ثالثی کے معاملہ کو غیر ضروری قرار دے کر اسے شریک معاہدہ نہیں کرنا چاہتی تھی جب کہ حیدرآباد مشکلات پیش آئے تو ثالثی ضروری سمجھ رہا تھا۔

حکومت ہند کا اصرار تھا کہ موجودہ مسودہ جوں کا توں قبول کرلیا جائے بصورت دیگر ہندوستانی وفد مذاکرات سے علحدگی اختیار کرے گا۔اس طرح سے یہ میٹنگ بغیر کسی نتیجہ کے ختم ہوئی دوسرے دن ماونٹ بیٹن اور نہرو سردار پٹیل سے ملنے دہرہ دون گئے اور وہاں سے واپس آئے۔ واپسی پر حیدرآبادی وفد نے ماونٹ بیٹن سے ملاقات کی تو ماونٹ بیٹن کو بڑا اسرداور مایوس پایا۔ماونٹ بیٹن نے گفتگو کی شروعات ہی اس شکایت سے کی کہ نہرو نے انھیں ایک رپورٹ حوالے کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ گذشتہ شب لایق علی نے معین نواز جنگ (جو اس وقت حیدرآباد میں تھے) سے فون پر گفتگو کرتے ہوئے مذاکرات کے ضمن میں حکومت ہند کے تعلق سے غیر موزوں باتیں کہی ہیں جو مذاکرات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔یہ رپورٹ حکومت ہند کے اس خاص عملہ نے نہرو کو دی تھی جنھیں ایسی راز کی باتیں ریکارڈ کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔لایق علی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ انھیں پریشان کرنے کا یہ ایک حربہ ہے۔گذشتہ شب انھوں نے معین نواز جنگ سے گفتگو ہی نہیں کی۔انھیں اس کا علم ہے کہ ہماری گفتگو حکومت کی ایجنسیاں نہ صرف سن رہی ہیں بلکہ ریکارڈ بھی کررہی ہیں۔ ایسی صورت میں کون بے وقوف ہے جو یہ خطرہ مول لے گا۔یہ رپورٹ بے بنیاد اور بنی بنائی ہوئی ہے۔سابق میں ایسے واقعات سے سابقہ پڑچکا ہے جس کا علم ماونٹ بیٹن کو بھی ہے۔ماونٹ بیٹن سمجھ گئے کہ یہ رپورٹ من گھڑت ہے۔انھوں نے کہا کہ فکر نہ کریں وہ نہرو کو اس بارے میں مطمئن کرادیں گے۔حیدرآبادی وفد اس واقعہ سے متاثر نہ ہوا اور مذاکرات جاری رکھا۔ماونٹ بیٹن اور حکومت ہند کے وفد نے کہا کہ موجودہ مسودہ سردار پٹیل کا منظورہ ہے اور اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں اس لئے معاشی، مالی، تجارتی اور ثالثی اُمور شامل کرنا دشوار ہے۔اس پر حیدرآبادی وفد واپس ہونا چاہا تو ماونٹ بیٹن نے کہا کہ فون پر نظام سے بات کی جائے اور انھیں راضی کرلیا جائے۔لایق علی نے معین نواز

جنگ سے فون پر بات کی اور نظام کی منظوری چاہی۔ جب اس کی اطلاع نظام کو دی گئی تو نظام نے کہا کہ جب تک وہ سارے معاملہ کے تعلق سے شخصی معلومات حاصل نہ کرلیں کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ اسی لئے حیدرآباد کا وفد واپسی کی تیاری کرنے لگا۔ اسی دوران گورنر جنرل کے کانفرنس سکریٹری کرنل کرم (Colnel Crum) نے مذاکرات کے کاغذات کا ایک پلندہ لایق علی کے حوالہ کیا۔

راستہ میں لایق علی نے جب ان کاغذات پر نظر دوڑائی تو انھیں بڑا صدمہ ہوا کہ نظام کی جانب سے جاری ہونے والے فرمان کا جو مسودہ تھا اس میں تبدیلی کی گئی تھی۔ خط کشیدہ الفاظ یعنی ''حیدرآباد کی روایت کے مطابق اور اس بنیاد کے بموجب جو میں (نظام) بعد میں طے کروں گا'' جو بڑے طویل مباحث کے بعد اور خود نہرو کی ایماء پر شامل کیا گیا تھا، حذف کردیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے حیدرآباد میں ایک ہلکا سا طوفان رہا اور نظام نے ۱۶/ جون کو ماونٹ بیٹن کے نام ایک ٹیلگرام روانہ کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ان کی کونسل نے مجوزہ معاہدہ کو قبول کرنے کا مشورہ نہیں دیا ہے اور جب تک حسب ذیل امور شامل نہ کیے جائیں معاہدہ قبول نہیں کیا جاسکے گا۔

''(۱) دستور ساز اسمبلی کے متعلق مسودہ فرمان میں یہ الفاظ بڑھائے جائیں کہ فرقہ جات کے تناسب کی بنیاد وہ ہوگی جو میں بعد میں طے کروں گا۔

(۲) عارضی حکومت کے متعلق الفاظ ''بڑی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کے مشورے'' حذف کیے جائیں۔ نظام نے توجیہ یہ پیش کی کہ ماونٹ بیٹن سے ملاقات کے خاتمہ کے بعد جب مسودات کی نقول لایق علی کو دی گئیں ان میں یہ الفاظ بڑھا دیئے گئے تھے۔ جن کا حیدرآباد واپس ہونے کے بعد لایق علی کو علم ہوا۔

(۳) معاہدہ میں حیدرآباد کی معاشی اور مالیاتی آزادی کی دفعہ شامل کی جائے۔

(۴) ثالثی کے دفعہ کا اضافہ کیا جائے۔''

(حیدرآباد کا عروج وزوال صفحہ ۱۸۴)

جس وقت یعنی ۱۶/ جون کو جب تار دیا گیا تھا مانٹن دہلی میں تھے۔ مسودہ کے تبدیلی کے تعلق سے معاملہ مانکٹن کے علم میں لایا گیا تھا لیکن لایق علی اور دیگر اراکین کو واقف نہیں کروایا گیا

تھا۔ مانکٹن ۱۶ ر جون کو حیدرآباد آئے اور بتایا کہ اس تبدیلی کا علم رکھتے ہیں اور نظام سے درخواست کی کہ ایک ٹیلگرام معافی یا افسوس کا روانہ کردیں۔ چنانچہ ۱۷ ر جون کو نظام نے تار دیا جو حسب ذیل تھا:

''جیسا کہ یورا کسلنسی کو علم ہے۔ والٹر مانکٹن دہلی سے ذریعہ طیارہ رات پہنچے اور آج صبح ...... وہ مجھ سے ملے۔ انھوں نے مجھے مطمئن کیا ہے کہ مسودہ فرمان میں وہ تبدیلیاں جن کا حوالہ میں نے اپنے تار مورخہ ۱۶ ر جون میں دیا ہے، اُن مسودات میں موجود تھیں جو انھوں نے دوشنبہ بتاریخ ۱۴ ر جون ملاحظہ کئے تھے اور وہ سمجھتے ہیں کہ میرے وزیراعظم کو یہ نقول اسی دن دوپہر کو وصول ہوگئی تھیں۔ ان حالات میں اپنی پہلی فرصت میں میں اپنے تار سے پیدا شدہ اثرات کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے نمائندوں کو آخر وقت تک ان تبدیلیوں کا علم نہیں کرایا گیا تھا۔ چوں کہ دونوں فریقین کی جانب سے متعدد مسودات تیار کئے گئے تھے اور میرے وفد کے ارکان یورا کسلنسی اور آپ کی حکومت کے متعدد نمائندوں سے مباحث میں مسلسل مصروف رہے اس لئے اس معاملہ میں غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان تھا۔ میں نے اپنا تار اس وقت روانہ کیا تھا جب سر والٹر مانکٹن دہلی میں تھے اگر وہ یہاں ہوتے تو یہ غلطی پیدا نہیں ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ گفت و شنید نے طوالت اختیار کی ہے اور ہم سب آخری سمجھوتہ پر پہنچنا چاہتے ہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ دو ایک روز میں اس کا تکمیل پانا ناممکن ہے۔ اکثر اہم معاملات میں سمجھوتے کے امکانات روشن ہوگئے ہیں لیکن اب بھی ایسے سوالات ہیں کہ آخری نتیجہ پر پہنچنے سے قبل ان کا تصفیہ پانا باقی ہے۔ بلاشبہ فرمان کے صحیح الفاظ کیا ہونا چاہئے اس پر ہم متفق ہوسکتے ہیں لیکن مالیاتی آزادی اور حیدرآباد کی سمندر پار برآمدی تجارت پر کنٹرول کو ہندوستان نے اُصول کی حد تک بھی تسلیم کرنے سے جو انکار کیا ہے اس پر میری کونسل کو بڑی تشویش ہے۔ میرے وزیراعظم نے بہت پہلے پنڈت نہرو اور آپ سے مباحث کے وقت اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس کے بعد اس معاملہ کو عملی صورت دینے کے لئے مسٹر مینن کو ایک مسودہ بھی دیا گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ مسئلہ ایسا ہے جس پر تفصیلی چھان بین کی ضرورت ہے لیکن میں تو اُصول کی حد تک اس کی قبولیت

چاہتا ہوں۔علاوہ ازیں میری کونسل مجھے یہ مشورہ دینے کے موقف میں نہیں ہے کہ مفاجاتی حالات میں جس کا جب بھی ہندوستان کی جانب سے اعلان ہوگا حیدرآباد کے سرحدی علاقوں کے سوا ہندوستانی فوج کو پڑاؤ کی اجازت نہیں دی جاسکتی ۔ میں کسی بھی شدید مفاجاتی حالت میں ہمیشہ تعاون کے لئے تیار ہوں۔پھر ثالثی کا مسئلہ بھی ہے،جس کا میں نے اپنے گذشتہ تار میں حوالہ دیا ہے۔

چوں کہ ان وجوہات کی بناء پر مسودات کو ان کی موجودہ صورت میں میں قبول نہیں کرسکتا میری مخلصانہ توقع ہے کہ گفت وشنید کو جاری رکھا جائے تاکہ بہت ہی قلیل مدت میں سمجھوتہ کی تکمیل ہوجائے۔حیدرآباد ایک خوش آئند سمجھوتہ پر پہنچنے میں یور اکسلنسی کی آمادگی کا ہمیشہ ممنون رہے گا جس کے لئے ہم ہمیشہ شکر گذار رہیں گے۔"

(حیدرآباد کا عروج وزوال صفحہ ۱۸۸ و ۱۸۹)

ان حالات کے مدنظر لایق علی نے ۷ ارجون کو صحافتی کانفرنس میں تمام حالات پر روشنی ڈالی۔ کہا کہ حیدرآباد ہندوستان سے دوستی اور پرامن ماحول میں رہنا چاہتا ہے اسی لئے ایسا ہی ایک دوستانہ باوقار معاہدہ چاہتا ہے۔لیکن ہندوستان اپنی بالادستی کو لاگو کرنا چاہتا ہے اور آئے دن نئے مطالبات پیش کرتے ہوئے انھیں قبول کرنے پر اصرار کررہا ہے۔حتی کہ ہم نے حکومت ہند کی استصواب عامہ کی تجویز قبول کی لیکن وہ مکر گئی اور کامل الحاق کا مطالبہ کیا۔ ہماری خواہش ہے کہ ایک دوستانہ معاہدہ کے تحت دوستی اور امن کے ماحول میں رہیں۔

دوسرے دن نہرو نے پریس کانفرنس منعقد کی اور معاہدہ کا مسودہ رکھتے ہوئے کہا مسودہ تیار ہے نظام جب چاہیں دستخط کرسکتے ہیں۔ معاشی ناکہ بندی جاری رہے گی اور سرحدات پر سختی سے نمٹا جائے گا۔معاہدہ اور مذاکرات کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے حیدرآباد کے راضی نہ ہونے کا تذکرہ کیا اور اس کی ذمہ داری حیدرآباد پر عائد کرنے کی کوشش کی۔حکومت ہند کے موقف اور رویہ میں جو بار بار تبدیلی ہوتی رہی جس کی وجہ سے کوئی معاہدہ طے نہ پاسکا اس کا تذکرہ نہیں کیا۔رضا کاروں پر سخت تنقید کرتے ہوئے الزام لگایا کہ حکومت حیدرآباد ان کے زیر اثر کام کررہی ہے۔ترش اور دھمکی آمیز انداز میں کہا کہ حیدرآباد حکومت ہند کا اقتدار اعلیٰ قبول کرتے ہوئے الحاق کے لئے راضی

ہو جائے ورنہ الحاق کے لئے راست اقدام کئے جائے گا۔ حکومت ہند چاہتی تو حملہ کسی بھی وقت ممکن تھا لیکن وہ چاہتی تھی کہ معاملہ گفت وشنید سے طے پا جائے۔ فوج تیار ہے حملہ کسی وقت بھی ممکن ہے۔ اس طرح سارا الزام حیدر آباد پر رکھا کہ وہ معاہدہ کرنے تیار نہیں ہے۔

اسی رات لایق علی نے نظام سے صاف صاف گفتگو کی اور بتایا کہ اب راستہ سوائے جنگ کے سوا دوسرا نہیں ہے۔ مقابلہ طاقتور اور کمزور کے درمیان ہے۔ حق اور طاقت کا مقابلہ ہے۔ حیدر آباد کے پاس صرف حق کی طاقت ہے۔ باوقار زندگی وہی ہے جو حق کی طاقت کے ساتھ لڑی جائے۔ ان حالات میں آپ آزاد ہیں جو بھی تصفیہ کریں میں اور میری کابینہ مستعفی ہو کر آپ کو اس معاملہ میں پوری آزادی دینا چاہتے ہیں۔ نظام نے بڑی ہمت اور مضبوط انداز میں کہا کہ وہ بے عزتی اور ناانصافی زندگی گذارنا نہیں چاہتے۔ دیکھا جائے گا جو بھی ہوگا۔ نظام سے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے لایق علی محل سے واپس ہوئے۔ اسی طرح مذاکرات کا انقطاع عمل میں آیا جس کی ساری ذمہ داری حکومت ہند پر ہی عائد ہوتی ہے۔

ان تمام حقائق کا بغور جائزہ لیں تو یہ بالکل صاف ہے کہ حیدر آباد اپنے سابقہ موقف کو چھوڑ کر محض اس نقطۂ نظر سے کہ کوئی نہ کوئی باعزت سمجھوتہ طے پا جائے اور امن وسکون کے ساتھ ہندوستان سے وابستہ ہو جائے بہت دور نکل گیا تھا۔ لیکن حکومت ہند کی نیت صاف نہیں تھی۔ وہ کوئی ایسا معاہدہ کرنا نہیں چاہتی تھی جس کی وجہ سے حیدر آباد کی تھوڑی بہت آزادی بھی باقی رہ سکے۔ وہ تو کاملاً الحاق چاہتی تھی معاہدہ کے ذریعہ ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ فوجی برتری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہ مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی۔

حیدر آباد دفاع، اُمور خارجہ اور مواصلات تو حکومت ہند کے حوالہ کر چکا تھا۔ فوج کی تعداد بھی حکومت ہند کے مطالبہ کے مطابق صرف بیس ہزار رکھنے پر راضی ہو گیا تھا۔ رضا کار تحریک کو بھی بتدریج ختم کرنے تیار ہو گیا تھا۔ ذمہ دارانہ حکومت کا قیام جو مسلم سلطنت کی بقاء کے مغائر تھا اور جس کو حیدر آباد نے کبھی بھی قبول نہیں کیا تھا، راضی ہوا اور سب سے اہم اپنا موقف کھو دیا۔ زندہ رہنے کے لئے صرف معاشی، مالی، تجارتی آزادی چاہتا تھا جو انگریزوں کے دور سے حاصل تھی۔ البتہ پیراموئنسی جو انگریزوں کا مسلط کردہ غیر قانونی اُصول تھا قبول کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ثالثی کا مطالبہ غیر جمہوری اور

غیر اُصولی نہ تھا۔ جب معاہدات ہوں اور کوئی مشکل پیدا ہو جائے تو ثالثی سے ہٹ کر اور کیا راستہ ہوسکتا تھا۔ اگر حکومت ہند یہ سمجھتی تھی کہ ثالثی الحاق کے مطالبہ کے ضمن میں حائل ہوگی تو نیت صاف نہ تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک آزاد مملکت اپنی بچی کچی آزادی کے لئے کیا اتنے تحفظات کے مطالبہ میں حق بجانب نہ تھی۔ افسوس کہ ہندوستان جسے آزاد ہوئے صرف ایک سال کا عرصہ بھی نہ ہوا تھا جمہوریت اور گاندھی جی کے بنائے ہوئے انصاف پسند اُصولوں سے رد گردانی کرتے ہوئے مغربی جمہوری اور ڈکٹیٹرانہ انداز کو اپنایا اور انصاف پسندی کا خون کرنے کا سیاہ دھبے کے ساتھ تاریخ کا باب ختم کیا۔

ہیجانی دور اور حالات سے نبٹنے کے منصوبے

ماونٹ بیٹن اپنے عہدہ سے سبکدوشی کے بعد ۲۱/ جون کو لندن واپس ہو گئے۔ معاہدہ کروانے کی ان کی تمام تر کوششیں کو حکومت ہند نے ناکام بنادیا۔ مذاکرات کا انقطاع حکومت ہند کے غیر مفاہمتی طرزِ عمل کی وجہ سے عمل میں آیا۔ حکومت ہند حیدرآباد کو کسی شکل میں ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے باقی رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کسی طرح سے ہندوستان میں ضم کرنے یا بہ زور طاقت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ جواہر لال نہرو نے مذاکرات کے اختتام کا اعلان کیا لیکن اس کے باوجود بھی حیدرآباد مذاکرات جاری رکھنا چاہتا تھا تاکہ کوئی باعزت سمجھوتہ ہو جائے۔ حالات نے حیدرآباد کے لئے محدود راستے چھوڑ دیئے وہ یہ کہ (۱) مفاہمت کی کوئی راہ نکالی جائے (۲) حالات کا سامنا کریں (۳) باہر کی دنیا سے حق و انصاف کی بھیک مانگے (۴) پاکستان کس حد تک مدد کرسکتا ہے اور (۵) حملہ ہو تو مدافعت کے لئے فوجی طاقت بنائے رکھے۔

مذاکرات کے اختتام نیز مزید مذاکرات نہ کرنے کے نہرو کے اعلان کے بعد لایق علی نے نظام سے مل کر صاف صاف کہا تھا کہ وہ اور ان کی کابینہ مستعفی ہو کر نظام کو کامل اختیارات سونپنا چاہتے ہیں تاکہ حالات کے لحاظ سے وہ آزادانہ اقدامات کریں۔ مگر نظام نے اس تجویز کو نامنظور کرتے ہوئے کہا کہ وہ بے عزتی کی زندگی جینا نہیں چاہتے۔ لیکن اس کے برخلاف درباریوں کے اثر اور بادشاہت کی بقا کی فکر نے نظام کو ان کے عزم پر قائم نہیں رکھا۔ درباریوں کے ذریعہ درپردہ مفاہمت کی راہ نکالنے کی کوشش کی گئی۔ سر مرزا اسمٰعیل کے جو سابق میں صدر اعظم رہ چکے تھے نظام سے تعلقات برقرار تھے۔ کانگریسی ذہن رکھتے تھے ان کے حکومت ہند سے اچھے تعلقات تھے۔ چنانچہ انھوں نے نظام کو لکھا کہ وہ اپنے تعلقات کی بنا پر دہلی جاکر معاملہ کی یکسوئی کریں گے۔ انھیں نظام نے اس کی اجازت دے دی حالاں کہ سر مرزا اسمٰعیل مجلس اور مسلمانوں کے لئے بالکل ناپسندیدہ تھے۔

انھیں ہندو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ ہر دو طبقے میں ناپسندیدہ تھے۔ ان کی نقل و حرکت سے ہر ایک کے کان کھڑے ہوگئے۔ سر مرزا اسمٰعیل ۲۸ ر جولائی دہلی پہنچے اور حکومت ہند کے ذمہ دار لوگوں سے گفتگو شروع کی۔ ان کی یہ کوشش جب طشت از بام ہوئی تو لایق علی نے ایک دن نظام سے اس بارے میں دریافت کیا۔ نظام نے روکھے انداز میں کہا کہ وہ ایک مطلق العنان بادشاہ ہیں، ان کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں وہ کسی سے بھی بات کر سکتے ہیں۔ لایق علی کو نظام کے اس غیر متوقع رویہ پر بڑا اچھبا ہوا اور وہ فوری دفتر گئے اور اپنا استعفیٰ روانہ کر دیا۔ نظام نے فوراً طلب کیا اور تفصیلی گفتگو کی۔ نظام نے کہا کہ یہ ان کا اختیار ہے کسی سے بھی بات کریں اور یہ کہ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا مخالف کے پاس کوئی اچھی تعمیری تجویز ہے جس سے مفاہمت کا راستہ نکلے۔ لیکن جائزہ لینے کے بعد میں مطمئن ہوا کہ ایسا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس ملاقات میں نظام نے ان کے اور مرزا اسمٰعیل کے درمیان جو مراسلت ہوئی اور جس سے لایق علی کو واقف نہیں کرایا گیا تھا لایق علی کے حوالے کیا تا کہ تفصیلات سے واقف ہوں۔ اس طرح لایق علی اور نظام میں غلط فہمی کا ازالہ ہوا۔ لایق علی نے نظام سے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں جسے چھپایا جائے اور عوام کی بے چینی دور کرنے کے لئے سر مرزا اسمٰعیل کے مشن کے مقصد کو صحافت کے حوالے کیا جائے، لیکن نظام راضی نہیں ہوئے اور کہا کہ محکمہ خارجی اُمور کی جانب سے یہ وضاحت جاری کر دی جائے کہ مرزا اسمٰعیل کا دورہ صرف شخصی ہے اور اس کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں ہے۔ چنانچہ ایک ایسا ہی اعلان جاری ہوا۔

مرزا اسمٰعیل تین روز تک دہلی میں گورنر جنرل کے تعلقات کی بنا پر ان کے مہمان کی حیثیت سے گورنمنٹ ہاوز میں مقیم رہے اور اس کے بعد نظام پیلس منتقل ہوئے تا کہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔ وہ سوائے راجگوپال چاری اور وی۔ پی۔ مینن کے حکومت ہند کے زعماء، نہرو اور پٹیل سے ملاقات نہ کر سکے۔ ۲۹ ر جولائی کو نظام کو تار دیا کہ دہلی کے حالات بہت خراب ہیں وہ فوری لایق علی کو بھیجیں تا کہ بعد گفتگو کوئی نہ کوئی صورت نکالی جا سکے۔ نظام نے جواب دیا کہ لایق علی کو بھیجنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ سابقہ تحفظات میں سے ایک یا دو تحفظات معاہدہ میں شامل کرنے کے آثار ہیں تو لایق علی کو روانہ کیا جا سکتا ہے۔ ابتداء اگست میں مرزا اسمٰعیل نے حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل زین یار جنگ کے ذریعہ دو خطوط ایک بنام نظام اور دوسرا لایق علی کے نام

روانہ کیا۔ لایق علی کے خط میں مرزا اسمٰعیل نے لکھا کہ وہ فوری دہلی آئیں اور سابقہ معاہدہ میں ضروری ترمیمات کے ساتھ دستخط کردیں ورنہ حالات ناگفتہ بہہ ہیں۔ لایق علی نے نظام سے ملاقات کی اور ان سے مرزا اسمٰعیل کے خط کا تذکرہ کیا دوسری طرف نظام نے بھی ان کو روانہ کردہ خط کا متن بتلایا جس میں لکھا گیا تھا کہ لایق علی کو فوری ان اختیارات کے ساتھ روانہ کریں کہ سابقہ معاہدہ میں حکومت ہند کی منشاء کے مطابق تبدیلی کرتے ہوئے وہ دستخط کے مجاز ہیں۔ مزید لکھا کہ نظام کے جان و مال کے خطرے کے پیش نظر حکومت ہند کی فوج کو بلارم میں تعین کرنے کی اجازت دیں اسی طرح سے جس طرح سے کہ انگریزوں نے رکھی تھی۔ اسی اقدام سے حکومت ہند خوش ہوجائے گی اور معاہدہ کی ایک صورت نکل آئے گی۔ دوسری بات جو لکھی تھی کہ وہ فوری موجودہ حکومت کو برخواست کردیں چوں کہ حکومت ہند کو اس حکومت پر بالکل بھروسہ نہیں۔ نظام نے سر مرزا کی ان تجاویز کو قبول نہیں کیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بگڑتے ہوئے حالات سے فائدہ اُٹھانے کے لیے درباریوں نے یہ چال چلی تھی جس میں زین یار جنگ کے ملوث ہونے کے آثار نمایاں تھے۔

زین یار جنگ کی ذمہ داری تھی کہ وہ دہلی کے حالات سے حیدرآباد کو باخبر رکھیں اور صحیح اطلاعات پہنچاتے رہیں تاکہ بدلتے ہوئے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اقدامات کیے جاسکیں۔ لیکن زین یار جنگ سے جو رپورٹس مل رہی تھیں وہ غیر واضح، بے ربط اور توقع کے مطابق نہیں تھیں اسی لئے صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں دشواری ہورہی تھی۔ چنانچہ جولائی کے مہینے میں جب وہ حیدرآباد آئے تو نظام سے طویل ملاقات کی۔ دہلی کے حالات سے واقف کرواتے ہوئے نظام کو حکومت ہند کے حملہ کے تعلق سے مطلع کیا تھا۔ نظام سے گفتگو کے بعد انھوں نے لایق علی سے بھی ملاقات کی اور دہلی کے حالات سے واقف کرواتے ہوئے کہا تھا کہ ہوم منسٹری بے چین ہے کہ جلد از جلد حملہ کیا جائے۔ لیکن ڈیفنس منسٹری اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ مزید چار یا پانچ ماہ یعنی معاہدہ انتظام جاریہ کے اختتام سے قبل حملہ ممکن نہیں۔ زین یار جنگ کی رپورٹ پر تبادلہ خیال کرنے کی غرض سے لایق علی نے دوسرے دن نظام سے ملاقات کی۔ دونوں نے جب زین یار جنگ کی دی ہوئی اپنی اپنی رپورٹس کا جائزہ لیا تو بڑا اختلاف پایا۔ نظام کو زین یار جنگ نے مطلع کیا تھا کہ حکومت ہند نے حملہ کی پوری تیاری کرلی ہے اور حملہ کسی بھی وقت ممکن ہے جب کہ لایق علی سے کہا تھا کہ حملہ معاہدہ انتظام جاریہ کے اختتام یعنی

نومبر سے قبل ممکن نہیں ہے۔

ایسی ہی غلط ملط اور گڈمڈ رپورٹیں تھیں جس کی وجہ سے نظام نے زین یار جنگ کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا اور فوری موزوں شخص کی تلاش کا حکم دیا۔ایک سینیر سیول سرونٹ احمد محی الدین رضوی کا انتخاب عمل میں آیا۔لیکن ان کے نام کے ساتھ رضوی ہونے کی وجہ سے غلط فہمی کا امکان تھا کہ حکومت ہند قاسم رضوی سے ان کی قربت یا رشتہ داری سمجھ نہ بیٹھے۔ابھی یہ معاملہ زیر غور ہی تھا کہ زین یار جنگ نے کچھ دن انھیں دہلی میں رکھنے کی درخواست کی کیوں کہ ان کی اہلیہ کے پاؤں کے فریکچر کا علاج دہلی میں ہو رہا تھا۔زین یار جنگ کے ذریعہ مرزا اسمٰعیل کو استعمال کرتے ہوئے معاہدہ کی صورت گری کی جو راہ ہموار کی جارہی تھی اس کا مقصد حکومت ہند کی فوج کو حیدرآباد میں متعین کرنا تھا۔مگر یہ منصوبہ ناکام رہا۔

حکومت ہند نے معاشی ناکہ بندی بڑی سخت کردی۔اس سخت ناکہ بندی کا مقابلہ کرنا انتہائی دشوار ہوگیا تھا۔پٹرول، ڈیزل، دوائیں اور کئی ضروریات کی چیزیں روک دی گئی تھیں۔پٹرول، ڈیزل اور تیل کا ایک قطرہ بھی نہیں آرہا تھا اور کے۔یم۔منشی دکھشن سدن میں بیٹھے اس بات پر خوش ہو رہے تھے کہ دیکھیں کہ اب حیدرآباد ان معاشی مشکلات سے کیسے نبٹ سکے گا؟ لیکن انھیں اس وقت حیرت ہوئی ہوگی جب حیدرآبادیوں نے پٹرول اور ڈیزل کے متبادل الکحل کے ذریعہ گیسولن بنانے کا راستہ ڈھونڈ نکالا اور ایسی ہی ہر ضرورت پر قابو پالیا۔قابل تعریف تھے حیدرآباد کے عوام جنھوں نے اس شدید صورت حال کا مقابلہ کیا اور حکومت ہند کو اس اہم محاذ پر ناکام کیا۔

سرحدی شورشوں میں شدید اضافہ کیا گیا۔سرحدات کے اطراف حکومت ہند کی فوجیں متعین کردی گئی تھیں جو شورشوں کے اضافہ میں ملوث تھی۔حیدرآباد دفاعی پالیسی پر تھا اور فوج کی اشتعال انگیزی پر الجھنا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ اس سے اشتعال انگیزی کا مزید موقع ملتا۔اسی پالیسی کے تحت حیدرآبادی افواج کو سرحد سے تین میل اندر متعین کیا گیا تھا۔سرحدوں پر پولیس، کسٹمس کے جوان اور سیول گارڈس جیسے معمولی جوانوں کو تعینات کیا گیا تھا۔اس کے باوجود حکومت ہند کی فوج شورش پیدا کرنے میں راست ملوث تھی چنانچہ ضلع عثمان آباد کے ایک محصورہ سرحدی گاؤں نانج کا ایک مشہور واقعہ پیش آیا۔نانج سے پولیس اور سیول گارڈس مسلسل شکایت کررہے تھے کہ ہندوستانی افواج ہتک

آمیز رویہ اختیار کر رہی ہیں اور شدید خطرہ لاحق ہے۔ اس لئے فوری فوج متعین کی جائے۔ اس مقام پر صرف (۷) جوانوں پر مشتمل حیدرآبادی دستہ تھا جو کچھ ۳۰۳ رائفلیں، اسٹین گن اور بھر مار جیسے ہتھیار سے لیس تھا۔ قلیل اسلحہ دیا گیا تھا جو ہر بندوق کے لئے (۱۰) راؤنڈ مہیا کرتا تھا۔ ہندوستانی افواج کی بار ہا ہتک آمیز سلوک سے تنگ آکر ان چند جانبازوں نے ٹھان لیا کہ انھیں سبق سکھایا جائے۔ ایک دن حکومت ہند کی فوج نے فائرنگ کی تو یہ جوان بھی حملہ کے لئے تیار ہو گئے اور سرنگوں میں پناہ لیتے ہوئے فائرنگ کی۔ اس پر حکومت ہند کی فوج حملہ آور ہوئی۔ فوج کو سرنگوں کے قریب تک آنے دیا اور جب وہ قریب آئی تو شدید فائرنگ کرتے ہوئے کئی گاڑیوں کو مار گرایا۔ فوج گاڑیاں چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ ان گاڑیوں میں طاقتور اسلحہ تھا جنھیں حاصل کر کے فوج پر حملہ کیا گیا اور کئی گھنٹوں تک مقابلہ ہوا۔ جب فائرنگ ختم ہوئی تو سات جانباز شہید ہو گئے تھے اور حکومت ہند کے (۷۰) سے زیادہ فوجی مارے گئے اور کئی زخمی ہو گئے تھے۔ اس کے بعد حکومت ہند کی فوج نے نانج گاؤں پر قبضہ کیا۔ اس کو واپس لینے کے لئے حیدرآباد میں بڑا ہنگامہ ہوا لیکن محض احتیاط کے نقطہ نظر سے خاموشی اختیار کی گئی۔ اس جھڑپ کی وجہ سے حیدرآباد کے معمولی سپاہیوں کی بہادری کا اثر حکومت ہند کی فوج پر پڑا۔ لیکن ساتھ ہی حیدرآباد کے کمزور اسلحہ اور کمزور دفاع کا بھی اندازہ ہو گیا۔

حیدرآباد کی ہوائی سرویس دکن ایرویز کے نام سے چلائی جاتی تھی جو دہلی، بمبئی، مدراس اور بنگلور جاتی تھی۔ اس ایرویز کی پرواز کا لائسنس حکومت ہند نے جولائی میں منسوخ کر دیا اور ہوائی راستہ بند کر دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد گرانڈ ٹرنک اکسپریس ریل جو مدراس سے نکل کر براہ حیدرآباد دہلی جاتی تھی اس کا رُخ موڑ دیا گیا اور حیدرآباد کے باہر سے کر دیا گیا۔ حیدرآباد کے لوگ اس طرح باہر کے سفر سے قاصر رہے۔ تار اور ٹیلی گرام بھی وصول نہیں کئے جانے لگے۔ فون سے گفتگو بھی مشکل ہو گئی چوں کہ یہ ریکارڈ کی جا رہی تھی۔ اس طرح سے حیدرآباد کو باہر کی دنیا سے کاٹ دیا گیا۔

ماؤنٹ بیٹن کے بعد راجگو پال چاری گورنر جنرل بنائے گئے۔ وہ حیدرآباد سے ہمدردی رکھتے تھے۔ مدراس کے چیف منسٹر جب تھے اس وقت سے حیدرآباد سے قریب ہو گئے تھے۔ گورنر جنرل بننے کے بعد حیدرآباد کے مسئلہ کو سلجھانے میں دلچسپی لینے لگے تو حکومت میں طوفان کھڑا ہوا اور دلچسپی نہ لینے کی وارننگ دی گئی۔ انھیں خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ لیکن وہ دل کی بات چھپا نہ سکے اور

بیشتر مواقعوں پر انھوں نے یہی کہا ''گورنر جنرل کا عہدہ بے فیض ہے''۔ نہرو اور پٹیل پر سفارتی اثر و رسوخ بھی کام نہیں کر سکا۔ ان تمام مراحل سے گذرنے کے بعد نظام نے ہز میجسٹی کنگ جارج ششم برطانیہ، پریسڈنٹ ٹرومن امریکہ، کلمینٹ اٹلی وزیراعظم برطانیہ کو بڑے دلگیر انداز میں خطوط لکھے کہ جارحانہ عزائم اور متوقع حملہ سے باز رکھنے کے لئے حکومت ہند پر وہ اپنا اثر استعمال کریں۔ لایق علی نے بھی اسی طرح سے چرچل کو جو اس وقت برطانیہ میں اپوزیشن لیڈر تھے خط لکھا۔ صدر امریکہ اور جارج ششم نے حالات پر بڑا دکھ اور افسوس کا اظہار کیا اور کسی قسم کی مدد کرنے سے یہ کہتے ہوئے مجبوری کا اظہار کیا کہ معاہدہ انتظام جاریہ کے ذریعہ حیدرآباد کے امورِ خارجہ، دفاع اور مواصلات حکومت ہند کے حوالے کئے گئے ہیں اس لئے اس معاہدہ کے جاری رہنے یعنی ۲۸ر نومبر ۴۸ء تک وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ دہلی میں امریکہ اور برطانیہ کے سفارت خانوں کے ماسواء سب نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ برطانیہ کا سفارت خانہ حیدرآباد کے خلاف کام کر رہا تھا اور حکومت ہند کی مدد میں لگا ہوا تھا۔ وزیراعظم کلمینٹ اٹلی اپنی مفادات کے خاطر ہندوستان سے دوستانہ تعلقات بڑھانے میں لگے ہوئے تھے شائد اس لئے وہ حیدرآباد کے خلاف تھے حالاں کہ نظام نے انگریزوں کی ہر لحاظ سے مدد کی تھی لیکن اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ مسٹر چرچل نے لایق علی سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا اور ان کی مدد کا وعدہ کیا۔

ان تمام سے مایوسی کے بعد حق و انصاف کی بھیک مانگنے کے لئے صرف اقوام متحدہ باقی رہ گیا تھا۔ اگست ۴۸ء میں اس معاملہ کو اقوام متحدہ سے رجوع کرنا طے پایا۔ مانکٹن سے مشورہ کیا گیا جنھوں نے رائے دی کہ حیدرآباد اقوام متحدہ کا ممبر نہ ہوتے ہوئے بھی اقوام متحدہ کے دستور فقرہ ۳۵ (۲) کے تحت (جس کے تحت سکیورٹی کونسل کو اختیار ہے کہ غیر ممبر کے معاملہ بھی قبول کرے) معاملہ سکیورٹی کونسل میں لے جا سکتا ہے۔ علی یاور جنگ نے مقدمہ تیار کیا۔ معین نواز جنگ کی سرکردگی میں وفد بنایا گیا۔ معین نواز جنگ شیام سندر کے ساتھ ۱۰ر ستمبر کراچی پہنچے اور وہاں سے یہ وفد پیرس روانہ ہوا جہاں سکیورٹی کونسل کا اجلاس ہونے والا تھا۔ ظہیر احمد اس وفد کے سکریٹری تھے جن کی دستخط سے مقدمہ دائر کیا گیا۔ تاہم نظام کو سکیورٹی کونسل سے فوری اقدامات کی توقعات نہ تھیں۔

ان حالات میں ہندوستان کا فوجی حملہ کسی وقت بھی ممکن تھا۔ ایسے میں جو بھی فوجی طاقت تھی

اسے اکٹھا کرنے اور مزید طاقت بڑھانے کے اقدامات کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ معاہدہ انتظام جاریہ کے منسلکہ (Collateral Letter) میں یہ گنجائش تھی کہ حکومت ہند حیدرآباد کی ضرورت کے مطابق اسلحہ سپلائی نہ کرے تو حیدرآباد کو اختیار تھا کہ وہ کہیں سے بھی اسلحہ حاصل کرے۔ باوجود مطالبہ کے جب حکومت ہند نے اسلحہ سپلائی نہیں کیے تو منسلکہ گنجائش سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اسلحہ باہر سے خریدنا طے پایا۔ میر نواز جنگ ایجنٹ جنرل حیدرآباد متعینہ لندن نے اطلاع دی کہ وہ اسلحہ تو فراہم کرسکتے ہیں مگر اس کی پرواز کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ ایک منصوبہ بنایا گیا جس کو نظام نے بڑے غور و فکر کے بعد منظور کیا اور اس مقصد کے لئے (۳۰) ملین اسٹرلنگ پونڈ کی خطیر رقم بھی منظور کی۔ ایجنٹ جنرل لندن کے سپرد یہ کام سونپا گیا مگر مختلف دشواریوں کی وجہ سے اسلحہ لے جانے میں دقت پیش آرہی تھی۔ اسی دوران آسٹریلیا کے ایک پائیلٹ سڈنی کاٹن جس نے برٹش قومیت اختیار کرلی تھی لائق علی سے ملاقات کی اور کہا کہ وہ حیدرآباد سے روغن بیج لے جائے گا اور باہر سے ضروری اشیاء حیدرآباد منتقل کرے گا۔ مزید محتاط انداز میں کہا کہ وہ اسلحہ اور دفاعی ساز و سامان بہ آسانی منتقل کرسکتا ہے۔ سڈنی کاٹن کے بارے میں ایجنٹ جنرل لندن سے اطمینان حاصل کرلینے کے بعد ضروری اشیاء، اسلحہ اور دفاعی ساز و سامان منتقل کرنے کا کام ایک معاہدہ کے ذریعہ سڈنی کاٹن کے حوالے کیا گیا۔ معاہدہ بڑا ڈھیلا ڈھالا تھا۔ روز (۴) ٹرپ کرنا ہر رونڈ ٹرپ کا معاوضہ (۵۰) ہزار روپئے تھا اور ایک مقررہ مدت میں پروازیں مکمل کرنا تھا۔ موقعہ سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اور اگر کسی وقت اس کا مطالبہ پورا نہ ہو تو رکاوٹیں پیدا کرتا اور رازوں کو افشاء کرنے کی دھمکی دیتا۔ ایجنٹ جنرل پاکستان کو اس کام کی ذمہ داری سونپی گئی تھی جنھوں نے سڈنی کاٹن کے ناز سہتے ہوئے یہ کام بڑی خوبی سے انجام دیا۔ یہ پائیلٹ خفیہ انداز میں ہندوستان کے علاقے سے ہوتے ہوئے حیدرآباد کے ہوائی اڈہ تک پروازیں بھرنے لگا۔ ضرورت کا سامان، دوائیں اور اسلحہ منتقل ہونے لگے۔ اسلحہ میں ۳۰۳ رائفلیں اور اسٹن گنس تھیں۔ یہ اسلحہ سرحد کے بعض علاقوں میں بڑے کارآمد ہوئے اور سرحدی حالات پہلے کے مقابل میں بدلنے لگے۔ لیکن ایسے نہیں کہ ہندوستان کے مقابلے کھڑے ہوسکیں۔ اس سے کچھ طاقت میں اضافہ ہوسکا۔ اہم ضروری اشیاء، دوائیں، اکسرے فلم، بچوں کی غذائیں وغیرہ کی جو سخت قلت محسوس کی جارہی تھی اس میں کمی ہوئی۔

سخت معاشی ناکہ بندی اور سرحدی حملوں کی وجہ سے دنیا کی رائے عامہ ہندوستان کے خلاف ہوگئی تھی۔ نہرو کو اس کی بڑی فکر تھی۔ ہندوستان کی وزارت دو نظریات کے تحت منقسم تھی۔ ایک گروپ جو جواہر لال نہرو کے ساتھ تھا عالمی رائے عامہ اور کھلی جارحیت کے ارتکاب کے بعد ہونے والے بین الاقوامی اثرات سے خوب واقف تھا اسی لئے حملہ سے گریز چاہتا تھا۔ دوسرا گروپ جس کی رہنمائی سردار پٹیل کررہے تھے فوری حملہ کے ذریعہ مسئلہ کا حل چاہتا تھا۔ سردار پٹیل کو نہ تو عالمی رائے عامہ کی فکر تھی اور نہ وہ کسی کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ اس ذہن کے حامل تھے کہ ہندوستان کے صدیوں پرانے طور طریق اور گاندھی جی کی اہمسہ کی تعلیمات نے ہندوستانیوں کو مرعوب ذہن بنادیا اور جنگجویانہ صلاحیتوں سے محروم کیا ہے۔ حیدرآباد کی فتح مرعوبیت کو ختم کرنے اور جنگجویانہ صلاحیتوں کے اُجاگر کرنے میں مدد و معاون ہوگی۔ نیز خراب معاشی حالات اور کشمیر میں ناکامی کی وجہ سے ہندوستان کا جو مقام متاثر ہوا ہے حیدرآباد پر فتح کے ذریعہ اس کی تلافی کی جاسکے گی۔ سردار پٹیل کے سامنے نہرو یا کسی اور کا مدمقابل ہونا دشوار تھا۔ اس لحاظ سے حملہ یقینی ہوگیا تھا۔

آخری اُمید پاکستان سے تھی۔ جناح کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ حیدرآباد پر حملہ کی صورت میں پاکستان تماشائی نہیں رہ سکتا۔ پاکستان کیا مدد کرسکتا ہے جاننے کے لئے یہ کام مشتاق احمد خان ایجنٹ جنرل پاکستان کو سونپا گیا۔ مشتاق احمد خان کا اصرار تھا کہ حالات کے تیزی سے بدلنے کی وجہ سے لائق علی پاکستان آئیں اور یہ پتہ چلائیں کہ موجودہ حالات میں پاکستان کیا کرسکتا ہے؟ لائق علی، نظام سے منظوری حاصل کرکے خفیہ انداز میں پاکستان کے سفر کا منصوبہ بنایا۔ رات دیر گئے ایک ملٹری گاڑی میں تین گھنٹے سفر کے بعد وہ ہوائی اڈہ پہنچے جہاں سڈنی کاٹن ان کا منتظر تھا۔ فوری کراچی روانہ ہوئے اور ۷ رستمبر ۴۸ء کی صبح صبح کراچی پہنچے۔ وہاں سے کار کے ذریعہ سیدھے غلام محمد کے مکان گئے جہاں وہ منتظر تھے۔ گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ پاکستانی سرحد سے ہندوستانی فوج اور دبابے بڑی تعداد میں منتقل ہوچکے ہیں اور یہ حیدرآباد اور کشمیر سرحد پر ہیں۔ جب لائق علی نے دریافت کیا کہ حملہ کی صورت میں پاکستان حیدرآباد کی کیا مدد کرسکتا ہے؟ غلام محمد نے جواب دیا کہ ان سے جو کچھ بھی ہوسکتا ہے وہ امداد تو جاری ہے اور اس سے ہٹ کر مدد کی صورت میں کیا کیا جاسکتا ہے تو اس کا جواب صرف قائداعظم ہی دے سکتے ہیں جو اس وقت کوئٹہ میں علیل ہیں۔ وہ فوری کوئٹہ کے لئے روانہ ہوئے

جہاں انھوں نے قائداعظم کو سخت علیل پایا۔ انھیں انجکشن دیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ نیم غشی کی حالت میں تھے۔ اس وقت دن کے (۱۱) بجے تھے۔ انھیں بتایا گیا کہ انجکشن کے تین گھنٹے بعد حالت سدھر سکتی ہے انتظار کرتے رہے کہ ہوش آئے تو بات کریں۔ تین گھنٹے بعد بھی ہوش نہ آیا۔ اس نیم غشی کی حالت میں بھی لایق علی کے آنے کی اطلاع دی گئی تو خرابی حالت کے باوجود انگلیوں سے اشارہ کیا۔ چار بجے تک بھی ہوش نہیں آیا۔ چوں کہ حیدرآباد فوری واپس ہونا تھا اسی لئے وہ کوئیٹہ سے سیدھے غلام محمد کے گھر واپس ہوئے۔ غلام محمد اور لیاقت علی خاں سے سرسری بات کی۔ لیاقت علی خان کو اسی روز شام میں امریکی سفیر کے گھر دعوت تھی۔ سیاسی صورتحال کچھ ایسی تھی کہ وہ اس دعوت کو ترک کرتے تو غیر ضروری پیش قیاسیاں شروع ہوجاتیں اسی لئے جلد واپسی کے وعدہ سے لیاقت علی اور غلام محمد اس دعوت میں چلے گئے۔ کافی دیر ہوگئی تو بے چینی بڑھنے لگی۔ رات (۱۱) بجے یہ اصحاب ظفر اللہ خان وزیر خارجہ پاکستان کے ساتھ پہنچے۔ کافی طویل گفتگو رہی۔ ظفر اللہ خان نے سکیورٹی کونسل میں مدد کرنے کا وعدہ کیا اور توقع ظاہر کی کہ سکیورٹی کونسل بلا تاخیر مداخلت کرے گی۔ پاکستان کی خفیہ ایجنسی کے مطابق حملہ ۲۰؍اور ۲۳؍ستمبر کے درمیان متوقع تھا۔ ان حالات میں جب ان سے پوچھا گیا کہ حملہ کی صورت میں پاکستان کیا مدد کرسکتا ہے تو جواب یہی ملا کہ اس کا جواب قائداعظم ہی دے سکتے ہیں۔ کوئی واضح جواب نہ ملنے کی وجہ سے سخت مایوس ہوگئے۔ رات دیر گئے کراچی ہوائی اڈہ سے نکل کر ۸؍ستمبر ۴۸ء کی صبح کی اولین ساعتوں میں بے نیل و مرام حیدرآباد کے ایرپورٹ پر پہنچے اور تین گھنٹے سفر کے بعد جب گھر لوٹے تو ان کے لئے کے۔ یم۔ منشی کا فون تھا اور وہ لایق علی کو رات میں دعوت پر مدعو کررہے تھے۔ لایق علی نے دعوت قبول کی لیکن کسی بعد کی تاریخ پر۔ منشی، لایق علی کے گھومنے پر نگرانی رکھے ہوئے تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ وہ کیا کررہے ہیں۔ کچھ آرام کے بعد نظام سے ملاقات کی جو مایوسیوں کے ماتم کے سوا کچھ نہیں تھی۔

ایک طرف نظام نے حالات سے خود کو باخبر رکھنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا تھا۔ بار بار وہ فوج کے کمانڈر العیدروس کو طلب کرتے رہے اور فوجی صلاحیتوں کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ دوسری طرف جنرل العیدروس نظام اور لایق علی کو مسلسل دھوکہ میں رکھ رہے تھے اور یقین دلا رہے تھے کہ فوج کی جو بھی طاقت ہے وہ کم از کم تین ماہ تک ہندوستان کی

فوج کو روکے رکھنے کے قابل ہے۔لایق علی متفق نہ تھے اور سمجھتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ چھ ہفتہ تک حیدرآباد میں ہندوستانی فوج کے داخلے کو روکا جاسکتا تھا اور اتنی مدت کافی ہے سکیورٹی کونسل کی فوری مداخلت کرنے اور دنیا کی رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کے لئے۔

نظام نے ۹ر ستمبر کو ایک بار پھر گورنر جنرل راجگوپال چاری سے اپیل کی کہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں حیدرآباد کے نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے سمجھوتے کی کوئی نہ کوئی صورت نکالیں تا کہ دونوں امن و سکون سے رہ سکیں۔گورنر جنرل نے ۱۰ر ستمبر کو ہندوستان کے اس موقف کا اعادہ کیا کہ ہندوستانی فوج کو پائے تخت حیدرآباد میں رکھنے کے علاوہ وہ سب مطالبات مان جائیں جو حکومت ہند کر رہی ہے ایسے میں کوئی صورت نکل سکتی ہے۔

۱۰ر اور ۱۱ر ستمبر کی درمیانی رات کے آخری حصہ میں پولیس چیف نے لایق علی کو قائداعظم کے انتقال کی خبر دی۔لایق علی کچھ دیر کے لئے سکتہ میں آ گئے۔پورا حیدرآباد غم میں ڈوب گیا۔ دوسرے دن تعطیل کا اعلان کیا گیا اور ۱۱ر ستمبر کو مکہ مسجد میں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں نظام، لایق علی اور ایک بڑے مجمع نے شرکت کی۔اس طرح پاکستان سے رہی سہی توقع ختم ہوگئی۔

یہ اندیشے بڑھ گئے کہ قائداعظم کی موت سے فائدہ اُٹھا کر مقررہ وقت سے پہلے ہی حملہ کیا جائے گا۔اب نظام اور لایق علی کی توجہ فوجی انتظامات کی طرف مبذول ہوگئی۔

کمزور فوج - بے اعتبار لیڈر

ایسے نازک موقعہ پر جب کہ صرف محاذ آرائی باقی تھی اس وقت لایق علی نے جب فوجی انتظامات کا بغور جائزہ لیا تو ان کے جسم پر رونگھٹے کھڑے ہو گئے۔ نظام، فوجی کمانڈر حبیب احمد العیدروس سے مسلسل ربط رکھے ہوئے تھے اور لایق علی کا بھی ربط تھا۔ جب بھی کمانڈر سے دریافت کیا گیا تو یہی یقین دہانی کرائی گئی کہ حیدرآباد کی فوج اس قابل ہے کہ تین ماہ تک حکومت ہند کی فوج کو حیدرآباد میں داخل ہونے سے روک سکتی ہے۔ لایق علی سمجھتے تھے کہ چھ ہفتہ تک فوج مدافعت کرسکتی ہے اور یہ مدت کافی ہے سکیورٹی کونسل کو مداخلت کرنے کے لئے۔

مشتاق احمد خاں حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل پاکستان (کراچی) نے لکھا ہے[۱] کہ وہ ۲۳ر مئی ۴۸ء کو ضروری اُمور پر گفتگو کرنے کے لئے حیدرآباد پہنچے۔ دوسرے دن نظام سے ملے اور ۲۵ر کو دہلی گئے تا کہ لایق علی صدر اعظم (اس وقت لایق علی سمجھوتے کے سلسلہ میں دہلی میں تھے) سے مل کر اور اُمور کے علاوہ کمانڈر العیدروس کے بارے میں معلومات مہیا کریں۔ انھوں نے لایق علی کو بتایا کہ پاکستان کے خفیہ ذرائع کے مطابق العیدروس کی عسکری مہارت اور وفاداری مشکوک ہے۔ لایق علی نے انھیں بتایا کہ انھیں بھی ایسی اطلاعیں ملی ہیں لیکن ان افواہوں میں کوئی حقیقت نہیں اور انھیں کمانڈر العیدروس پر کامل بھروسہ ہے۔ بالآخر جولائی ۴۸ء کے اواخر میں العیدروس کی صلاحیتوں کا پتہ چل گیا نظام سے لے کر صدر اعظم اور ان کی کابینہ پر افسردگی چھا گئی۔ ایسے میں پاکستان سے کوئی موزوں بریگیڈر کی خدمات کے حصول کی کوشش کی گئی مگر ناکامی ہوئی۔ اس نازک موقعہ پر جب دشمن سر پر کھڑا ہو کون تیار ہوگا۔ پھر بھی افسر الملک کے خاندان سے تعلق رکھنے والا نوجوان سکندر علی بیگ جس کا حیدرآباد سے تعلق تھا وطن کے جذبہ آزادی میں پہنچ گیا۔ حیدرآباد کی فوج میں العیدروس کے

۱۔ زوال حیدرآباد کی ان کہی داستان صفحہ ۱۴۹ و ۲۰۷ تا ۲۱۰

بعد کوئی ایسا سینیر عہدیدار موجود نہیں تھا کہ ذمہ داری سونپی جائے چوں کہ العیدروس نے اپنی کمانڈری کے دوران بڑی چالاکی سے سینیر عہدیداروں کو بدل بدل کر کے خود ناگزیر بن کر باقی رہنے کی کوششیں کیں۔ صرف نواب چھتاری نے انھیں پہچانا تھا اور وہ اسے تبدیل کرنا چاہتے تھے لیکن ریسڈنٹ کی مخالفت کی وجہ سے وہ یہ اقدام نہیں کر سکے۔ حد تو یہ ہوئی کہ حملہ کے دو ہفتہ قبل ایک بھارتی برگیڈیر کو جذبہ خیر سگالی کے نام پر اپنے مورچوں کا معائنہ کروایا تھا اور اسی دوران بیگم عیدروس کو کے۔ یم۔ منشی کی سفارش پر بمبئی میں وی۔ آئی۔ پی کی میزبانی سے نوازا گیا تھا۔ حیدرآباد کے انگریز چیف آف اسٹاف نے برطانوی ہائی کمیشن کی ہدایت پر حیدرآباد پر حملہ کے کچھ دن پہلے استعفیٰ دے دیا تھا تو حیدرآبادی فوج اس ماہر کی رہبری سے محروم ہو گئی تھی۔

نظام اور لایق علی نے بغیر کسی جائزہ اور تحقیق کے العیدروس پر کامل اعتماد کیا تھا۔ اس کی وجہ العیدروس کی قاسم رضوی سے رشتہ داری ہو سکتی ہے۔ لایق علی اور ان کی وزراء کی کونسل کی یہ سب سے بڑی غیر ذمہ داری تھی کہ کمانڈر، دفاعی طاقت، فوجی انتظامات جیسے اُمور پر نہ تو ابتداء سے توجہ دی اور نہ واقفیت حاصل کی۔ صرف العیدروس پر بھروسہ رکھ کر مطمئن ہو گئے جب کہ اس نے دھوکہ دینے کی روش اختیار کی تھی۔

قائداعظم کے انتقال سے قبل حیدرآباد کے مشرقی سرحدی علاقہ منی گلا زمین داری (Manigala Zamindari) پر جو ضلع نلگنڈہ کے کوڈاڈ تعلقہ کی سرحد پر واقع ہے حکومت ہند کی فوج حملہ کر کے قابض ہوئی اور سرحد کے اندر پچاس میل تک ٹینک کے ساتھ گھس آئی مگر حیدرآبادی فوج نے کچھ مدافعت نہیں کی تو حیدرآباد میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وزراء کی کونسل میں تفصیلی جائزہ لیا گیا اور جب کمانڈر العیدروس سے مدافعت نہ کرنے کا سبب دریافت کیا گیا تو اطمینان بخش جواب نہ مل سکا۔ سخت وارننگ دی گئی۔ فوجی کمانڈر کی نا اہلی اسی وقت ظاہر ہو گئی تھی۔

قائداعظم کے انتقال کے بعد حیدرآباد پر حملہ کی جلد توقع تھی۔ اُس وقت فوجی کمان کے ہیڈ کوارٹر جا کر جب لایق علی نے جائزہ لیا تو انھیں بڑی مایوسی ہوئی۔ فوج کی تعداد میں شدید کمی، بڑی توپوں کی قلت، خاص کر ٹینک مار گرانے والی توپوں کی بڑی کمی تھی جب کہ سرحدوں کے اطراف ٹینکس بڑے پیمانہ پر حملے کے لئے موجود تھے۔ وائرلس کا صحیح انتظام نہ تھا اور پورے فوجی یونٹس کا

وائرلس سے ربط نہ تھا۔ اسلحہ اور بھاری اسلحہ کی شدید کمی تھی۔ صرف ۳۰۳ اور اسٹن گن رائفلس سے فوج لیس تھی۔ دبابہ شکن سرنگوں (Anti Tank Mines) کی بڑی کمی تھی۔ ہوائی حملے کو روکنے اور جوابی ہوائی حملہ کرنے کا ساز و سامان نہ تھا۔ سب سے حیرت کی بات تو یہ تھی کہ کمانڈر کو نہ تو حیدرآباد کے مختلف مقامات کی جغرافیائی معلومات تھیں اور نہ ارضی نقشے (Topography) کا کوئی علم تھا جو فوج کے لئے نہایت اہم ہوتا ہے۔ اس نے سب چیزیں اپنے ماتحتین پر چھوڑ رکھی تھی اور بڑا مطمئن اور مسرور تھا کہ ہندوستان کا شدید حملہ اس کے لئے کچھ نہیں ہے۔ لایق علی کو ان کی نااہلی اور کارکردگی مشکوک نظر آئی تو نظام کو توجہ دلائی۔ نظام نے کمانڈر کو فوری علحدہ کرنے سے اتفاق کرلیا لیکن بعد تلاش کے کوئی موزوں شخص نہ ملا اور حالات کے لحاظ سے فوری تبدیلی بھی موزوں نہیں سمجھی گئی۔ نظام، لایق علی اور ان کی کابینہ کو اس غفلت کی قیمت چکانی پڑی جو افسوس ناک ہے۔

قائداعظم کی غائبانہ نماز جنازہ کے بعد لایق علی سے قاسم رضوی کی ملاقات ہوئی۔ لایق علی نے کہا کہ اب حکومت ہند کے وقت سے پہلے حملے کا خدشہ ہے۔ جواب ملا کہ جتنا جلد ہو اچھا ہے وہ اور ان کے رضاکار تیار ہیں۔ یہ ہوش مندی سے عاری جذباتیت تھی۔

حیدرآباد کی فوجی طاقت ہندوستان کے مقابل بہت کمزور تھی۔ تربیت، اسلحہ ٹینکس، ہوائی حملہ کا دفاع سب کے سب کمزور تھے۔ انگریزوں نے دیسی ریاستوں کی فوجی طاقت تقریباً سلب کردی تھی کیوں کہ ان لوگوں نے حیدرآباد سے مختلف معاہدات کے تحت وسیع علاقہ جات حاصل کرکے ریاست کی دفاع کی ذمہ داری خود سنبھال لی تھی حیدرآباد کو اپنی فوج بنانے کا تک اختیار نہ تھا۔ State Forces Schme 1939 کے تحت حیدرآباد کی فوج کی تعداد مقرر کردی تھی اور اسلحہ کی سپلائی کی ذمہ داری انگریزوں نے لے لی تھی۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ جب حیدرآباد کی آزادی کے نعرے لگنے لگے تو یہی شعبہ سب سے کمزور تھا۔ مجلس اتحادالمسلمین اور خاص طور پر بہادر یار جنگ نے بارہا نظام کی توجہ اس جانب مبذول کروائی اور دوسری جنگ عظیم سے فائدہ اُٹھاکر حربی طاقت میں اضافہ کا مطالبہ کیا لیکن حضور نظام اور ان کے صدر اعظم نے نہ صرف موقع سے فائدہ نہیں اُٹھایا بلکہ اس سے گریز کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جنوبی ہند میں حیدرآباد کو اتحادیوں کا ایک بڑا فوجی اڈہ بنایا گیا تھا۔ جنگ کے بعد فوج واپس ہوگئی۔ اسلحہ کی کثیر تعداد جس میں چرچل، شرمن ٹینکس بھی شامل

تھے سکندر آباد چھاونی میں تلف کیے جانے لگے۔ بیگم پیٹ میں ایک بڑی برین گن فیاکٹری تھی جسے برطانوی حکومت فروخت کرنا چاہتی تھی۔ اسلحہ، ٹینکس اور گن فیاکٹری وغیرہ سب چند کروڑ کی بات تھی لیکن اس وقت کے صدر اعظم سر مرزا اسمٰعیل نے نہیں خریدا اور جب توجہ دلائی گئی تو کہا ''ہمیں جنگ کس سے کرنا ہے''۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت ہند کے خلاف حیدر آباد کی فوجی طاقت مستحکم رہے۔

جب لایق علی نے وزارت سنبھالی تاخیر سے سہی انھوں نے اسلحہ سازی کے تین کارخانے قائم کیے۔ موتی محل گولکنڈہ میں ۳۰۳ رائفلس راست لایق علی کی نگرانی میں بننے لگیں۔ ہفتہ میں دو درجن رائفلس تیار ہونے لگیں۔ جنگ شروع ہونے تک بہ مشکل ڈیڑھ ہزار رائفلیں بنیں جو رضا کاروں میں تقسیم کی گئیں۔ دوسرا کارخانہ رسالہ حبوش خیریت آباد میں تھا جو اسٹین گن اور کارتوس کے پیتل کے خول بناتا تھا۔ قریب تین ہزار گن اس کارخانہ میں تیار کیے گئے۔ تیسرا کارخانہ قادر باغ فرسٹ لانسرز میں تھا جہاں رائفلس کے کارتوس کا مسالحہ بنایا جاتا تھا۔ حملے تک وقت اتنا کم تھا کہ کوئی قابل لحاظ اور اہم اسلحہ تیار نہ ہوسکا۔

تقسیم ہند کے بعد سے حملہ تک حیدر آباد فوج کی طاقت حسب ذیل تھی:

(۱) باقاعدہ تربیت یافتہ فوج کی تعداد (۲۲) ہزار جس کے پاس جدید ترین اسلحہ، (۲۵) پونڈ کی بھاری توپیں اور (۳) بکتر بند رجمنٹس تھیں۔

(۲) بے قاعدہ فوج (۱۰) ہزار جن میں سے (۲۵) فیصد ہلکے ہتھیار اور باقی کے پاس مزل لوڈنگ بندوقیں تھیں۔

(۳) عرب فوج کی تعداد (۱۰) ہزار اور ان کے پاس بھی بے قاعدہ فوج کی طرح ہلکے ہتھیار اور مزل لوڈنگ بندوقیں تھیں۔

(۴) پولیس اور کسٹم فورس کی تعداد (۱۰) ہزار تھی جن کے پاس جدید ترین رائفلس اور اسٹن گن تھے۔

(۵) رضا کاروں کی تعداد (۲) لاکھ سے متجاوز تھی جن میں سے صرف (۲۰) فیصد رائفلوں، بندوقوں اور پستولوں سے لیس تھے اور باقی نیزے، تلوار اور مزل لوڈنگ گن رکھتے تھے۔

عرب فوج خزانوں کی حفاظت کے لئے متعین تھی۔ پولیس اور کسٹمس فورسس سے جنگی کام

حیدرآباد کی فوجی طاقت بڑھانے میں وہ توجہ نہیں دی گئی جس کی کہ شدید ضرورت تھی۔ خاص کر نظام اور ان کے صدور اعظم غفلت مجرمانہ کے مرتکب ہوئے۔ نواب چھتاری اور خاص کر سر مرزا اسمٰعیل کا دور دفاعی امور پر فیصلہ سازی کے لئے اہمیت رکھتا تھا۔ نواب چھتاری چاہتے تو بہت کچھ ہوسکتا تھا۔ سر مرزا اسمٰعیل، حکومت ہند کے موافق الذہن ہونے کی وجہ سے فوجی طاقت کے اضافہ کے لئے اہم موقعوں سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ آخر دور میں لایق علی نے اس جانب کچھ کام کیا لیکن کوئی قابل لحاظ فوجی طاقت میں اضافہ ہوا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری توانیاں سمجھوتے کے لئے بحث ومباحث، حق اور قانونی داؤ پیچ پر صرف کی گئیں اور رزم آرائی سے بچنے کی کوشش کی گئی۔ سمجھوتہ ہی ان کے پیش نظر تھا۔ حکومت ہند اس کمزوری سے واقف ہو چکی تھی اس لئے اس نے حیدرآباد کو اسی میں اُلجھائے رکھا۔

باوجود کمزور فوجی طاقت کے لایق علی کا یہ اندازہ صحیح تھا کہ کچھ ہفتوں تک مدافعت کی جاسکتی تھی چوں کہ فوج میں جوش اور بہادری موجود ہے۔ اسی لئے جنگ کو کچھ ہفتوں تک طوالت دے کر سکیورٹی کونسل کی مداخلت کے لئے کوشش کی گئی۔ لیکن العیدروس کی نااہلی اور بے وفائی مقصد کے حصول میں مانع رہی۔

نہیں لیا جاسکتا تھا چوں کہ انھیں جنگ کی تربیت نہیں تھی۔ البتہ (۷) ہزار سرحدی پٹھانوں کو جنگ کے وقت بلایا گیا تھا جو سرحدات پر جنگ میں رہے۔ اس طرح سے قریب (۳۰) ہزار بشمول (۷) ہزار پٹھانوں کی فوج تھی جو جنگ کے کام آسکتی تھی۔ اس کے پاس نہ ہوائی حملے اور ہوائی حملہ کے دفاع کے انتظامات تھے۔ نہ ٹینک تھے نہ اینٹی ٹینک اور نہ اینٹی ایر کرافٹ اسلحہ تھا۔

رضا کار فوجی کارروائی کے قابل نہ تھے اور نہ انھیں جنگی تربیت تھی جو جنگ کے دوران کام آسکتی تھی۔ البتہ ان سے امن وامان کا کام لیا جاسکتا تھا۔ یہ رضا کار فوج کے تحت نہیں تھے بلکہ قاسم رضوی کی راست کمانڈ میں کام کرتے تھے۔ جوش جہاد سے معمور سرحدات پر بڑی تعداد میں وطن کو بچانے کی خاطر نکل پڑے تھے۔

اس کے برخلاف ہندوستان کے پاس تین لاکھ کی بہترین تربیت یافتہ زمینی اور ہوائی فوج تھی۔ طیاروں، بکتر بند گاڑیوں، توپوں اور جدید ترین اسلحہ سے مسلح فوج تھی جس کی بڑی تعداد حیدرآباد پر حملے کے لئے جھونک دی گئی تھی۔

کسی انگریز جرنیل نے العیدروس کی تعریف کے پل باندھتے ہوئے کہا تھا کہ معمولی سی فوج لے کر بھی وہ بڑی سی بڑی فوج کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ اسی وجہ سے اور قاسم رضوی کے رشتہ کے بھائی ہونے کے ناطے بڑا اعتماد قائم ہوگیا تھا۔ جب کہ برطانیہ اور ہندوستان کی فوج کے بیشتر اعلیٰ عہدیدار خوب واقف تھے کہ یہ نااہل اور ناقابل بھروسہ فوجی ہے۔ حیدرآباد کی فوج بھی اس سے خوش نہیں تھی۔ ماتحتین کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی ایک عادت سی تھی اور صرف حکم چلانا جانتا تھا۔ سوشیل سرکلس میں گھومنا اور حالت نشہ میں رازوں کا افشاء کرنے کی عادت تھی۔ اس کی بیوی یہودن تھی۔ بعض ذرائع کے مطابق حیدرآباد کی فوج کی تعداد اور فوج کے سارے راز اسی خاتون کے ذریعہ ہندوستانی فوج کی کمان کو مل گئے تھے۔ اسی لئے حیدرآباد کی حربی طاقت کا صحیح اندازہ حکومت ہند کو ہوگیا تھا۔ اخباری بیانات کے ذریعہ حیدرآباد کی فوجی طاقت کا بڑا چرچا ہو رہا تھا جب کہ نہ تو جنگی طیارہ تھا اور نہ ہوائی حملے کو روکنے کی توپیں تھیں۔ قاسم رضوی اور ان کے حلقوں نے غیر ضروری تشہیر کی کہ پچاس بمبار طیاروں کا ایر بورن ڈیویژن (Air Borne Division) حیدرآباد کی جانب سے پاکستان میں رکھے گئے ہیں جو ضرورت پڑنے پر احمد آباد اور بمبئی پر حملہ آور ہوں گے۔

ہندوستان کا فوجی حملہ اور حیدرآباد کا سقوط

مذاکرات اور سمجھوتے کی تمام کوششوں کے اختتام کے بعد جو راستہ رہ گیا تھا وہ فوجی حملہ اور اس کی مدافعت تھا۔ ہندوستان چاہتا یہی تھا کہ اگر حیدرآباد ہندوستان کی مرضی کے مطابق الحاق نہ کرے تو حملہ کے ذریعہ اسے زیر کرلیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ فوجی تیاری کا آغاز فبروری ۱۹۴۸ء سے ہی کردیا گیا تھا جب کہ ہندوستان کی جنوبی کمانڈ کے جنرل آفسر کمانڈ کو حیدرآباد پر فوجی حملہ کے منصوبہ کی تیاری کے احکام دیئے گئے تھے۔ منصوبہ بندی مارچ ۱۹۴۸ء تک مکمل کرلی گئی اور فوج کو حیدرآباد کی سرحدوں کے اطراف متعین کرکے جزیات اور دیگر تفصیلات کی تکمیل میں مشغول رکھا گیا۔ فوجی حملہ کا ایک دو بار خود ماونٹ بیٹن نے سمجھوتے کے گفتگو کے دوران صاف صاف اشارہ دیا تھا اور کہا تھا کہ فوج حیدرآباد کی سرحد کے اطراف متعین کردی گئی ہے جو تین گھنٹوں کے اندر سرحدوں میں داخل ہوسکتی ہے۔ نظام کو تو کچھ نہ ہوگا ریاست ختم ہوجائے گی اور شدید جانی و مالی نقصان ہوگا۔ حملہ کے لئے مندرجہ نوعیت کی فوج کا انتخاب کیا گیا تھا۔

(۱) ایک بکتر بند بریگیڈ جس میں ''پونا ہارس'' تیسری کیولری اور ستھرویں ڈوگرہ رجمنٹ کی نویں بٹالین۔

(۲) ساتویں انفنٹری بریگیڈ جس میں تین انفنٹری بٹالین تھے

(۳) نویں انفنٹری بٹالین جن میں تین انفنٹری بٹالین تھے

(۴) مزید تین انفنٹری بٹالین

(۵) فیلڈ آرٹیلری کے تین رجمنٹ بشمول ایک اینٹی ٹینک رجمنٹ

(۶) اٹھارویں کیولری کا ایک ٹروپ

(۷) ایک بکتر بند ڈویژن (HQI) معہ ایک بکتر بند بریگیڈ

میجر جنرل جے۔ین۔چودھری کو ڈویژن کی کمانڈ دی گئی تھی اور بریگیڈیر ڈی۔ایس۔ورما کو بکتر بند بریگیڈ کی کمانڈ دی گئی تھی۔ابتداء میں دو محاذ کھولنے کا منصوبہ تھا ایک شولا پور کی جانب سے جو بڑا محاذ تھا دوسرا وجے واڑہ کی جانب سے نسبتاً چھوٹا محاذ تھا۔حیدرآباد پہنچنے کے لئے یہ دو محاذ قریب ترین تھے لیکن حملہ کے وقت قریب چھوٹے بڑے (۲۲) محاذ حیدرآباد کے اطراف کھولے گئے تھے۔ فوج کی صحیح تعداد کا تو علم نہ ہوسکا لیکن یہ (۶۰) اور (۷۰) ہزار کے بیچ تھی۔فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔(۱) اقدامی فوج (Strike Force) (۲) انہدامی فوج (Sward Force) (۳) قاتل فوج (Kill Force)۔ان کے علاوہ ایک امدادی فوج (Vir Force) ایک محفوظ فوج (Rear Division Force) تھی۔یہ ایک منصوبہ بند فوجی حملہ تھا لیکن دنیا کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے لئے اس کو پولیس ایکشن کا نام دیا گیا تھا۔

حیدرآباد کی کمانڈ کے مطابق یہ خیال تھا کہ حملہ ۲۰ر ستمبر سے قبل نہ ہوگا اور پاکستانی ذرائع کے ۲۰ر اور ۲۳ر ستمبر کے درمیان حملہ کی اطلاع تھی۔جنرل چودھری کے ایک مضمون[۱] کے مطابق حملہ ۱۱ر ستمبر کو طے پایا لیکن حیدرآباد کی فوج کو دھوکہ میں رکھنے کے لئے ۱۵ر ستمبر کا اعلان کیا گیا۔غالباً قائداعظم کے انتقال کی وجہ سے تاخیر کر کے ۱۳ر ستمبر کو حملہ کیا گیا۔شولا پور کی جانب سے نلدرگ کے محاذ پر سب سے بڑا حملہ کیا گیا اس کے بعد وجے واڑہ کی جانب سے دوسرا بڑا حملہ شروع ہوا۔ان دونوں محاذوں پر قریب (۲۵) ہزار فوج اور (۷۰) شرمن ٹینک کو بمبار طیاروں کی مدد حاصل تھی۔ دیگر حملے جو مختلف محاذوں سے شروع کئے گئے تھے وہ اتنے شدید نہ تھے۔اس فوجی حملہ کی تفصیل اور جنرل العیدروس کی نااہلیت اور سازشی کردار کی تفصیل لایق علی نے اپنی کتاب[۲] میں لکھی ہے جو معلوماتی اور انکشافات سے پر (۴) ابواب پر مشتمل ہے۔جس کا اُردو ترجمہ کتاب ''سقوطِ حیدرآباد''[۳] میں شامل کیا گیا ہے۔اس ترجمہ کو کاملاً ضمیمہ (۲) کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے ساری تفصیلات مل جاتی ہیں۔ان ہی انکشافات کا اختصاراً پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ سقوط حیدرآباد شائع کردہ دارالاشاعت مجلس تعمیر ملت حیدرآباد صفحہ ۹۵

۲۔ ٹراجڈی آف حیدرآباد (Trajedy of Hyd.)

۳۔ شائع کردہ دارالاشاعت مجلس تعمیر ملت حیدرآباد

یہ حملہ شمال سے اورنگ آباد، پربھنی، عادل آباد، جنوب میں رائچور، منیرآباد، جنوب مشرق میں وجے واڑہ سے نلگنڈہ کی راہ اور مغرب میں شولاپور سے نلدرگ کی جانب تھا۔شولاپور نلدرگ کے محاذ پر حملہ سب سے بڑا اور اہم ترین تھا اس کے بعد جنوب مشرق سے وجے واڑہ کی جانب سے نلگنڈہ محاذ کا حملہ تھا باقی حملے اوسط اور معمولی تھے۔مغربی سمت شولاپور کے محاذ پر ہندوستانی فوج کی تیاریاں کافی عرصے سے جاری تھیں اور یہیں سے بڑے پیمانہ پر حیدرآباد پر حملہ متوقع تھا۔چنانچہ اس محاذ پر حیدرآباد نے بھی دفاع کو زیادہ منظّم کیا تھا۔متوقع راستہ کے مطابق ہندوستان کی فوج نلدرگ کے درہ سے گذر کر حیدرآباد کا رُخ کرے گی۔اس راستہ پر ایک بٹالین فوج چار (۲۵) پونڈی توپوں کے ساتھ مدافعت کے انتظامات تھے۔نلدرگ کے قریب ندی پر جو پل تھا اس کو گرانے کا دوسرا منصوبہ تھا۔پل کے نیچے سرنگ (ڈائنامیٹ) نصب کیے گئے تھے۔ضرورت کے وقت صرف آگ لگانا (Fuse) باقی تھا۔فوج جب اس راستہ کا رُخ کرے یا رُخ کرنے کے آثار پیدا ہوں تو پل کو اُڑا دینے کی ذمہ داری حیدرآبادی فوج کے ذمہ تھی۔اس درہ اور پل کے بعد عثمان آباد تک کوئی مدافعتی انتظام نہ تھا۔دوسرا اہم مدافعتی مورچہ لاتور پر تھا تاکہ فوج اس راستہ سے بیدر کا رُخ نہ کرے۔توقع کے مطابق حملہ درہ سے ہوا اور ہندوستان کی فوج جب حیدرآباد کی فوج کے نشانہ میں آئی تو (۲۵) پونڈی توپوں کے ذریعہ ٹینکوں کو اُڑا دیا گیا۔قریب آٹھ ٹینک تباہ ہوئے اور اچھی خاصی ہندوستانی فوج تباہ ہوئی۔اندازہ کے مطابق قریب چھ یا سات سو فوجی مارے گئے۔تباہی کے ساتھ ہندوستانی فوج واپس ہوئی اور اس کا ایک حصہ دالم نامی مقام کے طرف موڑ دیا گیا جہاں سے فوج ہمنا آباد کا رُخ اختیار کرسکتی تھی۔دالم پر کچھ دفاعی انتظام تھا تاکہ بڑھتی ہوئی فوج کی رفتار کو روکا جاسکے۔لیکن ہندوستانی فوج ہمنا آباد کی طرف بڑھنے کی بجائے دوسرا رُخ اختیار کرتے ہوئے کلیانی بیدر روڈ کی راہ لی جو حیدرآباد کے لئے غیر متوقع اور پریشان کن تھی۔ہندوستانی فوج بعد میں سہ پہر کے قریب نلدرگ پر پھر حملہ آور ہوئی اور ہوائی حملہ کے ذریعہ نلدرگ یونٹ کو تباہ کردیا۔نلدرگ کے پل کو صرف ڈائنامیٹ لگانا تھا تاکہ پل گر جائے اور ہندوستانی فوج اس جانب سے داخل ہونے نہ پائے۔ حیدرآباد کی فوج اس معمولی اور اہم ترین کام کو انجام نہ دے سکی یعنی پل کو منہدم نہ کرسکی اور ہندوستانی فوج کو آسانی سے داخلہ دے دیا گیا۔فوج اس عظیم غلطی کی مرتکب ہوئی۔اسی طرح سے شمالی سرحد

سلطنت آص

ہندوستان

/۱۳

TO BOMBAY

BOMBAY

ANCE

TO BOMBAY

ARMYS

IOURED COLUMNS

IR FORCE

MY UNITS

INDIAN ARMIES
EASTERN BASE

GOA

ARABIAN SEA

GAL

واردھا پر بھی ایسی ہی شدید غلطی سرزدہوئی ۔ واردھا کے ریلوے برج پر سے ہندوستانی فوج داخل ہونے کی کوشش کرے تو اس پل کو بھی ڈائنامیٹ سے اُڑا دینے کے انتظامات کیۓ گئے تھے ۔ ڈائنامیٹ لگایا گیا تھا اور آگ لگانے (Fuse) کا کام ایک ریلوے انجینئر کے حوالے تھا ۔ یہ انجینئر پل سے (۶) میل دور جا کر سوتا رہا اور اس نے آگ نہیں لگائی نتیجتاً ہندوستانی فوج دندناتے ہوۓ آسانی سے داخل ہوگئی ۔ جنوب مشرقی محاذ سے بھی پیش قدمی کی خبریں آرہی تھیں ۔ دیگر محاذوں سے بھی اطمینان بخش خبریں نہ تھیں ۔ ان حالات میں لایق علی نے آرمی ہیڈکوارٹر کا جب مزید جائزہ لیا تو حیرت اور افسوس کی انتہا نہ رہی ۔ آرمی ہیڈ کواٹر پر وہ فوج کی پیش قدمی کا نقشہ اور انتظامات دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئے ۔ کلیانی بیدر روڈ جیسا اہم مقام جس پر سے ہندوستانی فوج نلدرگ کے بعد پیش قدمی کر رہی تھی وہ نقشہ پر موجود نہ تھی اور نہ کمانڈر اس سے واقف تھا ۔ یہ سڑک نئی بنائی گئی تھی اور کچھ ہی عرصہ قبل عوام کے لئے کھولی گئی تھی ۔ ہندوستانی فوج اس سڑک سے واقف تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسی کے لئے بنائی گئی تھی ۔ مواصلات کے لئے جو کوڈ استعمال کیۓ جارہے تھے وہ وہی قدیم تھے جو انگیزوں کے زمانہ سے چلے آرہے تھے جس سے حکومت ہند کی فوج واقف تھی اسی لئے ان کے سمجھنے میں اسے کوئی دشواری نہ تھی ۔ میڈیکل سرویس ، مواصلات ، فوج کو راشن پہنچانے ، اسلحہ ، گولہ بارود اور دوسری اشیاء پہنچانے کا برابر انتظام نہ تھا ۔ کوئی منصوبہ بندی نہ تھی ۔ حملہ کے دو دن بعد کمانڈر اپنے حواس کھو بیٹھا پریشان تھا اور کمان کرنے کے قابل نہ تھا ۔ ان حالات میں لایق علی آرمی کمانڈ ہیڈ کواٹر میں بیٹھ کر سارے انتظامات کرنے لگے اور کمانڈر لایق علی کے مشورہ اور رہنمائی کے بغیر کام نہیں کرنے لگا ۔ لایق علی کو اس وقت اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا کہ ہم نے اس نااہل اور سازشی کمانڈر پر غیر ضروری اور حد سے زیادہ اعتماد کیا ۔ ان ہی کے الفاظ میں :

"I felt that my place now on was in the control room of the Army Head Quarters. There was no time to accuse any one for the neglect or folly. The real folly had been committed in placing undue faith in the capacity of the army Commander. There was no redress for it now." [ہے]

وجے واڑہ کے محاذ سے پیش قدمی کی خبریں آرہی تھیں مغربی محاذ تو مایوس کن تھا اسی طرح سے ہر محاذ

ہے Tragedy of Hyd صفحہ 276

سے مایوس کن خبریں آ رہی تھیں ۔ حیدرآبادی افواج مزاحمت کی بجائے پیچھے ہٹائی جارہی تھیں ۔ العیدروس سے جب پوچھا جارہا تھا تو کہہ رہا تھا کہ جنگی نقطۂ نظر سے جنگ کے محاذ کو مختصر کیا جارہا ہے تاکہ شہر حیدرآباد کے قریب موثر مقابلہ کیا جاکر شکست دی جائے اسی لئے فوجیں محاذ سے پیچھے ہٹائی جارہی ہیں ۔ جہاں جہاں بھی ہندوستانی فوج سے مقابلہ ہوا ہندوستانی فوج کو شدید نقصان ہوا اور سخت مزاحمت ہوئی لیکن حیدرآباد کی فوج کو لڑایا ہی نہیں گیا۔ اس پانچ دن کی لڑائی میں فوجیوں کا جانی نقصان بہت کم رہا۔ حکومت ہند کے لگ بھگ آٹھ سو فوجی مارے جانے کی اطلاع تھی اور اسی کے مساوی حیدرآباد کے فوجی بھی مارے گئے ۔ تین دن بعد یعنی ۱۵ ؍ستمبر تک جب حالات بہت نازک ہوگئے تو لایق علی نے جنگ بندی کی اپیل کی اور مناسب شرائط پر صلح کی پیش کش کی ۔ پاکستان کو بھی ایسا ہی سمجھوتہ کروانے کے لئے ایجنٹ جنرل کراچی کو ہدایتیں دیں۔ لیکن ہندوستان اب کہاں مانے گا۔ خاموشی اختیار کی اور پیش قدمی جاری رکھی ۔

اس موقعہ پر رضا کاروں کے ایثار اور قربانیوں کا تذکرہ نہ کرنا احسان فراموشی ہوگی ۔ العیدروس نے ایک ہزار رضا کاروں کی مدد طلب کی تھی جو کسی خاص محاذ پر متعین کرنا چاہتے تھا۔ وطن کی حفاظت کے حوالے سے قاسم رضوی نے بڑی جذباتی تقریر کی ۔ رضا کاروں پر جوش جہاد چھا گیا۔ سر پر کفن باندھے یہاں تک والدین کی اجازت لئے بغیر کالج کے طلباء اور دیگر فدائیان نکل پڑے ۔ ۱۳ ؍اور ۱۴ ؍ستمبر کو دارالسلام میں بڑا روح پرور منظر تھا۔ حریت کے جذبہ سے معمور محاذوں پر جانے ہزاروں جمع ہوگئے تھے ۔ انھیں لاریوں میں بھر بھر کر محاذوں پر بھیجا گیا۔ جذبہ حریت اور جوش جہاد سے معمور معمولی ہتھیار جیسے بھر مار بندوق ، برچھے ، بھالے اور تلوار لئے ہوئے ہندوستان کی مسلح افواج کے مقابل نکل پڑے ۔ نہ تو انھیں فوجی تربیت تھی اور نہ محاذ پر جنگ آرائی کا تجربہ ۔ جب حیدرآباد کی فوج العیدروس کے حکم سے پیچھے ہٹ رہی تھی یہ رضا کار آگے بڑھتے ہوئے ، برچھوں بھالوں سے دبابوں کی چین گرا رہے تھے یا پھر دبابوں کے سامنے لیٹ جارہے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ قریب (۳۰) ہزار رضا کاروں نے اپنی جان آفرین وطن کی آزادی کے لئے قربان کی ۔ یہی نقصان اس معرکہ میں بڑا تھا۔ ان کی یہ قربانی اور جذبہ حریت تاریخ میں سنہری الفاظ سے لکھے جانے کے قابل ہے ۔ افسوس تو ان سورماؤں پر ہے جنھوں نے بغیر کوئی منصوبہ کے ان معصوموں کو قربان گاہ

پر چڑھا دیا۔

۱۶ ستمبر کو نظام سے لایق علی نے ملاقات کی۔ نظام نے دریافت کیا کہ سکیورٹی کونسل کی کارروائی میں کتنی مدت لگے گی۔ لایق علی نے کہا کہ کل تک کوئی اطلاع ممکن ہے۔ نظام نے لایق علی سے صاف صاف کہا کہ پاکستان کچھ مدد نہ کرسکا۔ سکیورٹی کونسل ابھی تک کچھ نہ کرسکی، فوج نے بڑا مایوس کن مظاہرہ کیا اور ہندوستانی فوج بڑھتے ہوئے پائے تخت کے قریب پہنچ رہی ہے۔ میں اور میرا خاندان بڑے خطرہ میں ہیں اب فیصلہ کا وقت آ گیا ہے۔ اب صرف دو ہی راستے ہیں ایک یہ کہ آپ اور آپ کی کابینہ مستعفی ہوجائے اور سارا معاملہ ان کے حوالہ کردیں تاکہ میں حالات کے لحاظ سے جو بھی معاملہ موزوں سمجھوں کرلوں۔ دوسرا یہ کہ مستعفی نہ ہونے کی صورت میں نظام حکومت سے بے تعلقی کا عام اعلان کردیں گے تاکہ عواقب اور نتائج کی ساری ذمہ داری ان کی حکومت پر رہے۔ لایق علی نے پوچھا کہ آپ کیا سیاسی سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں؟ تو جواب ملا کہ حالات کے لحاظ سے جو بھی موزوں سمجھوں اپنے اختیاری تمیزی سے فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ نظام نے لایق علی سے کہا کہ جواب کل صبح (۹) بجے تک انھیں مل جانا چاہئے۔ لایق علی نے لکھا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اور نظام کے درمیان ایک پردہ ہائے راز تھا جو ان سے چھپایا جارہا تھا اور اسی کے تحت عمل ہورہا تھا جس سے انھیں بڑی تکلیف ہوئی۔ عرض کیا کہ وہ مقررہ وقت سے پہلے جواب انھیں بھیج دیں گے۔ ذہن پر بوجھ لئے لایق علی اپنے دفتر گئے تاکہ کابینہ کا اجلاس طلب کریں اور مستعفی ہوجائیں۔ اس دن محاذوں سے کوئی پریشان کن اطلاع نہیں آئی تھی۔

۱۷ ستمبر کو صبح (۴) بجے ریلوے کے چیف نے لایق علی کو اطلاع دی کہ ہندوستانی فوج بی بی نگر کے علاقہ میں داخل ہوگئی ہے اور وہاں سے حیدرآباد کی طرف بڑھ رہی ہے اور حیدرآباد میں داخل ہونے چند گھنٹے درکار ہیں۔ لایق علی کو اس اچانک خبر پر بڑا تعجب ہوا اور وہ سمجھ گئے کہ مشرقی محاذ کی نکریکل کی دفاعی فوج کا صفایا ہوگیا ہے اور ہندوستانی فوج نے رُخ بدل کر نکریکل جنگاؤں یا نارکٹ پلی بھونگیر والی سڑک اختیار کرلیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح سے مغربی محاذ کے دالم پر ہوا تھا۔ فوج کی رفتار سے اندازہ ہوگیا تھا کہ چار یا پانچ گھنٹوں میں فوج پائے تخت میں داخل ہوجائے گی۔ لایق علی نے صبح (۸) بجے نظام سے ملاقات کی اور انھیں مطلع کیا کہ وہ مستعفی ہورہے ہیں اور کیبنٹ

کو بھی مستعفی ہونے کا مشورہ دے رہے ہیں۔وزراء کی کونسل (کیبنٹ) کا اجلاس صبح ساڑھے نو بجے منعقد ہوا اور وزراء کی کونسل نے بھی مستعفی ہونے کا اعلان کیا۔ اس فیصلہ کی اطلاع نظام کو بھیج دی گئی۔ کونسل کے اجلاس کے بعد جب لایق علی باہر آئے تو فوج کے بعض عہدیداروں نے بتایا کہ فوج کے خبر رساں دستے جو ہندوستانی فوج کی پیش قدمی کی خبر کی توثیق کے لئے بھیجے گئے تھے واپس آئے ہیں اور اطلاع دی ہے کہ خبر جھوٹی ہے اور ہندوستانی فوج کی ایسی کوئی پیش قدمی نہیں ہے۔ ہندوستانی فوج کو ابھی کچھ دنوں کے لئے روکا جا سکتا ہے۔ لیکن لایق علی نے افسوس کے ساتھ کہا کہ وہ مستعفی ہو چکے ہیں۔ فوجی عہدیداروں کے آنکھ میں آنسو بھر آئے۔ جھوٹی خبر کے ذریعہ استعفیٰ حاصل کرنا بھی ایک سازش تھی۔ استعفیٰ کے بعد نظام نے لایق علی کو طلب کیا تو انھوں نے دیکھا کہ العیدروس اور دین یار جنگ سے مشاورت میں مصروف ہیں۔ کے۔ یم۔ منشی سے ربط پیدا کر لیا گیا تھا اور مفاہمت کی راہیں تلاش کی جا رہی تھیں۔ اسی دن نظام نے ہتھیار ڈالنے کا اعلان کیا اور ایک نئی کابینہ کے۔ یم۔ منشی کے مشورہ سے قطعیت دی اور جنرل چودھری کے پاس نئی کابینہ کی فہرست بھیجی۔ ۱۸ ر ستمبر کو ہندوستانی فوج کے سربراہ جنرل جے۔ ین۔ چودھری حیدرآبادی فوج کے کمانڈر کے ساتھ بلارم میں داخل ہوئے اور ہتھیار ڈالنے کی تقریب انجام پائی۔ جنرل چودھری نے نظام کی نئی کابینہ کو مسترد کرتے ہوئے مارشل لا کا اعلان کیا اور حیدرآباد کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس طرح حیدرآباد صرف (۵) دن کی فوجی کارروائی میں بغیر لڑے ہندوستان کے حوالے ہو گیا۔

ادھر حیدرآباد کے مسئلہ کے تعلق سے سکیورٹی کونسل کے اجلاس کی تاریخ ۱۶ ر ستمبر کو مقرر ہوئی اور طویل بحث کے بعد حیدرآباد کے مسئلہ کو قبول کیا گیا اور مزید کارروائی کے لئے دوسری تاریخ ۲۰ ر ستمبر مقرر کی گئی چوں کہ ہندوستانی وفد وقت چاہتا تھا۔ ابھی بحث جاری تھی کہ حیدرآباد نے ہتھیار ڈال دینے کا عجلت میں اعلان کیا۔

۱۷ ر ستمبر کو لایق علی نے ریڈیو پر تقریر کی اور کہا :

"ہند یونین کی فوجوں نے کوئی اطلاع دیئے بغیر حیدرآباد کے علاقہ میں کئی سمت سے اقدام شروع کیا۔ باوجود ہمارے محدود وسائل کے ہم نے مقدور بھر کوشش کی لیکن بقیۂ پانچ دن کے تجربہ نے یہ بتلایا کہ ہندوستانی افواج نے غیر معمولی کثیر تعداد میں عصری اسلحہ

خصوصاً ٹینک، دبابے اور بمبار ہوائی جہازوں کے ساتھ ایک ایسے پیمانہ پر حملہ کیا جس کا کبھی بھی پیش از پیش اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ آج لڑائی کے آغاز کا پانچواں دن ہے اور کئی مقامات سے ہم کو پیچھے ہٹنا پڑا مزید مقاومت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کیوں کہ اس کے معنی سوائے اپنی فوجوں کو کٹوا دینے کے اور کچھ نہ تھے اور آج اعلیٰ حضرت نے (۵) بجے سے مطلع فرمایا ہے کہ ان کی (انڈین یونین کی) افواج بلارم اور سکندرآباد میں داخل ہوسکتی ہیں اور نیز یہ کہ رضا کار تنظیم موقوف کردی جائے گی۔''

لایق علی کی تقریر سے قبل قاسم رضوی نے ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا :

''جاؤ مسلمانوں! اپنی بدقسمتی پر روؤ۔ قوموں پر ایسا دن آتا ہے......تم نے ہمیشہ بحیثیت صدر مملکتی مجلس اتحادالمسلمین مملکت آصفیہ اسلامیہ، میری بات مانی ہے آج بھی تم کو بحیثیت، صدر مملکت مجلس اتحادالمسلمین مملکت آصفیہ اسلامیہ حکم دیتا ہوں کہ اپنے ہتھیار واپس کردو۔ تبدیل شدہ حالات کا مقابلہ کرو۔ ہندوستان اپنی عظیم تر فوجی طاقت سے حیدرآباد پر حملہ کررہا ہے جس کا ہم مقابلہ نہیں کرسکتے۔''

(حیدرآباد کے عروج وزوال صفحہ ۲۴۴ و ۲۴۵)

ان دونوں پر جتنا بھی واویلا کیا جائے کم ہے جب لڑ نہیں سکتے تھے تو پھر جوکھم کیوں مول لیا؟

ہندوستان اپنے منصوبہ میں کامیاب رہا۔ وہ تو الحاق چاہتا تھا اور اگر الحاق نہ ہو تو بہ زور طاقت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ گھر کے بھیدیوں نے ہندوستان کا کام آسان کردیا تھا۔ ہندوستان مذاکرات کے ٹیبل پر حق کے مقابل کھڑا نہیں رہ سکتا تھا اسی لئے گفتگو میں اُلجھائے رکھا تانکہ اسے وہ سب راز جس کی اس کو ضرورت تھی مل جائے۔

حیدرآباد کمزور تھا لیکن حق پر تھا اور دنیا سے یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ کمزور اور حق کی تائید کرے گی۔ طاقتور کو جبر واستبداد کی اجازت نہیں دے گی۔ لیکن افسوس کہ دنیا میں یہ اقدار کہاں۔ طاقتور نے ہمیشہ کمزور کو دبوچا اور دنیا تماشا بیں رہی۔

۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو حیدرآبادی وفد نے جو اس کے صدر اعظم اور وزراء پر مشتمل تھا نظام کے ایک نوٹ کے ساتھ قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کرکے ان سے حیدرآباد کے آزاد رہنے کے

سلسلہ میں مشورہ لیا اور دریافت کیا کہ آزاد رہنے کے سلسلہ میں ان سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے۔اس مردِ آہن نے صاف صاف کہا تھا بلکہ تحریراً بھی نظام کو اطلاع دی تھی کہ حیدرآباد کو آزاد رہنے کا حق ہے۔ یا تو آزاد رہیں یا ہندوستان سے الحاق کرلیں۔آزاد رہنا چاہیں تو شہیدوں کی طرح زندہ رہیں۔یا تو میدان کے غازی بنیں یا شہید ہوکر اپنا نام اور مقام اسی طرح بلند کریں جس طرح حضرت حسین علیہ الرحمہ[۵] اور ٹیپوؒ نے حق کے لئے بلند کیا تھا۔مگر گیدڑ کی موت نہ مریں۔نظام میں وہ شہیدی کردار اور اپنے جد کی جذبہ سپہ گری کہاں تھی۔حب زر نے یہ جوہر ختم کردیئے تھے۔ان کے دوغلہ پن کی وجہ سے ساری قوم کو شرمسار ہونا پڑا۔

لایق علی ان کی وزارت اور قاسم رضوی کی غفلت بلکہ نااہلی تھی کہ رزم آرائی جیسے آخری زیست اور موت کے مرحلہ پر سارے کا سارا معاملہ ایک نااہل اور سازشی کمانڈر کے ذمہ کرکے مطمئن ہوگئے تھے۔نااہلیت اور سازش کا یقین جب آخری لمحوں میں ہوا تو کمانڈر کو فوری تبدیل کرکے فوج کے دوسرے درجہ کے عہدیداروں سے بھی کام نہیں لیا گیا۔ایسا نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں بتائی گئی بلکہ لایق علی نے لکھا کہ حالات کے لحاظ سے موزوں نہ سمجھا گیا۔بات اطمینان بخش نہیں معلوم ہوتی۔

حیدرآباد کے زوال کی تاریخ جو بھی پڑھے گا وہ اسے شخصی مفاد، دوغلہ پن، سازش اور نااہلی سے تعبیر کرے گا۔ہندوستانی فوج نے رزم آرائی کے جوہر نہیں دکھائے۔سازش نے اس کا استقبال کیا اسی لئے ہندوستانی فوجی مبصروں کو اس کامیابی پر فتح وکامیابی سے تعبیر کرنے میں پس وپیش رہا۔ چاہے جنگ لڑی جائے یا سازش سے فتح حاصل کی جائے تاریخ میں ہندوستان جارحیت کے بدنما داغ سے بچ نہیں سکے گا۔

---

۵ زوال حیدرآباد کی ان کہی داستان صفحہ ۳۰۶

نظام کی در پردہ کوشش

مذاکرات کے اختتام سے قبل ماہ جون میں جب معاہدہ کے سلسلہ میں گفتگو آخری مراحل طے کر رہی تھی حیدرآبادی وفد کو ماونٹ بیٹن نے حکومت ہند کے فوجی منصوبے کی اطلاع اس انداز میں دی تھی کہ ہندوستانی فوج کو حیدرآباد پر قبضہ کرنے سے کوئی طاقت روک نہیں سکے گی۔ رضاکار اور نظام کی حکومت تو ختم ہو جائے گی لیکن نظام کی ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس کا واضح اشارہ تھا کہ نظام کی جانب سے درباریوں کے ذریعہ یا حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل متعینہ دہلی (زین یار جنگ) کے ذریعہ پس پردہ کوشش ہو رہی تھی کہ نظام کی ذات، خاندان اور دولت کی حفاظت ہو جائے چہ جائے کہ حکومت ختم ہو جائے۔ دربار، حکومت ہند یا کانگریس کے حق میں تھا اور اسی کی توسط سے نظام کی حفاظت کے لئے کام کرنا بعید از قیاس نہیں تھا۔ اِسے مسلم مملکت سے دلچسپی نہ تھی۔ جب مذاکرات ۱۶؍جون کو ناکام ہوئے تو حضور نظام نے در پردہ سر مرزا اسمٰعیل کو استعمال کیا تاکہ کوئی صورت نکل آئے۔ لیکن ان کی کوشش جب طشت از بام ہوئی تو نظام نے چپ سادھ لی اور مرزا اسمٰعیل کی کوشش کو ان کی شخصی کوشش کا نام دے کر بدنامی سے بچنا چاہا۔ اس کے بعد حیدرآباد کا سیاسی مطلع زیادہ تاریک ہونے لگا اور نظام نے محسوس کیا کہ حیدرآباد کا باقی رہنا مشکل ہے تو کے۔ یم۔ منشی کا سہارا لے کر اپنی ذات، خاندان اور دولت کی حفاظت کی کوشش کی۔ یہ بھی کہا گیا کہ بادشاہ ڈوبتی کشتی کو چھوڑ کر اپنی حفاظت کا انتظام کر لیں تو اس میں قباحت کیا ہے۔ نظام ایک مطلق العنان طاقتور بادشاہ تھے۔ ان دنوں اگرچہ مجلس اتحاد المسلمین اور قاسم رضوی کا سیاسی دبدبہ بڑا تھا لیکن وہ ان کے دباؤ اور چنگل میں پھنسے ہوئے نہ تھے۔ وہ اس نازک وقت پر بھی اتنی طاقت رکھتے تھے کہ آزادانہ اور اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان آخری ایام میں ماونٹ بیٹن نے اپنے پریس اتاشی کیبل جانسن کو حیدرآباد بھیجا تاکہ حالات کا صحیح علم ہو سکے۔ کیبل جانسن نے نظام سے بھی ملاقات کی اور گھوم کر

حالات کا جائزہ لے کر جو رپورٹ دی تھی اس میں لکھا تھا کہ نظام ،مجلس یا قاسم رضوی کے چنگل میں نہیں ہیں ۔ وہ اب بھی مقتدر ہیں اور آزادانہ فیصلہ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں ۔ مذاکرات جن اُمور پر ٹوٹے وہ حیدرآباد کا یہ اصرار تھا کہ مالی ، معاشی ، تجارتی آزادی اور ثالثی کی مراعات دی جائیں حکومت ہند نے ان سب سے اختلاف کیا تھا۔ اس وقت حیدرآباد (نظام ان کی کابینہ اور مجلس) اپنی آزادی کے ایک بڑے حصہ کو حکومت ہند کے حوالے کرنے تیار ہو گیا تھا نظام ان جزیات کو بھی حکومت ہند کے حوالے کر کے راست الحاق کر لینے کا جرأت مندانہ اقدام کر لیتے حیدرآباد اس بڑے سانحہ سے نہ گذرتا۔ نظام کا مقام اور دولت بھی محفوظ رہتی اور مسلمان بڑے پیمانہ پر تباہ نہ ہوتا۔ غالباً غداری کا بدنما داغ سر عام لگنے کے خوف نے ایسا کرنے نہیں دیا۔

۱۸ر ستمبر کو جب ہندوستانی فوج نے حیدرآباد پر قبضہ کیا تو عام رواج کے مطابق شکست خوردہ بادشاہ کو حراست میں لیا جاتا اور ساری دولت مال غنیمت بنائی جاتی ۔ نہ تو نظام گرفتار کئے گئے اور نہ ان کی دولت پر قبضہ کیا گیا۔ لایق علی ان کے وزیر اور عوامی نمائندوں کو حراست میں لیا گیا۔ مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ لوٹا گیا اور تباہ و تاراج کیا گیا مگر نظام ہر لحاظ سے محفوظ رہے ۔ آخر اس کی وجہ کیا تھی؟ اس کی وجہ ان کی دولت تھی ۔ نظام باقی تھے لیکن ملٹری راج تھا۔ ملٹری گورنر نے اپنے خط مورخہ یکم فبروری ۴۹ء کے ذریعہ چند شرائط پیش کیں جن کو بعد میں ایک مقدس معاہدہ میں تبدیل کیا گیا جن کے فریق حکومت ہند اور نظام تھے ۔ نظام نے اس معاہدہ کو قبول کرتے ہوئے ایک کثیر رقم قرض کے نام سے دی۔ اس معاہدہ کے ذریعہ نظام اور ان کے اہل خاندان کو ان کے سارے شخصی اعزازات ، مراتب اور خطابات جو آزادی سے قبل تھے باقی رکھے گئے اور انھیں اندرون و بیرون ملک استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ۔ انھیں بھی دیگر ریاستوں کے سربراہوں کی طرح جیب خاص کی سالانہ رقم (۵۰) لاکھ روپئے تاحیات مقرر کی گئی ۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں کے لئے بھی گنجائش پیدا کی گئی (۲۵) لاکھ روپئے محلات کے اخراجات ، ۲۵ لاکھ روپئے معاوضہ صرف خاص اور شہزادے ، شہزادیوں اور پوتوں وغیرہ کے لئے (۲۵) لاکھ روپئے دینے کی طمانیت دی گئی ۔ اس طرح سے سالانہ ایک کروڑ (۲۵) لاکھ روپئے دینے کا اقرار کیا گیا۔ لیکن نظام کو سالانہ تاحیات (۲۵) لاکھ روپئے ہی ادا ہوتے رہے۔

نظام کے قیمتی جواہرات اور دولت کے بڑے حصہ کو یہ کہہ کر حکومت ہند کے خزانے میں داخل کیا گیا کہ ان کی حفاظت کی جائے گی۔ آج تک بھی یہ قیمتی جواہرات اور دولت واپس نہ ہو سکی۔

نظام بہر حال ہر لحاظ سے محفوظ رہے۔ لیکن ان پر جان دینے والے اور قربان ہونے والے مسلمانوں کا قتل عام ہوا اور وہ تباہ و تاراج ہوئے۔ کیا نظام نے کبھی ان کی بربادی کا نوٹ لیا۔ کیا ایک ٹرسٹ کے ذریعہ معمولی رقم سے چند کی اشک شوئی کرنا کافی ہے۔ کیا ایک معتد بہ حصہ دولت ان کی فلاح اور زخم مندمل کرنے وقف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیا اس بیش بہا دولت سے ان کے لئے تعلیمی، معاشی اور دیگر فلاحی ادارے قائم نہیں کئے جا سکتے تھے۔ نہیں نظام کی دولت کا حقدار ہندوستان تھا۔

سکیورٹی کونسل میں حیدرآباد کا مسئلہ

حکومت حیدرآباد نے ۱۷/اگست ۴۸ء کو حکومت ہند کو اطلاع دی کہ معاہدہ انتظام جاریہ کی خلاف ورزیاں، معاشی ناکہ بندی، سرحدی شورش اور حکومت ہند کی فوج کا حیدرآبادی سرحدوں میں داخل ہونا حالات کو بگاڑنے کے موجب ہے اور امن و امان کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے اس لئے سکیورٹی کونسل سے رجوع ہونے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ تنازعات سکیورٹی کونسل کی مدد سے طے پا جائیں اور دونوں ممالک کے تعلقات خوشگوار رہیں۔ ۲۱/اگست کو معتمد اُمور خارجہ ظہیر احمد کی دستخط سے سکیورٹی کونسل میں مسئلہ پیش کیا گیا۔ حکومت نے ظہیر احمد کو نامزد کیا۔ سکیورٹی کونسل میں ۲۶/اگست کو مسئلہ پیش کرنے کی اطلاع مل گئی۔ اسی دوران ۲۳/اگست کو حکومت ہند نے حیدرآباد کو اطلاع دی کہ یہ معاملہ ہندوستان اور حیدرآباد کا گھریلو ہے اور ہندوستان بین الاقوامی قانون کے تحت حیدرآباد کو سکیورٹی کونسل سے رجوع ہونے کا حق تسلیم نہیں کرتا یا کوئی بیرونی جماعت ان دونوں ممالک کے معاملہ میں تصفیہ کرنے کے لئے مداخلت نہیں کرسکتی۔ غالباً اس واقعہ کے بعد حکومت ہند نے حملہ کرنے کے انتظامات تیز کردیئے تاکہ سکیورٹی کونسل کی مداخلت سے قبل ہی حملہ کر کے قبضہ کرلیا جائے قاسم رضوی نے بھی یہی قیاس آرائی کی تھی جو صحیح ثابت ہوئی۔ حکومت حیدرآباد نے معین نواز جنگ کی سرکردگی میں ایک وفد نامزد کیا جن میں عبدالرحیم وزیر، شیام سندر قائد پست اقوام، سری پت راؤ ہائی کورٹ جج اور میر نواز جنگ ایجنٹ جنرل متعینہ لندن ارکان تھے۔ ظہیر احمد کو اس وفد کا سکریٹری نامزد کیا گیا۔ سفر اور زر مبادلہ کی دقتوں کی وجہ سے وفد کے نکلنے میں تاخیر ہوئی۔ معین نواز جنگ شیام سندر کے ساتھ ۱۰/ستمبر ۴۸ء کو کراچی پہنچے جب کہ دوسرے ارکان نکلنے والے ہی تھے کہ قائداعظم کا انتقال ہو گیا اور ۱۳/ستمبر کو ہندوستان حملہ آور ہوا تو باقی کے ارکان جا نہ سکے۔

معین نواز جنگ، شیام سندر کے ساتھ ۱۳/ستمبر لندن پہنچے اور دوسرے دن اولین فلائیٹ سے

پیرس گئے جہاں سکیورٹی کونسل کا اجلاس ہونے والا تھا۔ پیرس پہنچنے کے ساتھ ہی معین نواز جنگ نے سکیورٹی کونسل کے کارگذار سکریٹری سے ربط پیدا کیا اور ضروری کاغذات داخل کر دیئے اور ہندوستان کے حملہ کی وجہ سے فوری اجلاس طلب کرنے کی درخواست کی۔ جس کے نتیجہ میں جلد از جلد تاریخ ۱۶رستمبر مقرر ہوئی۔ ظہیر احمد پہلے سے ہی موجود تھے۔ اہم معاملہ حیدرآباد کا مسئلہ سکیورٹی کونسل میں قبولیت کا تھا چوں کہ حیدرآباد اقوام متحدہ کا ممبر نہ تھا۔ قاعدہ ۳۵ (۲) کے تحت سکیورٹی کونسل کو غیر ممبر کے معاملہ کو بھی قبول کرنے کا اختیار تھا۔ اسی دفعہ کے تحت مسئلہ پیش کیا گیا اور ضروری کارروائی کی درخواست کی گئی۔ سر والٹر مانکٹن کی وجہ سے لندن میں چند اہم قانون دانوں کی مدد بھی مل گئی تھی۔

معین نواز جنگ نے مسئلہ کو بڑی خوبی سے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان نے الحاق کے لئے بڑے اوچھے طریقے اختیار کئے ہیں۔ ان کی تفصیلات بتاتے ہوئے فوجی حملہ کی تفصیل پیش کی اور کہا کہ کس طرح مسلح افواج کو بڑے پیمانہ پر زمینی اور ہوائی حملوں کے لئے استعمال کر کے خون آشام بازار گرم کیا گیا اور حیدرآباد کے وجود کو خطرہ میں ڈال دیا۔ سکیورٹی کونسل سے اپیل کی کہ وہ امن عالم کو قائم رکھنے اور جارحیت کو روکنے کی ذمہ دار ہونے کے ناطے اس کا فرض بنتا ہے کہ حملہ کو روکے اور فریقین میں باعزت سمجھوتہ کروادے۔ معین نواز جنگ کی تقریر بڑی موثر تھی اور اکثر اراکین حیدرآباد کے حق میں آ گئے تھے۔ ان کے جواب میں ہندوستان کے نمائندہ سر راما سوامی مدلیار نے ایک مختصر سی تقریر کی اور حیدرآباد کی آزاد حیثیت کو چیلنج کرتے ہوئے مسئلہ پر غور وفکر کرنے کے لئے ۲۰رستمبر تک وقت مانگا۔ سکیورٹی کونسل نے (۳) کے مقابل (۸) اراکین کی اکثریت سے حیدرآباد کے معاملہ کو قبول کیا اور مزید بحث ۲۰رستمبر مقرر کی۔ تین اراکین نے ووٹنگ میں حصہ نہ لیا اور کسی نے مخالفت نہیں کی۔ ہندوستان حملہ آور ہونے کی حیثیت سے جرم کی مدافعت نہ کر سکا اور کسی ملک نے بھی ہندوستان کا ساتھ نہ دیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حیدرآباد کا وفد درخواست کی قبولیت پر زیادہ زور دیتا رہا اور جنگ بندی کی تحریک پیش نہیں کی۔ جارحانہ اقدام کو روکنے کے لئے جنگ بندی پر اصرار کیا جاتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ منظور نہ ہوتی۔ اگر سلامتی کونسل کے ارکان کو کاغذات کا مطالعہ اور صلاح مشورہ کے لئے وقت درکار تھا تو جارحانہ اقدام کو روکنے کے لئے وہ رکاوٹ نہیں بن سکتے تھے۔ ۱۶رستمبر کو جنگ کی حالت بڑی نازک تھی اور حیدرآبادی وفد موقتی اقدامات کرنے میں ناکام رہا۔ مزید برآں

مذاکرات کے انقطاع کے بعد مقدمہ دائر کرنے میں تین ماہ کی تاخیر کی گئی۔ تاخیر نہ کی جاتی تو اس مدت میں ضروری اقدامات کئے جاتے اور حکومت ہند کو اس کے منصوبہ میں کامیابی سے روکا جاسکتا تھا

۱۶ر ستمبر کو حیدرآباد کے سب ہی محاذوں سے اطمینان بخش خبریں نہ تھیں اور فوجیں جس تیزی سے پیش قدمی کررہی تھیں ان حالات کے پیش نظر وفد کو ۲۰ر ستمبر سے پہلے سکیورٹی کونسل کی طلبی کا مطالبہ کرتے ہوئے ضروری کارروائی کرنے کی ہدایتیں دی گئی تھیں۔ وفد بڑی تگ و دو کرکے ایمرجنسی (Emergency) کے تحت جلد از جلد اجلاس طلب کرنے کی کوشش کی ۱۸ر ستمبر اجلاس کا انعقاد طے پایا۔ لیکن اس سے قبل یعنی ۱۷ر ستمبر کو حیدرآباد نے ہتھیار ڈال دیئے اور ۱۸ر ستمبر کو حیدرآباد پر قبضہ کیا گیا۔ ۱۷ر ستمبر کو ہندوستانی فوج کے بی بی نگر علاقہ میں پہنچنے کی غلط اطلاع دے کر جو دھوکا دیا گیا وہ ہندوستان کے لئے بڑا کارآمد ہوا۔ اگر یہ دھوکہ نہ ہوتا اور چند دن تک فوج سے مزاحمت جاری رہتی تو ممکن تھا کہ ۱۸ر ستمبر کو سکیورٹی کونسل میں کچھ نہ کچھ کارروائی ہوتی۔ اسی دن نظام نے سکیورٹی کونسل سے حیدرآباد کے مسئلہ کو واپس لینے کا تار دیا۔ اب حالات میں بڑا فرق آ گیا تھا۔ حیدرآباد کے وفد کے لئے رہی سہی اُمید بھی جاتی رہی اور مقررہ تاریخ کے مطابق یعنی ۲۰ر ستمبر کو اجلاس ہوا تو صدرنشین نے حیدرآبادی نمائندہ سے اخباری اطلاعات کے مطابق حیدرآباد کا مسئلہ واپس لینے پر تبصرہ کرنے کے لئے کہا تو ظہیر احمد نے کہا کہ انھیں ایسا کوئی تار وصول نہیں ہوا ہے۔ راماسوامی نے جواباً کہا کہ ہندوستانی فوج ۱۸ر ستمبر کو حیدرآباد پر قابض ہوگئی ہے اور نظام کا تار حیدرآباد ریجنٹ جنرل کے نام تھا اور حیدرآباد کا مسئلہ واپس لینے کے لئے کہا گیا تھا اور وہ تار ان کے توسط سے روانہ کیا گیا تھا۔ حیدرآبادی وفد سے ربط نہ ہونے کی وجہ سے یہ تار انھیں نہیں دیا گیا۔ ہندوستان کے وفد نے حیدرآباد کے مسئلہ کی اہلیت پر اعتراضات کرتے ہوئے کہا کہ حیدرآباد کے حالات نہایت خراب ہوگئے تھے اور امن وامان باقی نہیں تھا اس لئے ہندوستان کو مداخلت کرنا پڑا۔ امن وامان قائم کرنے کے بعد حیدرآباد کے عوام کو ان کا مستقبل طے کرنے کا موقع دیا جائے گا اور حالات کے معمول پر آتے ہی ہندوستانی فوج واپس ہوگی۔ یہ اقوام عالم کے سامنے ایک جھوٹ اور فریب تھا۔ بین الاقوام سے کیا گیا وعدہ آج تک بھی تکمیل نہ پایا۔

ارجنٹائن کے نمائندے نے سکیورٹی کونسل پر کڑی تنقید کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی مجہولیت

پر خوب لے دے کی اور کہا کہ کمزور اقوام کو ظلم و استبداد سے بچانے امن و امان کو یقینی بنانے کا اس کا جو فریضہ ہے وہ اس میں ہمیشہ نا کام رہی۔ بحث کے لئے تاریخیں بدلتی گئیں اور مسئلہ بحث و مباحث کی نذر ہو گیا۔ بالآخر ۱۹ رمئی ۱۹۴۹ء کو پاکستان کے وزیر خارجہ مسٹر ظفر اللہ خاں کی کوشش سے بحث ہوئی مسٹر ظفر اللہ خاں نے جو تاریخی تقریر کی وہ سکیورٹی کونسل کی چند بہترین تقریروں میں سے ایک تھی۔ مفاہمت، قانون استدلال اور منطق کے زور سے قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کے بعد سے سقوط حیدر آباد تک کے واقعات کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا۔ مسٹر ظفر اللہ خاں نے کہا کہ فوج کشی کے ذریعہ ہندوستان حملہ آور ہوا، حیدر آباد میں لاقانونیت کو ہوا دی، سرحدی ہنگامے کئے، معاشی نا کہ بندی کی اور دیگر تخریبی کارروائیوں کے ذریعہ الحاق کے لئے مجبور کیا گیا۔ الحاق نہ کیا تو "پولیس ایکشن" کے جھوٹے نام سے حملہ آور ہوا اور فوجی حکومت قائم کر کے نسل کشی اور انسانیت سوز مظالم کئے ہندوستان کو دنیا اور اقوام متحدہ میں ظالم اور جارح ثابت کیا۔ یہ دستاویزی ثبوت ہندوستان کے خلاف آج بھی سکیورٹی کونسل کی زینت بنا ہوا ہے تا کہ آنے والی نسلیں ہندوستان کی جارحیت اور بربریت کا مطالعہ کر سکیں۔ ہندوستانی وفد کے سربراہ سر بینگل این راؤان حقیقتوں کو جھٹلا نہ سکے اور ظفر اللہ خاں کے سامنے بے اثر رہے۔

آج تک سکیورٹی کونسل میں یہ مسئلہ تصفیہ کے لئے پڑا ہوا ہے۔ حال ہی میں (اپریل ۲۰۰۰ء) اقوام متحدہ جانے کا اتفاق ہوا تو اس مسئلہ کا وجود ویسی ہی پایا جیسا کہ جونا گڑھ اور کشمیر کا ہے۔

رضا کار

رضا کاروں کو انگریزی میں والنٹیرس کہتے ہیں جو ہر جماعت کے لازم جز ہوتے ہیں جن کے ذریعہ تنظیموں کے کاروبار چلائے جاتے ہیں۔ کانگریس، مسلم لیگ اور دیگر تنظیموں میں رضا کار رہے ہیں۔ تحریک آزادی میں رضا کار کانگریس اور مسلم لیگ میں نمایاں حصہ لے چکے ہیں۔ تحریک ستیہ گرہ ان ہی کی ذریعہ تکمیل پاتی تھی۔ رضوی صاحب کے نام کے پہلے حرفوں کو جوڑ کر ان کے ہراول دستہ کی حیثیت دے کر ہندوستان اور باہر اسے خوب شہرت دی گئی۔ رضا کار (والنٹیرس) مجلس اتحادالمسلمین میں کوئی نئی چیز نہیں۔ بہادر یار جنگ کے زمانہ سے ہی رضا کار اتحادالمسلمین کا ایک اہم جزاور روح رواں تھے۔ ہر شاخ میں رضا کاروں کو نیم فوجی انداز میں تیار کیا جاتا تھا۔ باضابطہ رجسٹر رکھا جاتا۔ فوجی یونیفارم، پریڈ، ورزش، پانچ وقت کی نماز اور روز تین کلام پاک کی آیتوں کی تلاوت لازم تھی۔ ان شرائط کو اگر پورا نہیں کیا جاتا تو افسر متعلقہ مناسب سزا بھی دیتا تھا۔ اسلحہ میں بھرمار بندوقیں تھیں جن کے رکھنے کی اس وقت عام اجازت تھی۔ مجلس کے سالانہ اجتماعات کے وقت رضا کاروں کے کیمپ قائم ہوتے اور پرچم آصفی کو سلامی دیتے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران جب حیدرآباد کی فوج جنگ میں مصروف تھی تو ملک میں امن وامان قائم رکھنے کے لئے اسی نیم عسکری تنظیم سے مدد لی گئی۔ ۱۹۴۰ء میں خاکسار تحریک کو کچلنے کے لئے جب حکومت نے رضا کارانہ تنظیموں پر پابندی عائد کی تو اس پر حیدرآباد میں امتناع عائد کیا گیا۔ یونیفارم پہننے اور پریڈ کرنے پر جب پابندی ہوئی تو بہادر یار جنگ نے یونیفارم کو ترک کر دیا اور پریڈ کی بجائے ورزش کی جانب توجہ دے کر عسکری تنظیم کے کردار کو باقی رکھا۔ بہادر یار جنگ خود بھی رضا کار تھے بلکہ بڑے سرگرم۔ یونیفارم پہنتے ہوئے پریڈ میں شامل رہتے، سالار کا حکم بجالاتے اور کسی معمولی لغزش پر سالار سزا دے تو چلچلاتی دھوپ میں سالار کے حکم کی تکمیل کرتے تاکہ نوجوانوں میں جذبہ اطاعتِ امیر پیدا ہو۔ اس طرح سے اپنے عمل

سے رضا کار تنظیم میں روح پھونکی اور ڈسپلن پیدا کیا۔

کانگریس کی پالیسی دیسی ریاستوں کے آزاد رہنے کے خلاف تھی۔ وہ دیسی ریاستوں کے وجود کو ختم کر کے ہندوستان میں ضم کرنا چاہتی تھی۔ دفعہ (۷) قانون آزادی ہند کے تحت حیدرآباد نے ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کو آزادی کا اعلان کیا تو مخالف حیدرآباد تحریکیں آریہ سماج، ہندو مہا سبھا اور کانگریس نے حیدرآباد کی آزادی کے خلاف حیدرآباد کی سرحدات پر اور خود اندرون حیدرآباد تخریبی کارروائیاں شروع کیں اور امن میں خلل ڈالنے لگیں۔ شورش، قتل و غارت کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا تاکہ حیدرآباد کو ہند یونین میں شریک کیا جائے۔ سرحدی شورشیں، قتل و غارت گری اور امن شکن سرگرمیوں کا انسداد حکومت حیدرآباد کا فرض ہو گیا تھا۔ سرحدوں پر رہنے والی رعایا (ہندو و مسلم) پریشان تھی اور گاؤں چھوڑ کر محفوظ مقامات پر منتقل ہونے لگی تھی۔ عوام اور سرحدات کی حفاظت ایک اہم مسئلہ بن گیا تھا۔ حیدرآباد کی طویل سرحد کوئی دو ہزار میل پر محیط تھی۔ قاسم رضوی نے فوری حکومت کو توجہ دلائی کہ فوری انتظامات کئے جائیں تاکہ لوگوں کی جان و مال کی حفاظت ہو اور امن و امان متاثر نہ ہو۔ ناکافی فوج اور پولیس اور پوری طرح سے مسلح نہ ہونے کی وجہ سے حکومت کے لئے ایک مسئلہ پیدا ہو گیا تھا خاص طور پر شمال اور شمال مغربی سرحدات پر جہاں کانگریس، آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا کے تعاون سے امن شکن کارروائیوں میں ملوث تھی۔ قاسم رضوی نے اس نازک صورت کو بھانپ کر معاملہ کو اپنی جماعت سے رجوع کیا۔ حفاظت خود اختیاری (Self Defence) کا منصوبہ رکھا جس کو مجلس نے قبول کیا۔ اس منصوبہ کے تحت قدیم اور جدید رضا کاروں کو مختصر سی ٹریننگ دی گئی اور تفصیلی ہدایتیں دی گئیں کہ کس طرح سے کام کیا جائے۔ مقامی افراد کو ساتھ لے کر انھیں معمولی ہتھیار چلانے اور ڈرل کی ٹریننگ دے کر حملہ آوروں سے مدافعت کے لئے تیار کیا گیا۔ مقامی افراد کے پاس جو بھی ہتھیار تھے انھیں چلانے کی ٹریننگ دی گئی اور جو گن یا بندوق رکھنے کی حیثیت نہ رکھتے تھے انھیں برچھے، بھالے اور تلوار وغیرہ ذاتی حیثیت میں مہیا کر لینے کی ترغیب دی گئی۔ قدیم رضا کاروں کو اچھی ٹریننگ کے مقصد سے جہاں بھی اچھی ٹریننگ ہوتی تھی بھیجا جاتا ہتھیار چلانے اور ڈسپلین قائم رکھنے کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ واپسی پر یہ تربیت یافتہ رضا کار اپنے اپنے مقامات پر مقامی آدمیوں کو ٹریننگ دے کر تیار کرنے لگے۔ قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں یہ تحریک چل پڑی۔ لوگ مسلمان، ہندو، پارسی

سب ہی شریک ہوگئے تھے۔ ہفتہ میں مناسبت کے لحاظ سے چند مخصوص دن کھلے میدان میں لوگ جمع ہوتے جہاں رضا کار انھیں ہتھیار چلانے کی ٹریننگ دیتے اور ڈرل کرواکر مدافعت کے طریقہ سکھاتے تھے۔ یہ سب رضا کار یعنی والنٹیرس کہلانے لگے۔ داخلہ شرکت بہت آسان تھا۔ جو بھی شریک ہونا چاہے اسے اپنا ہتھیار خود لانا ہوتا اور جو ہتھیار نہ لاسکتا ایک لانبی لکڑی پر نکیل لگا کر بھالا بنالیتا اور اپنے آپ کو قریبی رضا کار کیمپ میں رجسٹر کرواتا۔ انھیں سخت ہدایتیں تھیں کہ صرف حملہ آوروں سے ہی نمٹا جائے، گاؤں والوں کو کسی شکل میں نہ چھیڑا جائے اور گاؤں کا امن وامان قائم رکھا جائے۔ رضا کاروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا کر ایک حصہ حملہ آوروں کو روکنے کے لئے استعمال کیا جاتا اور دوسرا عورتوں، بچوں اور مال ومتاع کی حفاظت کے لئے۔ اس طرح سے حفاظت خود اختیاری کامیاب طریقہ پر چلنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ایک بڑی تحریک بن گئی۔

سرحد پار سے جو شورش اور مداخلت کاری تھی وہ کافی مسلح تھی۔ یہ لوگ جدید ترین اسلحہ سے لیس ہوکر آتے لیکن رضا کاروں کے مقابل کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ جب مدبھیڑ ہوتی تو ہتھیار چھوڑ کر بھاگ جاتے اور یہی ہتھیار رضا کاروں کے کام آتے۔ اس تحریک حفاظت خود اختیاری کی وجہ سے سرحدی شورشیں، کمیونسٹ مداخلتیں اور اندرون ملک تخریبی اور امن شکن کارروائیاں کنٹرول میں آئیں۔ یہی وہ چیز تھی جو ہندوستانی حکمرانوں کو ان کے مفاد اور شورش پھیلانے کی پالیسی کے خلاف پڑتی تھی اس لئے حکومت ہند کی نظر میں یہ تنظیم قابل گردن زدنی سمجھی گئی تھی۔

حکومت حیدرآباد جو فوج پولیس اور اسلحہ کی کمی کی وجہ سے اِن امن شکن حرکتوں کو کنٹرول کرنے میں مشکل محسوس کررہی تھی اسی لئے کسی قسم کے اعتراض کے موقف میں نہ تھی بلکہ یہ تحریک حکومت کے لئے امن وامان قائم رکھنے میں بڑی مدد ومعاون بن گئی تھی۔ ان رضا کاروں میں اگرچہ کہ ہندو اور پارسی بھی تھے لیکن مسلم اکثریت کی وجہ سے یہ مسلم رضا کاروں کے نام سے ہی موسوم رہی۔ قاسم رضوی کی ولولہ انگیز تقاریر نے حفاظت خود اختیاری، جذبہ قربانی اور اپنی سلطنت وقوم کی بقاء کے لئے جان سے کھیل جانے کا جو جوش پیدا کیا تھا وہ بے مثال تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند مہینوں میں یہ ایک بڑی تنظیم بن گئی اور تقریباً دولاکھ سے زیادہ رضا کار حفاظت خود اختیاری اور حفاظت وطن کے لئے جان دینے کھڑے ہوگئے۔ قاسم رضوی کا یہ بڑا کارنامہ تھا۔ خود حکومت حیدرآباد چاہتی تھی کہ

امن و امان کے خاطر عوام کو مسلح کیا جائے لیکن قاسم رضوی نے حکومت کے تعاون کے بغیر یہ بڑا کارنامہ انجام دیا۔ اسی تحریک و تنظیم کی وجہ سے سرحدی شورشوں پر کنٹرول اور اندرون ملک امن قائم رہ سکا جو نا کافی فوج اور پولیس سے ممکن نہیں ہو رہا تھا۔ اسی تحریک کی وجہ سے اندرون ریاست، بیرون ریاست اور حکومت ہند کی فوج کی نچلی سطحوں پر ایک ہیبت بیٹھ گئی تھی۔ امن شکن اور تخریب کار ہندو اور ان کی تنظیمیں رضا کاروں سے لرزہ بہ اندام تھیں۔

رضا کار تنظیم نتیجہ تھی کانگریس، آریہ سماج، ہندو مہا سبھا اور حکومت ہند کی جانب سے ہونے والی امن شکن کارروائیوں اور شورشوں کا جو حیدرآباد کے خلاف زبردست پیمانے پر چلائی جا رہی تھیں۔ قاسم رضوی اور مجلس کا یہ کارنامہ تھا کہ قلیل مدت (مشکل سے ایک سال) میں ایک بڑی نیم فوجی تنظیم تیار کی۔ اس میں صرف بیس فیصد رضا کار جدید ترین رائفل، بھرمار بندوقوں اور پستولوں سے لیس تھے اور باقی سب برچھے بھالے اور تلوار رکھتے تھے۔ یہ نیم عسکری تنظیم نہ تو گریلا طرز کی جنگ کے ٹرینڈ تھے، نہ گریلا جنگ کر سکتے تھے اور نہ کسی محاذ پر جنگ کے لئے کارآمد تھے۔ البتہ جوش جذبہ میں سر سے کفن باندھے ہوئے تھے۔

اس نیم عسکری تنظیم کی وجہ سے جب حکومت ہند اور اس کے تخریب کار سرحدی شورشوں اور امن و امان میں خلل ڈالنے میں ناکامی محسوس کرنے لگے تو اندرون اور بیرون ملک حکومت ہند کے ذرائع ابلاغ اور ہندو پریس نے ان کے خلاف شدید پروپگنڈہ شروع کیا۔ ٹائمس آف انڈیا اور کانگریسی پریس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور من گھڑت کہانیاں گھڑی جانے لگیں۔ بیرون ملک سفارت خانوں کے ذریعہ پروپگنڈہ کیا جانے لگا کہ ہندوؤں کی جان و مال خطرہ میں ہے۔ سرحدات پر ہندو خاندان رہتے تھے اور ان کے بعض رشتہ دار سرحد پار تھے۔ حیدرآبادی سرحد میں رہنے والے ہندو خاندانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ سرحد پار منتقل ہوں کیوں کہ حکومت ہند حیدرآباد پر حملہ کرنے والی ہے اور اس وقت رضا کار ہندوؤں کا قتل عام کریں گے۔ اس پروپگنڈہ کی وجہ سے چند ہزار ہندو حیدرآباد چھوڑ کر انڈین یونین میں چلے گئے۔ پروپگنڈہ سے متاثر ہو کر کئی بیرونی صحافی برسر موقعہ معائنہ کے لئے حیدرآباد آئے، سرحدات کا دورہ کیا جس کے بعد ان واقعات کو پروپگنڈہ قرار دیا۔

قاسم رضوی کی جذباتی اور غیر دانشمندانہ تقاریر و بیانات حکومت ہند کو پروپگنڈہ کرنے کا

موقعہ مہیا کیا تھا۔ایک جذباتی تقریر میں قاسم رضوی نے کہا تھا کہ اگر حکومت ہند حملہ آور ہو تو آصفی پرچم لال قلعہ پر لہرائے گا اور خلیج بنگال کی لہریں نظام کے قدم چومے گی۔اسی طرح سے مئی ۷ ۴ ۹ ء میں حضور نظام کی سالگرہ کے موقعہ پر اسلحہ کے ساتھ رضا کاروں کے ایک بڑے مظاہرہ کا پروگرام بنایا تھا جس میں پچاس ہزار رضا کاروں کی شرکت متوقع تھی۔لیکن اتنی بڑی تعداد میں رضا کاروں کے پاس اسلحہ نہ تھا تو کوشش کی کہ کہیں سے اسلحہ عارضی طور پر حاصل کئے جائیں لیکن یہ کہیں سے لے آنا بھی مشکل تھا۔بغیر اسلحہ کے ہی بڑی منظّم ریلی منعقد کی۔ ہزاروں نے ریالی دیکھی۔بیرون اور اندرون ملک کے صحیفہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی۔صحیفہ نگاروں نے جب اسلحہ نہ دیکھا اور بغیر اُسلحہ کے ریالی منعقد کرنے کا سبب دریافت کیا تو قاسم رضوی نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ رضا کاروں کے پاس اسلحہ نہیں ہیں۔صحیفہ نگار کیسے یقین کرتے جب کہ رضا کاروں کی اسلحہ کے ساتھ تصاویریں اخباروں میں چھپتی رہیں اور بڑا اسلحہ رکھنے کا دعویٰ کیا جاتا رہا۔صحیفہ نگاروں نے بات کا بھتنگڑ بنا دیا اور یہ تصویر دی کہ رضا کار ہتھیاروں سے مسلح ہیں مگر مصلحتاً ہتھیاروں کی نمائش نہیں کی گئی۔ اس طرح کی حرکتوں نے حکومت ہند کو نہ صرف پروپگنڈہ کا ہتھیار ہاتھ لگا بلکہ حملہ کرنے کا جواز مہیا کیا۔

قاسم رضوی نے انتہائی مختصر عرصہ میں اسی تنظیم میں جان ڈالی تھی اور جذباتیت کی وہ روح پھونکی تھی کہ رضا کار جوش جہاد کے جذبات سے معمور تھے۔ ہنگامی حالت میں بڑی تیزی سے اُبھرنے کی وجہ سے جب اس کی تعداد میں اضافہ ہوا تو اس پر جو کنٹرول کرنا تھا وہ نہ کیا جاسکا۔کم تعلیم و تربیت یافتہ، اخلاق، کردار اور سماجی حیثیت سے نچلے سطح کے لوگ آ گئے تھے اور ان غنڈہ عناصر کی وجہ سے تنظیم کی بدنامی بھی ہوئی۔بعض غنڈہ عناصر سے کہیں کہیں لوٹ مار، قتل و غارت گری وغیرہ جیسی وارداتیں سرزد ہوئیں۔بشیر احمد وکیل جیسے ناقابل اطمینان کردار والے شخص کو ریاست کا سپہ سالار مقرر کیا گیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ غنڈہ عناصر کو ان کی پشت پناہی حاصل تھی۔جس کی وجہ سے خود قاسم رضوی اور تنظیم کی بدنامی ہوئی۔قاسم رضوی کو جب اس جانب توجہ دلائی گئی اور بشیر احمد کو علحدہ کرنے کا مشورہ دیا گیا تو حالات کا لحاظ کرتے ہوئے وہ خاموش رہے۔

مجلس اور حکومت کے لئے یہ عناصر مسائل پیدا کرنے لگے۔بی بی نگر کا حادثہ (جس میں قاسم رضوی کو خوامخواہ سات سال کی سزا ہوئی) شعیب اللہ خان صحافی کا قتل، ناندیڑ کے قصبہ لوہا کی منڈی

میں زیادتیاں اور لوٹ مار اور بعض سرحدی علاقہ میں زیادتیاں ہوئیں۔ ویسے عام طور پر ہندوؤں اور دوسرے فرقوں پر ظلم نہیں کیا گیا بلکہ ان کی حفاظت کی گئی۔ چند واقعات کو بنیاد بنا کر بے جا پروپگنڈہ کرنا ہی پروپگنڈہ کا جوہر ہے۔ حکومت ہند کے ذرائع ابلاغ ان کے خلاف شر اور مبالغہ آمیز پروپگنڈہ میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ہر عسکری یا نیم عسکری تنظیم سے کچھ نہ کچھ زیادتیاں سرزد ہوتی ہیں۔ آج کل کی عسکری تنظیمیں جو ساری دنیا میں کام کر رہی ہے اور ان سے جو زیادتیاں ہو رہی ہیں ان کے مقابل یہ عشر عشیر بھی نہیں تھیں۔ نکسلائیٹ تحریک نے کیا کچھ نہیں کیا۔ شمال مشرقی ہندوستان کی عسکری تنظیم کیا کچھ نہیں کر رہی ہیں۔ کشمیر کے عسکریت پسند کیا گل کھلا رہے ہیں۔ ان کے مقابل یہ کچھ نہ تھا۔

حکومت ہند خوب واقف تھی کہ یہ نیم عسکری تنظیم جس کا بیس فیصد حصہ گن اور رائفل جیسے معمولی اسلحہ سے لیس تھا حکومت ہند کی فوج کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ رضا کار سوائے دبابوں میں روندے جانے اور مارے جانے کے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ صرف پروپگنڈہ کر کے حملہ کا جواز بنانا تھا بنالیا۔

یہ جانباز جب وقت آیا تو صرف برچھے بھالے اور تلوار لے کر اپنی اور اپنے وطن کی آزادی کے لئے سر سے کفن باندھے ماں کا دودھ بخشائے بغیر نکل پڑے تھے۔ دبابوں کے سامنے لیٹ گئے اور برچھے بھالوں سے دبابوں کے چین گراتے ہوئے اپنی جان آفرین قربان کی۔ ہزاروں نے قربانی اس وقت دی جب حیدرآباد کی فوج تماشابین بن کر پیچھے ہٹ رہی تھی۔ ایسی بڑی قربانی کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ ان جیالوں کے لئے جس قدر خراج عقیدت پیش کیا جائے کم ہے بلکہ تاقیامت ان جیالوں کا احسان ہم سب پر قرض کی طرح باقی رہے گا۔ کیا کبھی ہم نے سوچا کہ ان جیالوں کو بھرپور خراج عقیدت پیش کریں اور ان کی مغفرت کی دُعاء کریں۔ افسوس ہم انھیں بھول گئے!

سید محمد قاسم رضوی

سید محمد قاسم رضوی جو قاسم رضوی کے نام سے مشہور تھے، تعلقہ لاتور ضلع عثمان آباد کے ایک متوسط گھرانے میں ۳۱ر مئی ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے فارغ التحصیل تھے جہاں سے انھوں نے بی۔اے اور ال۔ال۔بی کیا۔ کالج کے زمانہ سے ہی سیماب صفت، بے چین طبیعت، دھکے مکے کے عادی اور جوشیلے دھواں دار تقاریر کے لئے شہرت رکھتے تھے۔ تعلیم ختم کر کے حیدرآباد واپس ہوئے اور پیشہ وکالت اختیار کیا۔ فوجداری کے ایک کامیاب اور شہرت یافتہ ایڈوکیٹ بن گئے۔

مجلس اتحادالمسلمین سے وابستہ ہو کر مسلمانوں کی سیاسی خدمات انجام دیتے رہے۔ تعلق لاتور کے مجلس کے صدر تھے۔ بہادر یار جنگ ان سے خوب واقف تھے۔ بڑے جوشیلے اور جذباتی سمجھتے تھے۔ بہادر یار جنگ کی ایک تقریر سے متاثر ہو کر اپنی ساری جائداد قوم کی نذر کی تو بہادر یار جنگ نے صدیق دکن کے خطاب سے نوازا تھا۔ اسی خطاب سے یاد کئے جاتے تھے۔ جوش و جذبات کی وہ کیفیت تھی کہ ہوش باقی نہیں رہتا تھا۔ جب ڈائس پر آتے اور لوڈ اسپیکر سنبھالتے تو اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پاتے۔ انھیں اپنی اس کمزوری کا احساس بھی تھا لیکن وہ فطرتاً مجبور تھے۔ ان ہی کی تقاریر کے نتیجے میں مسلمانوں میں جوش اور جذباتیت سرائیت کر گئی تھی۔

بڑے مخلص، بڑے بے باک اور تڑپتا دل رکھتے تھے۔ مسلمانوں کی خدمت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ دل کے کسی گوشہ میں ہندو برادران وطن کے لئے نفرت اور بدخواہی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کئی ہندو برادران ان کی قیادت میں رضاکار تھے۔ رضاکاروں کو سخت ہدایت دے رکھی تھی کہ ہندو برادران پر کسی قسم کی زیادتی نہ ہو، ان سے کسی قسم کا چندہ نہ لیا جائے اور ان کی حفاظت کی جائے۔ کہا کرتے تھے کہ ہماری جنگ ہندوستان سے ہے نہ کہ ہندوؤں سے۔

۱۹۴۶ء میں مجلس اتحاد المسلمین کے آخری صدر منتخب ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مجلس کے صف اول کے نہیں بلکہ دوسری صف کے قائد تھے۔ وہ مجلس کی صدارت کے لئے ایسے وقت چنے گئے جب کہ حیدرآباد ایک نازک موڑ پر تھا۔ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ایک جہاں دیدہ، تجربہ کار اور ٹھنڈے دماغ کے سیاست دان اور رہنما کی ضرورت تھی لیکن قاسم رضوی سے یہ ضرورت کا تکمیل پانا مشکل تھا۔ صدر بننے کے بعد زورِ خطابت اور جذباتیت سے سلطنت کے اُفق پر ایسے چھائے کہ ان کے مدمقابل کوئی نہ رہا۔

حکومت ہند کے معاندانہ اور مخالفانہ رویہ کی وجہ سے حیدرآباد بڑی مشکل دور میں تھا۔ سرحد پر شورشوں کی وجہ سے حکومت حیدرآباد کو امن برقرار رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔ فوج، پولیس اور اسلحہ کی کمی نے ان شورشوں سے نبٹنا مشکل بنادیا تھا۔ قاسم رضوی نے اس نازک موقع پر رضاکار تنظیم میں جان پھونکی حفاظت خود اختیاری (Self Defence) کے منصوبہ کو بڑے کامیاب طریقہ سے رائج کرتے ہوئے ایک طرف نیم عسکری تنظیم ''رضاکار'' کو قلیل مدت میں منظّم کیا اور دوسری طرف حکومت حیدرآباد کو شورش پر قابو پانے کے موقف میں لاکر حکومت ہند کے امن وامان میں خلل پیدا کرنے کے منصوبہ کو ناکام کیا۔ یہ قاسم رضوی کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔

قاسم رضوی نے جوشیلے پن اور جذباتیت کے باوجود نازک موقعوں پر بڑی فراست سے کام لیا تاہم قاسم رضوی کی یہ صفت منظر عام پر نہیں آسکی۔ ۷ر جون ۱۹۴۸ء کو سمجھوتہ کے سلسلہ میں لایق علی کی گورنر جنرل سے جب ملاقات ہوئی تو گورنر جنرل نے دباؤ ڈالنے اور اثر انداز ہونے کی حکمت عملی کے تحت کہا تھا کہ یا تو الحاق کرلیں یا استصواب عامہ کے لئے تیار ہوجائیں چوں کہ حیدرآباد کی اکثریت کسی ایسے سمجھوتہ کے لئے راضی نہیں ہے جس کے لئے اصرار کیا جارہا ہے۔ لایق علی نے یہ تدبیری چال چلی تھی کہ ایسا ہے تو وہ استصواب کے لئے تیار ہیں۔ اس پر دہلی میں ہلچل مچی، نہرو اور پٹیل اپنی بات سے مکر گئے اور استصواب عامہ سے انکار کردیا۔ قاسم رضوی نے اپنی فکر میں ایسی تجویز کا بھی اندازہ لگالیا تھا اسی لئے لایق علی کو مشورہ دیا تھا کہ استصواب عامہ کی تجویز پیش کی جاتی ہے تو اسے قبول کرلیں۔ یہ ایک شاطرانہ چال تھی۔ اس طرح ۱۶ر جون ۱۹۴۸ء کو جن اُمور کو قبول نہ کرنے پر (یعنی حیدرآباد کی معاشی، مالی، تجارتی آزادی اور ثالثی کی سہولت) مذاکرات منقطع ہوئے

کہا جاتا ہے کہ قاسم رضوی ان اُمور کے بغیر بھی معاہدہ کرنے راضی ہو گئے تھے۔ بہر حال وہ تصادم کو ترک کرنا چاہتے تھے۔ غالبًا یہ سمجھا کہ جب ذمہ دارانہ حکومت ہی قبول کر لی گئی ہے تو ان اُمور کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض مجلسی رہنماؤں کے دباؤ نے ایسا کرنے نہیں دیا۔ ان نازک لمحات میں جب کہ حکومت ہند کی جانب سے بڑا حملہ متوقع تھا فراست سے کام لیا ضد نہیں کی۔

اچھائیوں کے ساتھ ساتھ کمزوریاں بھی تھیں۔ مردم شناسی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے موقعہ پرست، مفاد پرست اور خوش آمد پرست ان کے اطراف جمع ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے ان میں رفتہ رفتہ آمریت کی خصوصیات بھی آ گئی تھیں۔ ان موقعہ پرست اور خوش آمد پرستوں میں نہ معلوم کتنے حکومت ہند کے ایجنٹ جنرل کے۔ یم۔ منشی کے جاسوس تھے۔ شاستری نامی ایڈیٹر ''رین بو'' جسے کے۔ یم۔ منشی کا جاسوس کہا جاتا تھا قاسم رضوی سے قربت حاصل کر لی تھی اور سایہ کی طرح ساتھ رہتا تھا۔

جوشیلی اور جذباتی تقاریر کے ذریعہ حکومت ہند کو مرعوب کرنا اور مسلمانوں میں جوش و جذبہ پیدا کرنا مقصود تھا۔ ایسی جوشیلی اور جذباتی تقاریر سے کیا فائدہ جو بجائے نتیجہ نکالنے کہ حملہ کے لئے جواز کا سبب بنے اور ہندوستان کے جذبہ انتقام کو تیز کر دے۔ پولیس ایکشن کے بعد جو مصائب اور مظالم سلطنت حیدرآباد کے مسلمانوں پر ڈھائے گئے ان میں دیگر اسباب کے علاوہ ان کی جذباتی تقاریر کو بھی بڑا دخل رہا۔ یہی ایک بڑی شخصی کمزوری تھی جس پر وہ قابو نہیں پا سکتے تھے۔ بات کہنے کی یا نہ کہنے کی تمیز نہ تھی اور جوش میں ہوش کھو دیتے تھے۔ ان کی بعض تقاریر کے حصے درج کئے جاتے ہیں۔
۷/اپریل ۱۹۴۸ء کی شام کو حیدرآبادی وفد کی سمجھوتہ کے ضمن ایک اہم میٹنگ دہلی میں مقرر تھی۔ کے۔ یم۔ منشی اس میٹنگ کو سبوتاج کرنے کے لئے ٹائمز آف انڈیا میں اسی دن ایک شرارت آمیز اور جھوٹی خبر شائع کروادی تھی کہ قاسم رضوی نے ۳۰/مارچ ۱۹۴۸ء کو ہفتہ اسلحہ منا کر ایک بڑے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو جہاد پر اُکسایا اور کہا کہ حملہ ہو تو ہندوستان کے دوسرے حصہ کے مسلمان پانچویں کالم کا کام کریں گے۔ اس خبر کی وجہ سے دہلی کا ماحول خراب ہوا اور میٹنگ ناکام رہی۔ تحقیق کے بعد حکومت ہند کو یہ معلوم ہوا کہ خبر جھوٹی تھی بجائے خاموش ہونے کہ ۱۲/اپریل ۱۹۴۸ء کو ایک بڑی جذباتی تقریر جھاڑ دی اور کہا'' وہ دن دور نہیں جب خلیج بنگال کی لہریں ہمارے

بادشاہ کے قدم چومیں گی اور آصفی پرچم دہلی کے لال قلعہ پر لہرائے گا''۔ اس تقریر پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ تمام قومی اخبارات میں اس تقریر کو نمایاں جگہ ملی اور حکومت ہند کا موڈ ہی بدل گیا۔

گفت وشنید ٹوٹی تو قاسم رضوی نے کہا :

''ہمارا وفد جب بحث ومباحث کر کے مسائل پر غور کرنے کے لئے دستاویز لاتا اور پھر واپس جاتا اس کو نئی شرائط دی جاتی اور ہمارے لئے مفید شرائط کو گھٹایا جاتا .... ہندوستان نے مفاہمت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور ہم نے اس کو جلا کر خاکستر کردیا۔''

ایک اور تقریر :

''آج چھ مہینے سے مسلسل کہا جارہا ہے کہ حیدرآباد پر حملہ ہوگا۔ ایسے کئی چھ سو سال ہو جائیں تو ہند یونین حیدرآباد پر حملہ نہیں کرسکتی۔ اگر وہ حیدرآباد پر حملہ کرے گی تو خود تباہ و برباد ہو جائے گی۔ جس دن حیدرآباد پر ایک قدم بھی بڑھایا گیا تو میں لال قلعہ کا ذمہ دار نہیں ایک آگ ہوگی جو ہر سمت پھیل جائے گی۔'' ۲۷ رجولائی ۱۹۴۸ء

حیدرآباد کے ساتھ چھیڑ چھاڑ خود ہندوستان کو تباہ کردے گی۔ ولبھ بھائی پٹیل ہندوستانی فوج سے جونا گڑھ جیسی چھوٹی ریاست تباہ کر کے خوش ہیں اور کہتے ہیں کہ حیدرآباد کا حشر جوناگڑھ جیسے ہوگا۔ یاد رکھا جائے کہ حیدرآباد کا حشر جونا گڑھ کا ایسا ہوگا تو لال قلعہ کا اس سے بدتر ہوگا۔ ۲۸ رجولائی ۱۹۴۸ء

رضا کاروں کے تعلق سے کہا :

''میں اس تنظیم (رضا کار) کو اسی وقت ختم کردیتا ہوں لیکن جب یہ سیلاب بڑھے گا تو سارے ہندوستان کو بہالے جائے گا۔ اس وقت کہو گے رضوی اس کو روکو جب مجھ سے ناممکن ہو جائے گا، اس وقت یہ رضا کار ایک تنظیم اور ڈسپلن کے پابند ہیں کل چنگیز اور ہلاکو کی فوج ہوگی۔ آج دیانتدار سپاہی ہیں، کل یہ پنڈاری اور ٹھگ ہو جائیں گے۔ پھر ان کو کوئی نہیں روک سکے گا۔ اس وقت میرے پاس پانچ لاکھ ہیں۔ جب یہ ڈسپلن ختم کر کے نکلے گا تو کمیونسٹ ہوگا۔ معاف کرنا یہ گولکنڈہ کے قلع پر قانع نہ ہوگا۔ اس تنظیم کو قیامت تک ختم

نہیں کیا جا سکتا۔ بغیر خدا تعالیٰ کی قوت کے ان کے بڑھتے ہوئے قدم کو کوئی روک نہیں سکتا۔ دنیا کی شر پسند قومیں باقی رہیں یا نہ رہیں رضا کار باقی رہے گا‘‘

ابراہیم جلیس قاسم رضوی کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں :

’’میں نے مجاہد اعظم کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مجاہد اعظم سید قاسم رضوی بے حد جذباتی واقع ہوئے تھے لیکن ایک بات میں نے ان میں خاص طور پر دیکھی ہے، وہ تھا ان کا خلوص...... وہ ایک ایماندار، راست باز اور صاحب کردار ہستی تھے۔ ان کی فطرت میں دھوکہ اور فریب مطلق نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو میری یہ تعریف بری معلوم ہو کیوں کہ آج ہندوستان اور پاکستان اور خود حیدرآباد کے بیشتر لوگ مجاہد اعظم کو برے ناموں سے یاد کرتے ہیں لیکن میں حقیقت کو جھٹلانا نہیں چاہتا...... یہ صحیح ہے کہ ان کی سیاست کی بنیاد غلط تھی جذباتی تھی اور تباہ کن ثابت ہوئی لیکن اس میں سید قاسم رضوی کی ذاتیات کو بہت کم دخل ہے۔ وہ ایک اللہ والا انسان تھا۔ ہمیشہ اللہ کی قوت پر بھروسہ رکھتا تھا اس کو اپنوں نے جتنا بدنام کیا اور جتنا نقصان پہنچایا اور اس کا تذکرہ بے حد تکلیف دہ ہے‘‘۔

(سقوط حیدرآباد صفحہ ۳۳۹)

حکومت ہند کے فوجی قبضہ کے بعد لائق علی اور دوسرے ساتھیوں نے پاکستان چلے جانے پر مجبور کیا لیکن انکار کرتے ہوئے اپنے آپ کو فوجی حکومت کے حوالے کرنا پسند کیا۔ کوئی اور مقدمہ تو خلاف میں نہ تھا۔ حکومت نے بی بی نگر کیس کے جھوٹے مقدمہ میں ملوث کر کے سات سال کی سزا سخت دی۔ پونہ جیل میں سخت ترین سزا کاٹنے کے بعد رہا ہوئے اور حکومت ہند کے کہنے پر پاکستان منتقل ہو گئے اور وہیں ۱۵ ؍جنوری ۱۹۷۰ء کو اپنی آخری سانس لی۔ اللہ پاک اس خلوص بھرے شخص کو اپنی رحمت خاص میں رکھے۔

آخری بات

دکن ہندوستان میں مسلمانوں نے قریب (۷) سو سال شان وشوکت اور جاہ وجلال سے حکومت کی۔ آخری سوا دو سو سال میں آصف جاہی خاندان کی حکمرانی تھی جس نے اس خطہ کو پرامن بنایا۔ مذہبی رواداری اور امن وچین بخشا۔ تہذیب کی آبیاری کی۔ برادرِ وطن میں نہ فرق کیا اور نہ فرق آنے دیا۔ سیاسی، تعلیمی، تجارتی، صنعتی، زرعی، فلاحی، اعلی عدالتی غرض ہر شعبہ میں وہ ترقی ہوئی کہ حیدرآباد ہندوستان کی مثالی اور ترقی یافتہ مملکت بنی۔ ایسی مضبوط ریاست کا صرف پانچ دن کی فوجی کارروائی میں خاتمہ ہونا حیرتناک ہی نہیں عبرتناک بھی ہے۔

انسانی سرگرمیوں کی تاریخ جبر واختیار سے عبارت ہے۔ یہی وہ دھوپ چھاؤں ہے جس میں اقوام اوران کی تہذیب وتمدن کبھی جھلس جاتا ہے اور کبھی سستاتا بھی ہے۔ یہ ایک قانون فطرت ہے۔ تاریخ بعض اوقات حالات کے جبر کا نتیجہ ہوتی ہے اور بعض اوقات تاریخ ساز انسانوں کے عمل کا نتیجہ۔ تاریخ ساز انسان اپنی دانشمندی اور اولوالعزمی سے زوال پذیر قوم کو سہارا دے کر عروج کی طرف گامزن کرتے ہیں اور بعض اوقات ان افراد کے غلطیوں کے نتیجہ میں زوال کا عمل تیز ہوجاتا ہے بلکہ یہ بھی کبھی ہوتا ہے کہ عروج کی طرف گامزن قوم وملک اچانک زوال آمادہ ہوجاتا ہے۔ حیدرآباد کے زوال کی تاریخ میں یہ دونوں عوامل کارفرما ہیں۔ تاریخ کا یہ جبر کہ جس گروہ انسان میں فہم وشعور کا فقدان تھا وہ زوال کی طرف مائل ہوا اور دوسری طرف وہ شخصیتیں جو حالات کے رخ کو متعین کرنے کا مقام رکھتی تھیں انھوں نے حالات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ اگر اندازہ لگایا تو دانشمندی اور فراست کے ساتھ حالات کے دھارے کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ اور جو ہوا کے رخ کو بھانپ چکے تھے انھوں نے مقابلہ کی کوئی تیاری نہیں کی۔

زوال حیدرآباد کے المناک سانحہ کے بارے میں گذشتہ ابواب میں جو روشنی ڈالی گئی ہے اس

کی نوعیت واقعاتی ہے اور اس وقت کے حالات کے پس منظر میں ان کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ اس پر بحث کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی ۔ جو واقعات وقوع پذیر ہوئے ہیں اور جو شخصیتیں فیصلوں کا حصہ بنی ہیں یا پھر ان پر اثر انداز ہوئی ہیں زوال حیدرآباد کی ذمہ دار نظر آتی ہیں ۔ ساتھ ہی ایک طویل عرصہ کی غفلت اور بے شعوری تھی جس نے بھی زوال پیدا کئے ۔

حیدآباد کا زوال عملاً ایک تہذیب اور ایک زبان کا زوال تھا جس کی شروعات ۱۸۰۰ء میں اس وقت ہوئی جب کہ نظامِ دکن نے انگریزوں کو ساحلی علاقے حوالے کرنے کے ساتھ ساتھ عہد معاونت کا ناعاقبت اندیشانہ معاہدہ کیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں نہ صرف نظام کے اقتدار پر ضرب لگی بلکہ حکومت ساحل سمندر سے محروم ہوگئی۔ چاروں طرف برطانوی ہند سے محصور ہونے کی وجہ سے بیرونی دنیا سے آزادانہ ربط کی اہلیت کھو بیٹھی۔ مغربی تہذیب بتدریج حیدرآباد کی منفرد تہذیب پر غیر محسوس اثر چھوڑنے لگی اور ساتھ ہی ساتھ نظامِ دکن کی آزادی اور خودمختاری پر بھی سائے ڈالنے لگی تھی لیکن اس کے ادراک کے لئے دوربین نظر درکار تھی ۔ اس خاموش تبدیلی کے باوجود سلطنت آصفیہ اردو تہذیب اور اردو زبان کی علامت بنی ہوئی تھی ۔ جس سے عام مسلمان ایک جذباتی آسودگی حاصل کرتا تھا۔ انگریزوں نے اپنے قدم تو جما لئے تھے لیکن انھوں نے حکمرانِ دکن کو چلنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ نتیجہ میں شخصی حکمرانی کے زیر اثر یہ تہذیب وزبان ایک ایسے گنگا جمنی معاشرہ کی آبیاری کر رہی تھی جو ہندو مسلم طبقات کے درمیان مفاہمت پر مبنی باہمی خلوص ومحبت کے جذبات سے گوندھا جارہا تھا۔ اس تہذیب کا گہوارہ جاگیردارانہ نظام تھا اس لئے یہ تہذیب طبقہ اشرافیہ کے محلات اور محفلوں سے نکل کر عوام کی سطح پر ایک نقالی کی صورت میں جلوہ گر ہوگئی لیکن وقت کے گذرنے کے ساتھ جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں وہ عام شعور کی گرفت سے باہر تھیں۔

انگریزوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اس فراست سے کام نہیں لیا گیا جس کو آج ڈپلومیسی کہا جاتا ہے۔ آج کی دنیا میں معاملت ٹھوک بجا کر مفاد کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ نظام اور ان کے بعد کے آصف جاہی بادشاہوں نے انگریزوں کے ساتھ جو شریفانہ اور فراخدلانہ سلوک کیا اس کا صلہ انگریزوں نے جس منفی انداز میں دیا تھا وہ نظام ہفتم کے لئے سبق آموز تھا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے نازک لمحات کے دوران انگریز نظام ہفتم سے ویسے ہی فراخدلانہ مدد وتعاون کے منتظر تھے۔ یہی وہ

موقعہ تھا جب کہ مطالبات منوالئے جاتے، حقوق اور چھینے ہوئے علاقے واپس لئے جاتے۔لیکن یہ حکمت علمی اختیار نہیں کی گئی۔ وفا کا دامن ہی پکڑے رہے جب کہ وہ وفا کا دامن جھٹک کر چلے گئے۔

اوائل بیسویں صدی سے لے کر ۱۹۴۳ء تک کا زمانہ حیدرآباد کی سیاسی اور سماجی زندگی میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔تحریکات اور تبدیلی کا زمانہ تھا۔تحریک آزادی کا جو طوفان اٹھ رہا تھا اس کی طاقت اور اثرات کا صحیح اور مدبرانہ جائزہ لینے میں حیدرآباد دانستہ یا نادانستہ طور پر ناکام رہا۔عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے نتیجہ میں حیدرآباد میں تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کو فروغ حاصل ہوا۔مواصلاتی نظام میں پیش رفت ہوئی صحافت نے فروغ پایا۔ایجی ٹیشن چلایا گیا۔آریہ سماج، ہندو اسکولس، لائبریریز جیسے کئی ایک ادارے وجود میں آ گئے۔سماجی اصلاحات اور ذمہ دارانہ حکومت کے لئے متعدد کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ یہ سرگرمیاں ایک معنی میں حیدرآباد میں شعور کی بیداری کی عکاسی کرتی تھیں۔جس کے جواب میں روشن خیالی درکار تھی لیکن ان تحریکات کو دبانے کے لئے سخت اقدامات کئے گئے۔یہ تدبر اور تدبیر کے فقدان کا نتیجہ تھا۔اس کا ردعمل یہ ہوا کہ ہندوستان میں تحریک آزادی زور پکڑنے کے ساتھ ہی ساتھ حیدرآباد میں شخصی حکمرانی کے خلاف جذبات فروغ پانے لگے۔عثمانیہ یونیورسٹی سے ایک ایسا متوسط تعلیم یافتہ طبقہ باہر آیا تھا جو دائیں اور بائیں بازو نظریات کا حامی تھا۔اس نے اپنا ایک حلقہ اثر پیدا کر لیا تھا۔ یہ تو ایک حقیقت رہی ہے کہ جب تحریکات نظریاتی اساس پر وجود میں آتی ہیں تو دوسرے خطوں میں سرگرم رہنے والے ہم خیال گروپ سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے تاکہ اپنے علاقہ میں تحریک کو مستحکم بنانے تعاون حاصل کیا جائے، چنانچہ حیدرآباد میں ایسا ہی ہوا۔دائیں اور بائیں بازو کی جو تحریکیں چل رہی تھیں اس کے قائدین اور کارکنوں نے ہندوستان کی اپنی ہم خیال تنظیموں سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔جس کے نتیجہ میں حیدرآباد میں عوامی بے چینی اپنی خاموشی توڑنے لگی تھی۔

تحریکات کے اس نازک دور میں دوسرا فریق جو اکثریت میں تھا اس کے جذبات، احساسات اور مفاد کا پاس ولحاظ کرنا اور مفاہمت کا راستہ اختیار کرنا وقت کی اہم ضرورت تھی۔تحریکات کے اثرات سے حیدرآباد کی فضا کا متاثر ہونا لازمی تھا اور فضا کا کو مکدر ہوتے دینا حیدرآباد کے حق اور مفاد کے خلاف تھا۔اسی لئے بہادر یار جنگ نے دیگر ہوشمند اور ذی عقل رہنماؤں کے تعاون سے دوسرے فریق کے سلجھے ہوئے رہنماؤں سے مفاہمانہ گفتگو کا آغاز کیا۔حیدرآباد کی بھائی چارہ اور

خلوص بھری تہذیب کے ماحول کو باقی رکھنے کے لئے دونوں نے مل کر ایک مفاہمانہ فارمولہ تیار کرلیا تھا جو دونوں فریقین کے لئے قابل قبول تھا۔ لیکن حکومت کے ایوان نے اسے سبوتاج کیا جو ایک غیر دانشمندانہ اقدام تھا۔ یہ فارمولہ قبول کرلیا جاتا اور روبہ عمل لایا جاتا اور بہادر یار جنگ جیسے دونوں فرقوں کے مقبول رہنما باقی رہتے تو شاید حیدرآباد کو یہ برے دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے۔

ہندوستان میں آزادی کی تحریک جیسے جیسے اپنے منزل کے قریب پہنچ رہی تھی حیدرآباد میں اس تحریک کے حامیوں میں ایک نیا اعتماد بھی پیدا ہو رہا تھا اور جب ملک کے بٹوارہ کی باتیں کی جانے لگیں تو عوامی سطح پر شکوک وشبہات نے اپنا گھر بنالیا۔ آخر کار جب تقسیم ملک کا وقت آیا تو حیدرآباد کا گنگا جمنی معاشرہ میں تہذیبی ولسانی اور کسی حد تک مذہبی اساس پر اپنی اپنی شناخت منوانے کے جذبات ابھرنے لگے۔ نظام حیدرآباد کی پریشان حال حکمرانی تھی اور اس کے تحفظ کے لئے صرف مسلمان تھے اور ان کی جذباتی قیادت دور اندیشی سے عاری تھی جس کے پاس مصلحت کا نام بزدلی جذبات کا نام جرأت اور بہادری تھا۔ ان حقیقتوں کے مدنظر حکومت سے کوئی موزوں سمجھوتہ کی حکمت عملی ہی عقلی دلیل تھی رزم آرائی یا مقابلہ غیر موزوں تھا۔ ابتداً جب حکومتِ ہند پریشان تھی بجائے معاہدہ انتظامِ جاریہ کے ایک مستقل معاہدہ حاصل کرنے کے مواقع تھے جو ضائع کئے گئے۔ معاہدہ انتظامِ جاریہ کے وقت قاسم رضوی کی غیر ذمہ دارانہ حرکت نے (چاہے وہ نظام کے اشارہ سے ہی کیوں نہ کی گئی ہو) حکومت ہند کو مشکوک کردیا اور بعد میں قاسم رضوی کی جذباتی اور غیر ہوش مندانہ تقاریر سے مزید نقصان پہنچا۔ کمزور موقف کی وجہ سے مذاکرات اور سمجھوتہ پر اپنی ساری طاقت صرف کی اور بڑی مہارت کا ثبوت دیا۔ لیکن حکومت ہند کے ارادے صاف نہ تھے وہ حیدرآباد کو مذاکرات میں ہی الجھائے رکھنا چاہتی تھی اور کوئی ایسا معاہدہ نہیں چاہتی تھی جس سے حیدرآباد کی آزادی باقی رہے۔ حیدرآباد اس سے واقف ہوتے ہوئے بھی کہ آخری مرحلہ رزم آرائی ہے جتنی توجہ مذاکرات پر دی اتنی توجہ دفاع پر نہ دی اور دفاع کی ساری ذمہ داری ایک نااہل اور سازشی کمانڈر پر چھوڑ کر نظام اور خاص کر لائق علی، ان کی کابینہ اور قاسم رضوی اپنی ذمہ داری سے پہلوتہی کی۔

وطن فروش اور گھر کے بھیدیوں سے مسلم مملکتوں کو ہمیشہ بڑا نقصان پہنچا۔ قرطبہ اور غرناطہ کی مملکتوں کو انہی مفاد پرستوں نے بیچ ڈالا تھا۔ نظام اور ٹیپو کا اتحاد انہی کی وجہ سے نہ ہوسکا تھا۔ نظام

سابع کا دربار انہی مفاد پرست اور وطن فروش بھیدیوں سے بھرا پڑا تھا اور انھیں نظام کی سرپرستی حاصل تھی۔ حکومت اور فوج کے سارے راز انہی کی بدولت حکومت ہند کو باآسانی مہیا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے حکومت ہند جان گئی تھی کہ حیدرآباد کی فوجی طاقت نہایت کمزور ہے اور وہ معاہدہ کر کے باقی رہنا چاہتی ہے اس لئے راستہ آسان ہو گیا تھا۔ حکومت ہند نے ان سازشوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بغیر کسی رزم آرائی یا مقابلہ کے باآسانی حیدرآباد پر قبضہ کر لیا۔ حضور نظام کے اس سجے سجائے دربار کو ان کے مفادات تو مل گئے لیکن مملکت باقی نہ رہی۔ اس عبرتناک نتیجہ پر یقین ہے کہ وہ بھی اور ان کی اولاد بھی آج کف افسوس مل رہی ہوگی۔

اب ان حالات اور ناعاقبت اندیشانہ اقدامات کی وجہ سے سلطنت آصفیہ تاریخی جبر کا شکار ہو گئی تھی۔ اپنی غلطیوں کی وجہ سے اختیار اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور یہ مخالف طاقتوں کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ چوں کہ وقت کی نبض پر سے انگلیاں اٹھ چکی تھیں اس لئے یہ اندازہ نہیں کیا گیا کہ کون کہاں ٹھہرا ہے؟ یہی سمجھا جاتا رہا کہ سلطنت آصفیہ اب ان فیصلوں کا اختیار رکھتی ہے۔ یہ عصری آگہی کا فقدان تھا۔ جس کا خمیازہ زوال کی صورت میں بھگتنا پڑا اور اس کے منطقی نتیجہ میں وہ تہذیب جو دلی سے نکل کر دکن میں ایک نئی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئی تھی تاریخ کا ایک حصہ بن گئی۔

ضمیمہ (۱)

مجلس مقننّہ کی نشستوں کی جملہ تعداد (۸۵)

مجلس مقننّہ کی ہیئت ترکیبی حسب ذیل تھی :

۱-	معزز اراکین بابِ حکومت	تعداد	۷
۲-	اراکین صرف خاص مبارک		۳
۳-	اراکین منتخب شدہ		۴۲
۴-	اراکین نامزد شدہ		۲۸
۵-	اراکین علاقہ جات		۵
		جملہ	۸۵

۱ و ۲- معزز اراکین باب حکومت اور صرفخاص کی تعداد (۷+۳=۱۰) ہے جو نامزد کردہ ہیں

۳- منتخب شدہ اراکین کی تفصیل :

(۱)	والیان سمستان و جاگیرداران	تعداد	۴
(۲)	معاشداران		۲
(۳)	زراعت پیشہ :		
	(ا) پٹہ داران ۸		
	(ب) کاشتکاران ۸		۱۶
(۴)	مزدوری پیشہ مفادات		۲
(۵)	صنعت و حرفت		۲
(۶)	تجارت		۲
(۷)	بینکاری		۲

(۸) پیشہ وکالت	۲
(۹) پیشہ طبابت	۲
(۱۰) طیلسانین	۲
(۱۱) مجالس اضلاع	۲
(۱۲) اضلاع کی بلدیات وقصباتی کمیٹیاں	۲
(۱۳) بلدیہ حیدرآباد	۲
جملہ	۴۲

۴- نامزدشدہ اراکین کی تفصیل :

(۱) اراکین سرکاری	۱۴
(۲) اراکین غیر سرکاری	۱۴
جملہ	۲۸

(۱) اراکین سرکاری کے متعلق کوئی خاص صراحت موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ حق حکومت نے محفوظ رکھا ہے کہ وہ سرکاری اراکین میں ردوبدل کرسکتی ہے تاکہ جب کوئی خاص معاملہ زیر بحث آئے تو عہدہ داران متعلقہ نامزد کئے جاسکیں۔ نیز ان ہی چودہ میں سے ایک رکن جس کا سرکاری ہونا لازمی نہیں ہے جامعہ کی نمائندگی کے لئے مجلس رفقاء جامعہ سے ہمیشہ نامزد کیا جائے گا۔

(۲) نامزدشدہ غیر سرکاری اراکین کی تفصیل یہ ہے :

(۱) ہندوارکان ہریجن	۵
(۲) لنگایت	۱
(۳) عیسائی (کم ازکم) :	
(ا) اینگلوانڈین ۱	
(ب) کرسچین ۱	
	۲

(۴) پارسی	۱
(۵) خواتین (کم از کم)	۲
جملہ	۱۱

نوٹ : بقیہ تین نشستوں کا کوئی تعین نہیں کیا گیا۔ غالباً وہ لوگ ان نشستوں کو پر کریں گے جن کا تعلق ایسے مفادات سے ہے جن کو کسی اور طرح نمائندگی حاصل نہ ہوتی ہو "مثلاً"

(۱) ارباب صحافت

(۲) گتہ داران

(۳) دونوں بڑے فرقوں کے بعض مخصوص مفادات

۵- اراکین علاقہ جات کی تفصیل :

(۱) ہر سہ پائیگاہ	۳
(۲) علاقہ پیشکاری	۱
(۳) علاقہ سالار جنگ	۱
جملہ	۵

نوٹ : صاحبان علاقہ جات اپنے علاقوں کی نمائندگی بذات خود کر سکتے ہیں یا کسی اپنے ہم قوم کو جوان کا صلبی وارث ہو، بھیج سکتے ہیں۔ صاحب علاقہ کے نابالغ یا فاتر العقل ہونے کی صورت میں سرکار عالی خود کسی نمائندہ کو نامزد کرے گی۔

ضمیمہ (۲)

پانچ روزہ جنگ

۱۳ار ستمبر ۱۹۴۸ء کی ابتدائی ساعتوں میں میرے بستر کے قریب رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی، میں حیدر آبادی فوج کے کمانڈر سے مخاطب تھا۔ فون اُٹھانے سے پہلے ہی میں سمجھ چکا تھا کہ یہ فون ہندوستانی حملے سے متعلق ہوگا۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ بیدر، ورنگل اور اورنگ آباد کے ہوائی اڈوں پر زبردست بمباری ہو رہی تھی۔ کمانڈر مجھ سے ضروری ہدایات لے چکا تھا۔ اس دوران اس وقت کے پولیس چیف کے علاوہ فوج کے ہیڈ کوارٹرس کے دوسرے آفیسرس کے فون آچکے تھے جن میں ہندوستانی فوج کے حملوں اور مزید ٹھکانوں پر ہوائی حملوں کی اطلاع تھی۔ یہ سب کچھ میرے ہمیشہ کے جاگنے کے وقت سے آدھا گھنٹہ قبل ہوا۔ فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دن بھر کی مصروفیت کے لئے تیار تھا۔

فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں حاکم وقت میر عثمان علی خاں نظام سے ملاقات سے قبل فوجی ہیڈ کوارٹرس میں داخل ہوا جہاں فوجی کمانڈوس ایک نقشہ پر چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں لگا کر اس بات کا معائنہ کر رہے تھے کہ کن کن مقامات سے ہندوستانی فوج داخل ہو چکی ہے اور دفاعی مورچہ کہاں کہاں واقع ہیں۔ اس وقت یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ہندوستانی فوج کا سب سے اہم دباؤ مغرب یعنی شولا پور حیدر آباد شاہراہ سے ہو رہا ہے اور مشرق میں مچھلی پٹم حیدر آباد شاہراہ سے۔ دونوں طرف کے حملوں میں ہندوستانی فوج کی قیادت شرمن ٹینک کی ٹکڑیاں بڑی تعداد میں کر رہی تھیں۔ اس کے علاوہ مغربی محاذ کے تین مرکزوں سے ہلکے اسٹورٹ ٹینک اور بکتر بند گاڑیوں کے قافلے حملوں میں حصہ لے رہے تھے۔ اسی محاذ کے مزید ۵ مراکز سے مسلح افواج موٹروں کے ذریعہ آگے بڑھ رہے تھے۔ شمال میں واردھا ندی کو ٹرین سے پار کیا جا رہا تھا اس کے علاوہ بہت سارے علاقوں سے ہندوستانی فوج کا داخلہ جاری تھا۔ جنوب مغرب میں سرحدی دریا تنگبھدرا کو ریلوے پل کے

ذریعے پار کیا جارہا تھا۔ غرض نقشہ پوری طرح جھنڈیوں سے گھرا ہوا تھا جو اس بات کی نشاندہی کررہا تھا کہ مختلف مقامات سے فوج داخل ہو چکی ہے۔

سب سے پہلا حملہ شولا پور کے راستے سے ہوا تھا جس میں ٹینک کا ایک بریگیڈ اور اس کے ساتھ موٹروں کے ذریعے ایک ڈویژن سپاہی حملے میں حصہ لے رہے تھے۔ اس کی تیاری کئی دنوں سے چل رہی تھی، پورا علاقہ عوام کے لئے ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا یا تو سیدھے شولا پور حیدرآباد شاہراہ پر واقع نلدرگ، ہمنا آباد، ظہیرآباد سے گذرتے ہوئے فوجیں حیدرآباد پہنچ سکیں یا پھر نلدرگ کو نظرانداز کر کے شولا پور عثمان آباد، لاتور روڈ سے ہوتے ہوئے بیدر اور پھر ظہیرآباد سے ہوتے ہوئے حیدرآباد جاسکے یا پھر بیدر سے کسی متبادل راستے سے سیدھے حیدرآباد پہنچا جاسکے۔ چوں کہ دکن کے پلاٹو میں جگہ جگہ پہاڑیاں ہیں اور کہیں کہیں گہرے نالے ہیں اس لئے ہندوستانی فوجوں کے ٹینکوں کو آگے بڑھنے کے لئے ان شاہراہوں کو چھوڑ کر دوسرے راستوں کو اختیار کرنا ممکن نہیں تھا۔ پہلے ہی سے اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ حملہ شولا پور حیدرآباد سڑک کے راستے ہونے والا ہے اس لئے دفاع کی پہلی لائن نلدرگ پر منظم کی گئی تھی۔ نلدرگ پر ایک بٹالین فوج اور ۲۵ پونڈ کے گولے پھینکنے والی ۴ توپیں نصب کی گئیں تھیں۔ نلدرگ کے قریب ندی ایک تنگ گھاٹی سے گذرتی ہے جس کے دونوں جانب ۳ سے ۴ سو فٹ اُونچی پہاڑیاں ہیں، سڑک پیچ وخم کھاتی ہوئی ایک پل پر سے گذرتی ہے جو اس کھائی کی گہرائی میں بنایا گیا ہے۔ یہ پلان بنایا گیا تھا کہ کسی بھی حملے کے وقت اس پل کو اُڑا دیا جائے تاکہ دائیں بازو کے کنارے طویل عرصے تک مورچہ کا دفاع کیا جاسکے۔ پل اُڑا دینے کے بعد جغرافیائی نقطہ نظر سے اس جگہ کو پار کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس مورچہ کو تیار کرنے کے بعد میلوں دور کے علاقے کا کوئی دفاعی نظام نہیں تھا۔ اسی طرف ضلع کے صدر مقام عثمان آباد کو بھی بغیر کسی دفاعی نظام کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس علاقے میں دوسرا دفاعی مورچہ لاتور کے قریب مانجرا ندی پر قائم کیا گیا تھا تاکہ بیدر کی طرف جو دفاعی اور فوجی نقطہ نظر سے بہت اہم تھا، کوچ نہ کیا جاسکے۔ نلدرگ سے ۴۰ میل آگے دالم نامی مقام پر بھی دفاعی نظام قائم کیا گیا۔ دالم اگرچہ کہ جغرافیائی نقطہ نظر سے دفاع کے لئے بہت موزوں تو نہیں تھا مگر پھر بھی بڑھتی ہوئی فوج کی رفتار میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لئے مناسب جگہ تھی۔ دالم سے آگے فوجی نقطہ نظر سے ہمنا آباد بھی اتنا ہی اہم تھا جتنا نلدرگ

یہاں تقریباً ۱۰ میل تک سڑک پہاڑی علاقے سے گذرتی ہے اور اس سڑک پر ایسے کئی مقامات ہیں جہاں سے حملہ آور فوج کے بڑھنے کی رفتار کو کم کیا جا سکتا تھا۔ ہمنا آباد کے بعد صرف ایک مقام قدرتی طور پر دفاعی نقطہ نظر سے اہم تھا اور پھر لنگم پلی کی پہاڑی کے سوائے دار الخلافہ حیدرآباد تک راستہ بالکل صاف تھا۔

۱۳ ر ستمبر کو ہندوستانی فوجوں کا ٹینک بریگیڈ شولا پور کے راستے نلدرگ کی طرف بڑھنے سے پہلے ٹینک کا ایک کالم نلدرگ سے کچھ فاصلہ پہلے شمال کی طرف مڑ کر عثمان آباد کی طرف بڑھ گیا اور باقی کا بڑا دستہ نلدرگ کی طرف بڑھ گیا۔ نلدرگ کے دفاعی مورچے پر بڑھنے والے فوجی دستوں کی مدد کے لئے نلدرگ کے مورچے پر زبردست ہوائی حملے کئے گئے۔ ٹینک کا دستہ نلدرگ کے قریب آنے پر توپوں سے گولے برسائے گئے اور رپورٹ کے مطابق قریب ۸ شرمن ٹینک تباہ کئے گئے اور دستہ تباہ ہو کر عالم پریشانی میں اپنے مقام کی طرف لوٹا۔ ہندوستانی فوج کے اس کالم نے جو شمال کی طرف کوچ کیا بغیر کسی مزاحمت کے بمباری کرتے ہوئے عثمان آباد ضلع میں داخل ہوا اور پھر وہاں سے ایڑسی سے ہوتا ہوا مشرق کی طرف مڑ کر لاتور کی طرف بڑھ گیا۔ اگرچہ کہ کوئی مزاحمت نہیں ہوئی مگر اس کی رفتار بہت سست تھی۔

ریاست کے مشرق کی طرف سے ''شرمن'' ٹینک کا ایک کالم سوریا پیٹ سے ہوتا ہوا حیدرآباد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسی دن سب سے پریشان کن خبر ریاست کی شمال سے آئی یہ خبر راجورہ سے آئی تھی جہاں نظام اسٹیٹ کو ہندوستانی علاقے سے جوڑنے والا وار دھا ندی پر ایک ریلوے پل تھا۔ اس محاذ کے دفاع کے لئے صرف ایک ریلوے انجینیر کو معہ چند سپاہیوں اور پولیس کے متعین کیا گیا تھا جس کے ذمہ کسی بھی حملے کے وقت پل کو اُڑا دینا مقرر تھا۔ معلوم ہوا کہ جس وقت ہندوستانی فوج رات ۱۲ بجے پل پار کر رہی تھی اس وقت وہ انجینیر ریلوے پل سے تقریباً ۶ میل دوری پر آرام سے سو رہا تھا اور پل کو فیوز کے ذریعہ نہیں اُڑایا گیا ہندوستانی فوج پل پر سے دندناتے گذر گئی۔ بعد میں اگرچہ کہ حیدرآبادی فوج چھوٹے چھوٹے پلوں کو تباہ کرنے میں کامیاب ہوئی مگر اس سے ہندوستانی فوج کے آگے بڑھنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ دوسرے محاذوں سے اطلاعات نامکمل تھیں اور صحیح اندازے لگانا مشکل تھا، مجھے ہڈگاؤں ناندیڑ اور ہنگولی ناندیڑ روڈ کے بارے میں زیادہ تشویش

تھی۔ جالنہ سے متضاد خبریں مل رہی تھیں جب کہ اورنگ آباد سے کسی قسم کی خبر نہیں مل رہی تھی۔ مغرب میں بیڑ بھی بغیر کسی دفاع کے چھوڑ دیا گیا تھا یہاں کوئی قابل ذکر فوجی کارروائی نہیں ہو رہی تھی لیکن جنوب مغرب میں منیرآباد کے آس پاس، ہبلی منیرآباد ریلوے لائن سے متصلہ کافی فوجی کارروائیوں کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ اس علاقے کے دفاع کی ذمہ داری محکمہ آب پاشی کے انجینیرز پر ڈالی گئی تھی جنھوں نے اس کو خوب نبھایا۔ ان کا دفاع شاندار تھا اور پوری ریلوے لائن جو ریاست حیدرآباد کے علاقے میں سے گذرتی تھی ان کی تحویل میں تھی۔ اطلاع ملی کہ یہ والنٹیرز ہندوستانی علاقے میں گھس کر ہوسپیٹ اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے ہی والے تھے۔

مختلف محاذوں سے مختلف قسم کی رپورٹ مل رہی تھیں مگر سب سے برا حشر، ورنگل، بیدر، رائچور، عادل آباد اور اورنگ آباد کے ہوائی اڈوں کا ہوا۔ یہاں ہندوستانی فضائیہ کے طیاروں نے شدید بمباری کی یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پوری ریاست میں صرف حکیم پیٹ جو حیدرآباد شہر سے ۱۵ میل دور واقع ہے اس ہوائی اڈے پر طیارہ شکن توپیں نصب تھیں اس کے علاوہ ریاست میں کسی اور ہوائی اڈے پر اس قسم کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لئے حکیم پیٹ ہوائی اڈے پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔

فوجی ہیڈکوارٹر میں کچھ وقت گذارنے کے بعد میں نظام سے ملاقات کے لئے گیا۔ صبح سے ہی بذریعہ فون نظام کو تازہ ترین صورتحال سے باخبر رکھا جا رہا تھا۔ ملاقات کے وقت تمہیدی جملوں سے بچ کر سیدھے جنگ کی صورتحال اور آئندہ کے پلان کے بارے میں گفتگو کی گئی۔ فوجی صورتحال سے نظام کو واقف کرانے فوج کے کمانڈر کو روانہ کیا گیا تھا نظام نے تفصیلات میں بہت دلچسپی دکھائی لیکن میں نے ان سے درخواست کی کہ فوج کے کمانڈر کا زیادہ وقت نہ لیا جائے انھیں ہیڈکوارٹرس میں ہی رہنے دیا جائے۔ نظام راضی ہو گئے اور میں خود بھی اجازت لے کر وہاں سے نکل گیا۔

فوجی عہدیداروں سے دوران گفتگو یہ پتہ چلا کہ وائرلیس پر پیغامات بھیجنے کے لئے جو کوڈ استعمال ہوتا ہے وہ اتنا قدیم تھا کہ اس بات کا پورا امکان تھا کہ ہندوستانی فوج اس کوڈ سے واقف ہونے کی وجہ سے وائرلیس کے پورے پیغامات سن چکی ہے۔ یہ میرے لئے ایک صدمہ تھا۔ وقت جیسے جیسے گذرتا گیا ویسے ویسے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ فوجی کمانڈر کے پاس کوئی پلاننگ نہیں تھی اگرچہ کہ دوسرے تمام آفیسرس انتہائی جوشیلے اور پرعزم تھے۔ کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں

بدنظمی نہ ہو میڈیکل سروس، راشن، حمل ونقل، اسلحہ کی تقسیم وغیرہ ہر شعبہ میں انتظامات نامکمل اور فوجی کمانڈر مجھ سے اور سیویلین انتظامیہ سے رہبری کا خواہاں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب مجھے فوجی ہیڈکوارٹرس میں رہنا چاہیئے۔ غلطیوں کے لئے کسی کو الزام دینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بنیادی غلطی فوجی کمانڈر کی اہلیت پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرنا تھا۔ جب یہ بات نظام کے علم میں لائی گئی تو وہ حیرت زدہ ہو گئے۔ جیسے جیسے وائرلیس سے پیغامات ملنے لگے ویسے ویسے ضروری ہدایات دی گئیں۔ اس بات کا احساس تھا کہ تمام پیغامات ہندوستانی فوج کو بھی پہنچ رہے ہیں مگر اس وقت کوئی متبادل انتظام کرنا بے معنی تھا۔ فوجی کمانڈر خود اعتمادی کھو چکا تھا وہ پریشان تھا میں نے اس کی ہمت افزائی کی کہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہے۔ دوبارہ میں نے نظام سے ملاقات کی اور دوسرے اہم اُمور سے متعلق فیصلوں کے لئے اور دوپہر کے کھانے کے لئے آفس آیا۔ اس بحران کے دور میں میرے دست راست ایک تجربہ کار سیویلین محبوب علی خان تھے ان کے ذریعہ کراچی میں مقیم حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل مشتاق احمد کو ضروری ہدایات دی گئیں تا کہ وہ ہدایات نیویارک میں اقوام متحدہ کے حیدرآباد کے نمائندے کو روانہ کی جائیں۔ ان دنوں حکومت ہند کے نمائندے مقیم حیدرآباد جناب کے۔ ایم۔ منشی کی حفاظت کے نقطہ نظر سے بڑے اہتمام کے ساتھ انھیں لیک ویو گیسٹ ہاؤس میں منتقل کرنا پڑا۔ اس خبر کو حیدرآباد ریڈیو سے بھی نشر کرنا پڑتا تھا۔ حیدرآباد کے نمائندے مقیم دہلی کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جائے جیسے یہاں جناب منشی کے ساتھ کیا جارہا ہے۔

چند گھنٹوں کے بعد میں جب فوجی ہیڈکوارٹرس پہنچا تو اطلاع ملی کہ نلدرگ کا دفاعی مورچہ زبردست بمباری سے تباہ ہو گیا ہے، اس کے بچے کچھے سپاہیوں کو دالم واپس ہونے کی ہدایات دی گئیں۔ نلدرگ کے پل کے بارے میں فوجی کمانڈر سے دریافت کیا گیا تو کہا کہ وہ صحیح وسالم ہے اسے اُڑایا نہیں گیا جب کہ اس پل میں پوری طرح سے ڈائنامیٹ لگا دیئے گئے تھے اور صرف فیوز کے ذریعہ اُڑا دینا تھا۔ یہ پوچھے جانے پر کہ امدادی فوج نلدرگ کو کیوں نہیں روانہ کی گئی؟ جواب ملا کہ بمباری کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا۔ میرا خود کا اعتماد متزلزل ہو گیا۔ میں نے سختی سے حکم دیا کہ آئندہ سے کوئی بھی بڑی فوجی حکمت عملی بغیر میرے مشورہ سے کی جائے۔

شام ۴ بجے ہندوستانی فوج اطمینان سے نلدرگ کا پل پار کر رہی تھی۔ فوجی کمانڈر کے

ذریعے یہ بتلایا گیا کہ دالم تک پہنچنے کے لئے دوسرا پورا دن لگ جائے گا۔ پھر یہ مشورہ دیا گیا کہ دالم سے رہی سہی فوج ہٹا کر ہمنا آباد کی پہاڑی سڑک پر مورچہ بندی کی جائے کیوں کہ اس علاقہ میں دفاع اچھی طرح کیا جاسکتا ہے۔

حیدرآباد فوج کے کمانڈر نے فوجی ہیڈکوارٹرس میں ہی پلنگ لگا رکھا تھا اور انھوں نے وہیں مستقل طور پر رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب کہ جنرل اسٹاف کے دوسرے اراکین باری باری اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اسی دن شام نظام کے ساتھ تقریباً ایک گھنٹہ گذارنے کے بعد میں خود فوجی ہیڈکوارٹرس میں رات دیر گئے تک ٹھہرا رہا ہوائی پٹیوں پر بمباری کے علاوہ دوسرے کوئی خاص اہمیت کی اطلاعات نہیں مل رہی تھیں۔ بیدر کا ہوائی اڈہ ہمیشہ سے ہتھیار اور گولہ بارود کے منتقل کے لئے استعمال ہوتا رہا تھا ایسا کرنے کے لئے ہندوستانی فضائیہ کے طیارے بیدر پر مسلسل اُڑان بھر رہے تھے اس لئے بیدر آنے والے طیاروں کو ورنگل کے ہوائی اڈے پر اُترنے کی ہدایت دی جارہی تھی۔ جب ورنگل کے ہوائی اڈہ پر فضائیہ اُڑانے بھرنے لگا تو حکیم پیٹ ایرپورٹ کو استعمال کرنے کی ہدایت دی گئی۔

نلدرگ کے قریب ندی کے پل اور شمال میں واردھا ندی کے پل کو ڈائنا میٹ سے نہ اُڑا دینے کی وجہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ فوج کسی کام کے لائق نہیں۔ اس لئے میں نے یہ طے کرلیا کہ یہ کام محکمہ تعمیرات کے انجینیئرس کو دیا جائے کیوں کہ وہ خود اس قسم کے پلوں کی تعمیر کی تفصیلات سے واقف ہیں۔ اس کام کے لئے مجھے متعدد قسم کے اشخاص کا گروپ مل گیا۔

۱۴ ستمبر کی صبح کو کسی اہم فوجی اقدام کی اطلاع نہیں ملی سوائے اس کے کہ جالنہ پر دوبارہ قبضہ حاصل کرلیا گیا ہے۔ فوجی کمانڈر نے مجھ سے کہا کہ دوسرے دن کوئی اہم فوجی پیش قدمی نہیں ہوگی۔ کیوں کہ اب اس فوج کے اگلے دستوں کو رسد کی سپلائی اور آرام کی ضرورت ہے۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا مختلف خبریں موصول ہونے لگیں۔ دوپہر کے وقت دہلی ریڈیو نے اطلاع دی کہ ہندوستانی فوج کو سخت ترین مزاحمت کا سامنا ہے۔ درحقیقت یہ اعلان محض بے وقوف بنانے کے لئے کیا گیا تھا جب کہ ہندوستانی فوجوں کو کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا تقریباً تمام محاذوں پر گذشتہ دن کا تجربہ رہا کہ جب ہندوستانی فوج کے مقابل مزاحمت ہوئی تو وہ کھڑے نہ رہ سکی۔ چند رائفلس کے

شاٹس کافی تھے انھیں بھگانے کے لئے۔ جب تک انھیں ٹینکس کی مدد حاصل نہ رہی وہ آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ محکمہ آب پاشی کے چند ورکرس ایک بٹالین فوج لے کر منیر آباد کے قریب دو بٹالین ہندوستانی فوج کو تباہ کئے اور تنگبھدرا دریا کو پار کر کے مدراس کے خطے میں داخل ہو گئے۔

جیسا کہ اس سے قبل لکھا جا چکا ہے کہ ایک دن پہلے ہندوستانی فوج کا جو دستہ شولا پور سے نکل کر شمال کی طرف کوچ کر گیا تھا اس نے آسانی سے عثمان آباد پر قبضہ کیا تھا۔ اگرچہ کہ ہندوستانی افواج کو یہ معلوم تھا کہ اس شہر کا اپنا کوئی دفاعی نظام نہیں پھر بھی زبردست گولہ باری کی گئی۔ شہر میں عام شہریوں کا قتل عام ہوا اور خاص طور سے مسلمانوں کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ بہت سارے شہری بھاگنے میں کامیاب ہوئے اور کھیتوں کی فصلوں میں پناہ لے کر اپنی جانیں بچائیں۔ یہاں سے یہ فوجی کالم ایڑسی سے اور لاتور سے ہوتے ہوئے بیدر کی طرف گیا۔ نلدرگ کے پل کو آسانی سے پار کرنے کے بعد ہندوستانی فوج پھر لاتور کی طرف سے کسی بڑے حملے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس لئے میں نے کمانڈر کو مشورہ دیا کہ اس علاقے کی تمام توپیں میدان جنگ سے نکال کر بیدر میں جمع کی جائیں یا پھر ظہیر آباد حیدرآباد سڑک پر واقع پہاڑیوں میں مورچہ بندی کی جائے۔ مگر کمانڈر نے اس مشورے کو ماننے سے انکار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر بیدر فتح ہو جائے تو وہاں سے دارالخلافہ حیدرآباد کے لئے کئی متبادل راستے ہیں اور یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ہندوستانی فوجیں کس راستے کا انتخاب کریں گی۔

۱۴ر ستمبر کی شام میں ہندوستانی فوج کا دستہ شمال میں کلیانی کی طرف بڑھ رہا تھا ہندوستانی فوج کا یہ قدم غیر متوقع تھا اور نہ سمجھ میں آنے والا تھا۔ کلیانی سے پیغام رسانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ وہاں سے کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھیں۔ نظام سے دوران گفتگو اطلاع ملی کہ اورنگ آباد شہر پر ہندوستانی فوجوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اس خبر کا ہم دونوں پر اتنا اثر ہوا کہ ہم دونوں کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ نظام کی آنکھوں سے دو آنسو کے قطرے نکل کر چہرے پر گر پڑے مجھ پر بھی کچھ اس قسم کا اثر ہوا لیکن میرے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ میں بھی اندرونی جذبات واحساسات کا اظہار کروں۔ میں فوج کے ہیڈ کوارٹر کی طرف چلا گیا جہاں معلوم ہوا کہ جالنہ ابھی ہمارے ہاتھوں میں ہے اور جالنہ پر قبضے کے لئے ہندوستانی فوج کی دو ٹکڑیاں ٹینک کی مدد کے ساتھ شمال اور مغرب کی طرف سے شہر کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ رات تک یا دوسرے دن جالنہ پر قبضہ کے امکانات پیدا ہو گئے۔ جالنہ شہر کو

بچانے کا کوئی انتظام نہ تھا مغرب کی طرف سے ہندوستانی فوج کا ایک دستہ بیڑ کی طرف سے بڑھ رہا تھا، بیڑ شہر پر بھی جلد ہی قبضہ کے امکانات پیدا ہو گئے۔

فوج کے کمانڈر کو مسلسل کام کرتے ہوئے ۳۶ گھنٹے گذر چکے تھے، اس لئے انھیں مشورہ دیا کہ کچھ آرام کریں۔ میں نے کمان کا چارج لے کر کمانڈر سے کہا کہ کوئی اہم واقعہ ہونے پر ہی انھیں جگایا جائے گا۔

ریاست حیدرآباد کے مشرقی محاذ سے بھی ہندوستانی افواج کے آگے بڑھنے کی اطلاع مل رہی تھی۔ حضور آباد مریال گوڑہ سڑک کے ذریعے ہندوستانی فوج کا ایک دستہ موسیٰ ندی پار کر چکا تھا۔ اس سڑک کے دفاع کے ذمہ داروں کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ ہندوستانی فوج کے اس دستے کو دارالخلافہ پہنچنے کے لئے دو راستے تھے شمال کی طرف نلگنڈہ پہنچ کر سوریہ پیٹ کی طرف سے بڑھنے والے ہندوستانی فوجی دستے میں شامل ہو جائے یا پھر مغرب کی طرف بڑھ کر وہاں سے مختلف سڑکوں میں سے کسی بھی ایک راستے کا انتخاب کر کے سیدھے دارالخلافہ حیدرآباد کی طرف بڑھے۔ اس دوران میں نے حکم دیا کہ سوریہ پیٹ نکریکل روڈ پر واقع موسیٰ ندی کے پل کو تباہ کر دیا جائے اور حمایت ساگر تالاب کے دروازے کھول دیئے جائیں تاکہ تباشدہ پل کے قریب موسیٰ ندی کو پار نہ کیا جائے۔ ان حالات کا جائزہ لینے کے لئے کابینہ کا مختصر اجلاس ہوا۔ شام کو نظام سے ملاقات کی۔ سہ پہر کے مقابلے میں وہ ذرا کم جذباتی نظر آ رہے تھے۔ مختلف مقامات سے آئی ہوئی اطلاعات سے انھیں واقف کر دیا گیا۔ فوجی کمان کے ہیڈ کوارٹرس میں کمانڈر اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے اسی وقت قاسم رضوی بھی آ موجود ہوئے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ وہ جنوبی اور مشرقی محاذ کے لئے رضاکار مہیا کر سکتے ہیں؟ جہاں افواج کی بری طرح کمی ہے انھوں نے شہر کا دورہ کر کے آنے کے بعد کہا کہ رضاکاروں کی چار بٹالین تیار ہیں ان میں ان کے خود دو بیٹے شامل تھے۔

رات دیر گئے میں اپنے آفس پہنچا جہاں میرا اسٹاف ان تمام پیغامات کو موصول کر رہا تھا جو حیدرآباد کے کراچی میں مقیم ایجنٹ جنرل مشتاق احمد روانہ کر رہے تھے۔ باہر کی دنیا سے صرف یہی ایک مواصلاتی تعلق تھا۔ حیدرآباد سے چھ پیغامات روانہ کئے جا رہے تھے وہ کراچی سے لندن میں مقیم حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل میر نواز جنگ کو ارسال کئے جا رہے تھے۔ مشتاق احمد حکومت پاکستان کو بھی

حیدرآباد کے حالات سے باخبر کرتے رہے۔ اس وقت اقوام متحدہ کا ادارہ ہی ایک آخری اُمید تھی جس پر حکومت حیدرآباد تکیہ کئے ہوئے تھی۔ سیکورٹی کونسل کا اجلاس اس قت پیرس میں ہو رہا تھا۔

حیدرآباد کا ڈیلی گیشن کسی نہ کسی طرح لندن ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو پہنچ سکا اور وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ حکومت ہند کا حملہ ایک ہفتے بعد ضرور ہونے والا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے اچانک انتقال کی وجہ سے اس ڈیلی گیشن کو کراچی سے روانہ ہونے میں کچھ دیر ہوئی۔ ڈیلی گیشن کے قائد معین نواز جنگ کو اس چیز کا اشارہ دیا گیا کہ قائداعظم کی موت کی وجہ سے ہندوستانی حکومت اپنے مجوزہ پلان سے پہلے ہی حملہ کردے گی اس لئے انھیں ایک منٹ بھی ضائع کرنا نہیں چاہئے۔ لندن جاتے ہوئے دوران سفر ڈیلی گیشن جب قاہرہ پہنچا تو حسب توقع ہندوستانی حملہ کی اطلاع مل گئی۔ اس لئے ڈیلی گیشن نے کسی طرح جلد از جلد لندن پہنچنے کے لئے قاہرہ سے ہوائی جہاز بدل دیا۔ بدقسمتی سے اس ہوائی جہاز کو انجن کی خرابی کی وجہ سے تریپولی میں چند گھنٹے اور رُکنا پڑا اور اس طرح یہ ڈیلی گیشن ۱۳ ستمبر کی شام کو لندن پہنچ گیا۔ وہاں سے اولین وقت دوسرے جہاز سے حیدرآبادی نمائندہ ۱۴ ستمبر کی صبح پیرس پہنچا۔ پیرس پہنچتے ہی ڈیلی گیشن کے قائد معین نواز جنگ نے ضروری دستاویزات اقوام متحدہ کے کارگذار سکریٹری جنرل مسٹر سولولیوف کے پاس داخل کردیئے۔ لیکن کسی بھی طرح ۱۶ ستمبر ۴۸ء کی سہ پہر سے پہلے سیکورٹی کونسل کی میٹنگ بلائے جانے کی اُمید نہیں تھی۔

۱۵ ستمبر ہندوستانی فوج کی کوچ برابر جاری تھی۔ نلدرگ دالم ہوتے ہوئے فوج کا وہ کالم جو کلیانی کی طرف بڑھ رہا تھا اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔

۱۵ ستمبر کی صبح نظام بہت افسردہ نظر آرہے تھے۔ جنگ کی صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے بلائے گئے میٹنگ میں کسی بھی قسم کا جوش خروش نظر نہیں آرہا تھا۔ نظام نے صورتحال کے بارے میں میرے تاثرات دریافت کرنا چاہئے اور یہ بھی دریافت کیا کہ کیا سیکورٹی کونسل کے کسی فیصلے تک ہندوستانی فوج کے کوچ کو روکا جاسکتا ہے؟ میں نے صاف کہہ دیا کہ سیکورٹی کونسل کا کوئی بھی فیصلہ ایک ہفتہ سے قبل نہیں ہوگا اور اس وقت تک کسی طرح حیدرآباد کا دفاع ضروری ہے۔ فوجی کمانڈر کا کہنا تھا کہ مغرب (نلدرگ اور بیدر کی طرف سے) کی جانب بڑھنے والی فوجوں کو اس وقت تک روکا جاسکتا ہے مگر مشرق کی طرف سے بڑھنے والی افواج کو روکنے کے لئے حکومت کے پاس فوج بالکل نہیں

ہے پھر بھی دارالخلافہ حیدرآباد کی طرف بڑھنے والی فوج کو ایک ہفتہ تک روکنا بعید از قیاس نہیں بتلایا۔

اسی دن کابینہ کا مختصر سا اجلاس ہوا۔ اجلاس کے فوری بعد اے ڈی سی نے بتلایا کہ دہلی ریڈیو نے یہ اعلان کیا ہے کہ مغرب سے بڑھنے والا فوجی دستہ بیدر کے قریب اس جگہ پہنچ گیا ہے جہاں سے تاریخی شہر بیدر کے مینار نظر آ رہے تھے اور میں اس کمرے میں داخل ہوا جہاں دوپہر کے وقت کا نیوز بلیٹن سنا جا رہا تھا۔ پورا نیوز بلیٹن ہندوستانی فوج کی پیش قدمیوں پر مشتمل تھا۔ خبروں کے آخر میں اس بات کو خاص اہمیت دی گئی تھی کہ ہندوستانی فوج کو تاریخی شہر بیدر کے مینار صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے فوراً کمانڈر بیدر سے رابطہ کیا کمانڈر کو اسی وقت اطلاع ملی تھی کہ کلیانی بیدر روڈ پر ٹینک اور بکتر بند گاڑیوں پر مشتمل فوج کا ایک بڑا کالم کلیانی بیدر روڈ پر حرکت میں ہے میناروں کی اونچائیوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس واقعہ کی اطلاع کمانڈر نے مجھے دی تو میں نے نقشے پر نظر ڈالی جو دیوار پر آویزاں تھا۔ حیرت کی حد نہیں رہی جب اس نقشے پر کلیانی بیدر روڈ کا وجود ہی نہیں پایا۔ میں نے فوراً چیف انجینئر سے فون پر رابطہ قائم کیا اس نے اس بات کی تصدیق کی کہ حال ہی میں کلیانی سے بیدر ایک بہت ہی عمدہ سڑک تعمیر کی گئی ہے جسے ٹریفک کے لئے کھول دیا گیا ہے۔ فوج کے کمانڈر کو اس سڑک کے وجود کی اطلاع نہیں تھی مگر ہندوستانی فوج اس سے واقف تھی۔

بیدر یہ ایک رسد کی سپلائی کا مرکز تھا۔ یہاں لڑنے والی فوج کو تعینات نہیں کیا گیا تھا۔ کلیانی سے بیدر جانے والی سڑک پہاڑی علاقوں سے پیچ و خم کھاتی ہوئی گذرتی ہے۔ اس سڑک پر دفاع مقابلتاً آسان تھا۔ اس سڑک پر مخصوص جگہوں پر فوج کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں آسانی سے دفاعی مورچے سنبھال سکتی تھیں لیکن ہندوستانی فوج بہت آرام سے اس سڑک سے گذر رہی تھی اور اس طرح لاتور بیدر کے دفاعی مورچے کو چھوڑتے ہوئے اطمینان سے بیدر پہنچ گئی اور چند ہی گھنٹوں میں ہمنا آباد کے دفاعی مورچوں کے عقب میں پہنچ گئیں۔ بہت نازک صورتحال پیدا ہوگئی تھی۔ بیدر ظہیرآباد سے تقریباً ۱۲ میل کے فاصلے پر تھا جب کہ ظہیرآباد اور ہمنا آباد تقریباً ۴۰ میل کے لگ بھگ ایک دوسرے سے دور تھے۔ افراتفری کا عالم تھا کیا کمانڈر نازک صورتحال پر قابو پانے کی پوزیشن میں تھا؟ میں نے فوج کے سینئر آفیسرس کی میٹنگ طلب کی اس وقت تک لاتور کی دفاعی یونٹس ختم ہو چکی تھیں۔ صرف ایک سوال پیش نظر تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمنا آباد میں مقیم حیدرآبادی فوجوں کو ہمنا آباد

سے نکال کر ظہیرآباد فوجوں کی تعیناتی کر کے ظہیرآباد حیدرآباد روڈ کا دفاع کیا جاسکتا ہے۔اس سڑک پر کچھ ایسے مقامات ہیں جہاں سے دفاع کے مورچے اچھی طرح سنبھالے جاسکتے ہیں ۔اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

حیدرآبادی فوج کے کمانڈر اور سینئر آفیسرس کا خیال تھا کہ ہندوستانی فوج کے ٹینک کے دستہ کے حملہ کے لئے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ وہ بیدر پر قبضہ کر کے فوری طور پر ظہیرآباد تک پہنچ کر حیدرآبادی فوج واپس ہونے کی سڑک کو کاٹ دیں گے۔ان کا خیال تھا کہ اب تک کی فوجی کارروائیوں کی وجہ سے ٹینک کافی تھکا ماندہ ہوگا پھر بھی میں نے حکم دیا کہ ہمنا آباد پر تعینات کی گئی حیدرآبادی فوج فوری طور پر ظہیرآباد سے ۱۲ میل دور پر واقع پہاڑیوں تک واپس ہوجائے اور اپنے ساتھ ۲۵ پونڈ گولے پھینکنے والی توپیں اور بھاری جنگی ساز و سامان ساتھ لیتے جائیں ۔ بیدر والی فوج کو بھی بیدر فوری چھوڑنے کا حکم دیا اور جتنا ممکن ہوا تنا ساز و سامان لیتے جائیں اور سوال یہ تھا کہ ہندوستانی فوج بیدر سے دارالخلافہ حیدرآباد پہنچنے کے لئے ظہیرآباد کو نظرانداز کر کے متبادل روڈ کا انتخاب کرے تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔ایسا ہوا تو پھر بہت ہی پریشانی کی صورتحال ہوگی۔پھر بھی ان مشکلات کا کوئی حل نہیں تھا کیوں کہ تمام راستوں کا روکنا ممکن نہیں تھا۔کیوں کہ کمانڈروں کے مشورے سے یہ طے کیا گیا تھا کہ ظہیرآباد حیدرآباد سڑک پر ہی دفاع کیا جائے ۔ کیوں کہ امکان اسی بات کا تھا کہ ہندوستانی افواج اسی راستہ کا انتخاب حیدرآباد پہنچنے کے لئے کریں گی۔ضروری احکامات دینے کے بعد میں اپنے آفس واپس پہنچا۔حالات اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ کوئی پلان بنانا ممکن نہیں تھا۔ آخر میں بڑی سوچ بچار کے بعد اس فیصلہ پر پہنچا کہ صرف دو راستے ہیں ایک تو یہ کہ حیدرآباد ریڈیو پر فوری طور پر حکومت ہند سے اپیل کی جائے کہ فوری فوجی کارروائی بند کر کے خون خرابہ بند کردے اور جو بھی مناسب شرائط حکومت ہند کی طرف سے عائد کی جائیں گی ان کو تسلیم کیا جائے اور اگر اس کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہو تو آخر تک لڑا جائے۔دوسرا راستہ یہ تھا کہ فوری طور پر ہتھیار ڈال دیئے جائیں اور تمام مزاحمت روک دی جائے۔میں نے اول الذکر کو مناسب خیال سمجھ کر ۱۵ ستمبر کی سہ پہر کو حیدرآباد ریڈیو سے ہندوستانی رہنماؤں سے اپیل کی کہ جنگ بند کی جائے ۔ ساتھ ہی ساتھ حیدرآباد کے ایجنٹ مقیم کراچی مشتاق احمد کو بھی پیغام روانہ کیا کہ حکومت پاکستان سے رابطہ قائم کیا جائے اور حکومت

ہند سے درخواست کی جائے کہ فوری طور پر خون خرابہ بند کیا جائے اور اس وقت کے حالات کی مناسبت سے جو کچھ بھی معاملات طے ہو سکتے ہیں طے کر لے۔ میری اپیل حیدرآباد ریڈیو سے مسلسل نشر کی جا رہی تھی مگر رات دیر گئے تک ہندوستانی حکومت کی طرف سے دہلی ریڈیو کی نشریات میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ میں اس دن نظام سے سہ پہر میں مل چکا تھا پھر بعد میں مزید ملاقات کی۔ ہر گھنٹہ ان کے تاثرات بدل رہے تھے وہ بہت مایوس ہو چکے تھے خود پہ اعتماد کھو چکے تھے بار بار مجھ سے دریافت کر رہے تھے کہ کیا اقوام متحدہ کے ادارہ سیکورٹی کونسل سے اب بھی کسی اقدام کی امید ہے؟ اگرچہ کہ اس سلسلے میں صبح سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی پھر بھی میرا خیال تھا کہ اب بھی اُمید ہے اس لئے جتنا ممکن ہو دفاع کیا جائے۔

مشرقی اور جنوبی محاذ کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی مگر مغرب کے محاذ کی صورتحال بہت سنگین تھی میں نصف شب سے کچھ بعد فوجی ہیڈکوارٹرس پہنچا کمانڈر کچھ آرام سے لیٹے ہوئے تھے مگر دوسرا اسٹاف چوکنا تھا۔ کسی اہم واقعہ کی اطلاع بھی نہیں تھی اور رات گئے تک اس کی اُمید بھی نہیں تھی۔ مشتاق احمد کراچی سے کچھ ٹینک شکن توپیں ہوائی جہاز سے حیدرآباد پہنچانے میں کامیاب ہوئے مگر ان وزنی توپوں کو ہوائی جہاز سے اُتارنے اور پھر ان کو جمع کر کے توپوں کی شکل دینا خود ایک مسئلہ تھا۔ اس لئے ان تمام وزنی حصوں کو ہیڈکوارٹرس لایا گیا۔ میں نے ان توپوں کا معائنہ کیا کاش کچھ اور توپیں کچھ دن قبل پہنچ جاتیں ان توپوں کو مشرقی محاذ پر فوری طور پر روانہ کیا گیا جہاں دفاعی نظام نہیں تھا۔

اس دوران حیدرآباد پر ہندوستانی افواج کا حملہ ساری دنیا کے اخباروں کی شہ سرخی بن گئی۔ اس کا نوٹس سیکورٹی کونسل کے ممبران اور ان کی حکومتوں نے از خود لیا حیدرآباد اور حکومت ہند کے نمائندوں سے نوٹ لیا۔ ہر طرف سے اس حملہ کی مذمت کی گئی۔ خاص طور سے برطانیہ اور امریکن عوام کی مذمت ذرا زیادہ تھی۔ مگر دیکھنا یہ تھا کہ دنیا بھر کے عوام کی رائے عامہ کا کوئی اثر کیا اتنا ہوگا کہ سیکورٹی کونسل فوری طور پر کوئی قدم اُٹھائے گی۔ پیرس سے یہ اطلاع ملی کہ سیکورٹی کونسل کا اجلاس ۱۶؍ ستمبر کو طلب کیا گیا ہے اس سے قبل کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔ اس دوران حیدرآباد وفد کے قائد معین نواز جنگ انفرادی طور پر تمام ممبروں سے ملاقات کر رہے تھے اور انھیں صورتحال سے آگاہ کر رہے تھے۔ قوم پرست چین کی حکومت پوری طرح حکومت ہند کی تائید میں تھی روس غیر جانبدار رہا۔ مگر باقی تمام

ممبر حکومت حیدرآباد کے موقف کی تائید میں تھے یعنی وہ حکومت ہند کی فوجی کارروائی کی مذمت کر رہے تھے۔ حکومت ہند کا وفد پس پردہ اپنے موقف کی تائید حاصل کرنے کے لیئے سرگرم ہوگیا۔

۱۶ رستمبر کی صبح ہندوستانی فوج کا بکتر بند دستہ بیدر شہر سے گذر کر بیدر ظہیرآباد روڈ سے گذر رہا تھا۔ اس سے قبل ہمنا آباد میں تعینات فوج اور توپیں ہمنا آباد سے نکال کر ظہیرآباد کے عقب یعنی قادرآباد کی سمت منتقل کردیئے گئے تھے اور پہاڑی علاقہ میں مورچہ بندی کی گئی۔ اس دن میں نظام سے صبح اور دوپہر دو مرتبہ ملا۔ نظام کچھ دیر خاموش تھے حیدرآباد ریڈیو سے اس دن میرے کئے گئے اعلان کا دہلی ریڈیو کی خبروں میں ذکر نہیں تھا۔ پاکستان سے بھی اُمیدیں ختم ہوگئیں تھیں کہ وہ کوئی سیاسی یا دوسرا کسی قسم کا قدم اُٹھائے یا اس وقت جب کہ ہندوستانی فوج کے بکتر بند دستے پوری طاقت کے ساتھ حیدرآباد کے محاذ پر لگادیئے گئے تھے۔ ایسے وقت پاکستان کے لئے یہ آسان ہوتا کہ وہ پٹھان کوٹ جموں کے پل پر قبضہ کر کے کشمیر کو ہندوستان سے علحدہ کرے اور اس طرح کشمیر کے بارے میں کوئی فیصلہ اپنے حق میں کروائے۔ مگر قائداعظم کی وفات کے فوری بعد اس طرح کا کوئی بڑا قدم اُٹھانا ممکن نہیں تھا۔ میں اب بھی پر اُمید تھا کہ سیکورٹی کونسل کی طرف سے کوئی اقدام کیا جائے اور اس وقت تک کسی طرح حیدرآباد کا دفاع کیا جائے مگر نظام میرے نظریہ سے متفق نہیں تھے۔ ۱۶ رستمبر کی شام میں پیرس میں ہونے والی سیکورٹی کونسل کے اجلاس سے حیدرآباد کی کابینہ میں کافی اُمید پیدا ہوگئی تھی اور ہر شخص بے چینی سے منتظر تھا۔

اسی دوران ہندوستانی فوج کا وہ کالم جو جنوب کی طرف ہوتے ہوئے بڑھ رہا تھا اب مغرب کی طرف رُخ ہوگیا اور یہ کہنا غیر یقینی تھا کہ وہ نلگنڈہ سے گذر کر پھر وہ دیورکنڈہ حیدرآباد روڈ پر پہنچ جائے گا۔ درحقیقت اس سیکٹر میں کوئی دفاع ہی نہیں تھا چنانچہ میں نے کچھ فوجیوں کے ساتھ رضاکار کے دستے روانہ کئے۔ انھوں نے بڑا خوب کام انجام دیا اور ہندوستانی فوج اس جانب مزید رُخ نہیں کی۔ حیدرآباد کی افواج کے پاس ٹینکس مار گرانے والی سرنگوں کا بہت محدود ذخیرہ تھا جو پورا تقسیم کیا گیا۔ اس ذخیرہ کو جنوبی محاذ کے حیدرآباد نکریکل روڈ اور ظہیرآباد حیدرآباد روڈ پر مقامات کی نشاندہی کرتے ہوئے بچھانے کی ہدایت دی گئی تھی۔ اسی دوران نظام سے ہدایت ملی کہ میں نظام سے ملاقات کروں۔ شام دیر تک نظام سے ملاقات کی۔ یہ حالاں کہ اسی دن جب میں نظام سے صبح اور

دو پہر ملا تھا دونوں وقت نظام کو میں نے بہت غائب دماغ پایا تھا۔ مگر اس مرتبہ وہ چست و چوکنا نظر آ رہے تھے۔ تمام دن کی رپورٹ میں نے اس وقت دی اور تازہ ترین صورتحال سے واقف کرایا۔
نظام نے کہا کہ وہ کافی غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ مجھ سے کھلے دل سے گفتگو کرنا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ ان کے سامنے صرف دو صورتیں باقی رہ گئی ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ اپنی پوری کابینہ کے ساتھ مستعفی ہو جاؤں اور پورا معاملہ انھیں (نظام) کو سونپ دوں اور پھر وہ جو ممکن سیاسی تصفیہ حکومت ہند سے کرنا چاہیں گے کریں گے۔ اگر اس تجویز سے میں متفق نہ ہوں کا تو پھر مجھے یہ اعلان کرنا ہوگا کہ حکومت کے معاملات میں نظام کا کوئی دخل نہیں ہے اور موجودہ صورتحال کے جو بھی نتائج ہوں گے اس کے لئے میں اور میری کابینہ ذمہ دار رہے گی۔ اس پر میں نے نظام سے دریافت کیا کہ کس قسم کا سیاسی تصفیہ ان کے پیش نظر ہے؟ نظام نے جواب دیا کہ اس وقت وہ صرف اتنا کہنا چاہیں گے کہ اپنی ذاتی سمجھ بوجھ اور اختیارات کا استعمال موقع محل کو سامنے رکھ کر جو مناسب ہوگا وہ کریں گے۔ پھر وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے اور مجھ سے کہا کہ دوسرے دن صبح ۹ بجے سے پہلے میرا جواب انھیں چاہئے اور اس بات کی بھی تاکید کی کہ میرا جواب قطعی اور آخری ہونا چاہئے۔ میں نے صبح سے نظام کے رویے سے اندازہ لگایا تھا کہ کوئی اہم چیز واقع ہونے والی ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ دوسرے دن جو وقت مقرر کر دیا گیا ہے اس سے ایک گھنٹہ قبل ہی جواب دیا جائے گا لیکن یہ جواب میرا ذاتی ہوگا۔ کابینہ اس کے لئے ذمہ دار نہیں رہے گی۔ میں نے مزید کہا کہ اپنا جواب دینے کے بعد دوسرے دن صبح ۱۰ بجے کابینہ کا اجلاس بلاؤں گا اور کابینہ کا جو بھی قطعی فیصلہ ہوگا اس سے واقف کرا دیا جائے گا۔ اس پر نظام نے کچھ ناراضگی کا اظہار کیا۔ لیکن آخر میں میرے موقف سے اتفاق کیا۔
میں نے پیلس سے آنے کے بعد نظام سے گفتگو پر غور کیا۔ فوجی ہیڈ کوارٹر پہنچنے تک میں بھی اس نتیجے پر پہنچا کہ کچھ تلخ حقائق کو سامنے رکھ کر مجھے بھی کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔ میں نے سوچا کہ اگر تھوڑا بھی ممکن ہو تو مزاحمت کی جائے گی اس کے لئے نظام کا ساتھ ہو یا نہ ہو۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ بغیر نظام کے تعاون کے یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں حیدرآباد اسٹیٹ کی باقی رہی سہی فوج کا کیا رول رہے گا؟ فوجی کمانڈر سے کس انداز سے سلوک کرنا پڑے گا؟ کیا مجھے ایسے موقع پر کسی کو اعتماد میں لینا پڑے گا؟ کیا مجھے ایسے موقع پر کسی سے مشورہ کرنا پڑے گا؟ یا پھر خود ہی مجھے

کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا؟ یہ کچھ مسائل تھے جو میرے ذہن میں بار بار پیدا ہو رہے تھے۔

جنگ کے میدان سے کوئی اہم واقعہ فوجی ہیڈکوارٹرس کو رپورٹ نہیں ہوا۔ فوجی کمانڈر تھوڑی سی تبدیلی کے لئے اپنے گھر جا چکے تھے۔ میں سینئر آفیسرس سے اس وقت کے حالات پر گفتگو کر رہا تھا۔ جس رفتار سے ہندوستانی فوج کی پیش قدمی جاری تھی اور جو کچھ بھی مزاحمت کی جا رہی تھی ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوستانی فوج تین دن میں دارالخلافہ حیدرآباد پہنچ جائے گی۔ تمام آفیسرس یہ جاننا چاہتے تھے کہ اس دوران سیکورٹی کونسل کیا برموقع موثر کارروائی کر سکتی ہے؟ اسی دوران کمانڈر واپس آ گئے انھوں نے اس وقت کہا کہ مشرقی محاذ کے دفاعی یونٹوں میں مزاحمت کی صلاحیت تقریباً ختم ہو گئی ہے اس لئے انھیں ڈر ہے کہ مغرب کے محاذ کی طرف ہندوستانی افواج کی پیش قدمی زیادہ تیز رفتار ہو گی۔ اس وقت قاسم رضوی صاحب نے بھی اطلاع دی کہ ایک ہزار رضاکار تیار ہیں جو کسی بھی محاذ پر جانے کے لئے تیار ہیں۔ میں نے فوری حکم دیا کہ رضاکاروں کو اور دوسرے شہریوں کو جو ان میں شامل ہونا چاہتے ہیں فوراً مشرقی محاذ پر روانہ کر دیا جائے۔ ان رضاکاروں کو اور شہریوں کو سڑکوں کے کنارے خندق، مورچے کھودنے اور بارودی سرنگیں بچھانے کی ضروری معلومات دے کر روانہ کرنے کی تاکید کی گئی تاکہ ہندوستانی افواج کی پیش قدمی کو سست بنایا جائے۔ میں نے فوجی کمانڈر سے ظہیرآباد کے مشرق میں واقع پہاڑیوں میں دفاعی مورچوں پر فوجیوں کی تعیناتی کے بارے میں پوچھ تاچھ کی۔ دفاعی مورچوں کی کمان ایک بریگیڈئیر کو سونپی گئی جو اس سے پہلے بیدر میں متعین تھا۔ حملے کے بعد سے ہی حیدرآبادی افواج ٹین کے ڈبوں میں رکھی ہوئی غذا استعمال کر رہے تھے۔ اس لئے اولین فرصت میں تازہ غذا کا انتظام کیا گیا۔ نظام سے گفتگو کے بعد جو صورتحال پیدا ہوئی تھی اس پر اچھی طرح غور کر کے کوئی فیصلہ کرنے کے لئے مجھے وقت نہ مل سکا۔ فوجی ہیڈکوارٹر سے میں شاہ منزل (وزیراعظم کی سرکاری رہائش گاہ) کی طرف چل دیا۔ کیوں کہ مجھے اطلاع ملی تھی کہ کراچی سے حیدرآباد کے ایجنٹ مشتاق احمد کا کوئی پیغام آیا ہے۔ شاہ منزل پہنچنے پر معلوم ہوا کہ نظام نے مجھے فوری بلوایا ہے۔ مشتاق احمد کے آئے ہوئے پیغام پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے پیلس کی طرف روانہ ہوا اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ نظام کو اور کیا کہنا ہے مجھ سے۔ نظام سے دوران گفتگو فوجی ہیڈکوارٹر سے دو پیغامات ملے جس میں کہا گیا تھا کہ دونوں محاذوں پر کوئی خاص

تبدیلی نہیں ہوئی۔ دوران گفتگو نظام کے پیلس پر دو ہوائی جہازوں نے نہایت نیچی پروازیں کیں۔ یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ ہندوستانی فضائیہ کے لڑاکا طیارے تھے یا نظام کے سپلائی کے طیارے۔ تھوڑی ہی دیر میں برین گن سے فائرنگ کی آوازیں آئیں اور پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ مجھے یہ بے چینی ہورہی تھی کہ کہیں ہمارے طیارے مارگرائے نہ جائیں۔ میں بہت بے چین تھا کہ کسی طرح فوجی ہیڈکوارٹرس پہنچ جاؤں مگر تقریباً ایک گھنٹہ گذر چکا تھا مجھے جانے کی اجازت نہیں ملی۔ میں نے یہ تاثر لیا کہ نظام مجھے ٹٹول کر دیکھ رہے ہیں جو بات انھوں نے پچھلی شام کو کہی تھی اس کا مجھ پر کیا ردعمل ہوا۔ میں نے خود بھی اپنے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ جانے سے پہلے میں نے وعدہ کیا کہ پیرس میں جلد ہی ہونے والی سیکورٹی کونسل میں جو بھی فیصلہ ہوگا اس سے حتی الامکان جلد از جلد مطلع کردوں گا۔ میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ذہنی طور پر ہم دونوں کے درمیان کوئی نظر نہ آنے والا پردہ حائل ہورہا ہے اور ہم دونوں کچھ کھلے طور پر گفتگو نہیں کررہے ہیں۔ اس سے مجھے تھوڑی سی بے چینی ضرور محسوس ہوئی مگر جذباتی بننے کے لئے مطلق وقت نہیں تھا۔ فوجی ہیڈکوارٹر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ کوئی خاص قابل ذکر تبدیلی محاذ پر نہیں ہوئی ہے کہ فوجی ہیڈکوارٹر اب صرف فوجی آفیسروں کے لئے ہی مخصوص نہ تھا بہت سارے سویلین جمع تھے جو رسد کے مختلف شعبوں سے متعلق اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ دفاعی اُمور سے متعلق تمام گفتگو میں وہ حصہ لے رہے تھے۔ قاسم رضوی خود کئی مرتبہ آچکے تھے اور رضاکاروں کو محاذ پر روانہ کرنے کے بارے میں مختلف انتظامات میں حصہ لے رہے تھے۔ فوجی صورتحال سے انھیں مطلع کیا جارہا تھا مگر انھیں کسی قسم کی تشویش نہیں ہورہی تھی وہ ہمیشہ کی طرح نہایت چاق و چوبند نظر آرہے تھے۔

آدھی شب گذر چکی تھی، مغربی دفاعی مورچوں کے بریگیڈیر فوجی کمانڈر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے بتلایا کہ ہندوستانی افواج کے بکتر بند دستے ابتدائی شب کی چاندنی میں ظہیرآباد سے حیدرآباد کی طرف سڑک سے کوچ کرچکے ہیں۔ شرمن ٹینک ۲۵ پونڈ گولے داغنے والی توپوں کی زد میں آتے ہی توپوں سے حملہ کیا گیا اور حملہ کے ساتھ ٹینک کا کالم پنکھے کی شکل میں منتشر ہوکر ظہیرآباد لوٹ گیا اور صبح تک کسی مزید پیش قدمی کی اُمید نہیں ہے۔ اس لئے وہ مزید ہدایات کے لئے حیدرآباد آیا ہے۔ بریگیڈیر بے چین، پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کی گفتگو میں ربط

نہیں تھا۔اس کے جانے کے بعد فوجی کمانڈر نے اس چیز کو محسوس کر کے کہا کہ یہ بریگیڈیر اب کمان کے لائق نہیں ہے اس لئے فوجی ہیڈکوارٹرس سے کسی دوسرے بریگیڈیر کو کمان دی جائے۔اس کو ہدایات دی گئیں اور میں نے شخصی طور پر اس سے اپیل کی کہ کسی طرح ہندوستانی افواج کی پیش قدمی کو روکا جائے۔کیوں کہ حیدرآباد کی قسمت کا فیصلہ اس کے ہاتھوں میں ہے۔بریگیڈیر نے پورا یقین دلایا کہ وہ کسی قیمت پر آخری لمحوں تک دفاع کرے گا۔دفاعی کارروائیوں کا مرکز اب مغربی محاذ تھا۔ مشرقی محاذ کی طرف سے کوئی رپورٹ مل نہیں رہی تھی۔میں ذہنی طور پر پریشان تھا اور سوچ رہا تھا کہ فوجی کمانڈر اس صورتحال سے کس طرح نمٹ سکتا ہے میں نے فوجی کمانڈر سے کہا کہ وہ فوری مغربی محاذ پر جا کر ذاتی طور پر فوجی صورتحال کا جائزہ لے۔کمانڈر جانے کے لئے تیار ہوا اس کی جگہ ایک سینئر آفیسر کو کمانڈر کی جگہ مقرر کیا گیا۔تمام اسٹاف سرنگیں مشرقی اور مغربی محاذ کو بھیجنے کا کام کرنے لگا۔اس کام کے لئے کئی سیویلین کو مامور کر دیا گیا۔۷ارستمبر کی صبح تقریباً ۹بج چکے تھے سینئر آفیسروں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں آرام کروں۔پچھلی دو شب میں ایک لمحے کے لئے بھی لیٹ نہ سکا تھا۔اپنے مکان واپس جاتے ہوئے شاہ منزل کے اس کمرے میں جھانک کر دیکھا جہاں اسٹاف مشتاق احمد ایجنٹ حیدرآباد مقیم کراچی کے پیغامات کو پڑھ رہے تھے۔پیرس میں ہونے والی سیکورٹی کونسل کی میٹنگ کے سلسلے میں کوئی پیغام نہیں تھا۔پیرس سے آنے والے پیغام فوری طور پر مجھ تک پہنچانے کی ذمہ داری کی ہدایت دے کر وہاں سے میں اپنی قیام گاہ پر آیا۔میں جوں ہی لیٹنا چاہا ریلوے کے چیف نے فون سے اطلاع دی کہ بی بی نگر ریلورے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر نے اطلاع دی ہے کہ اسٹیشن کے قرب و جوار میں بموں کے دھماکوں کی آوازیں آرہی ہیں اور ہندوستانی فوج کی بی بی نگر حیدرآباد روڈ سے حیدرآباد کی طرف پیش قدمی جاری ہے۔میں حیرت زدہ ہوگیا۔بی بی نگر اسٹیشن کے قریب دھماکے! یہ کیا ماجرا ہے؟ میں نے ریلوے والوں سے دوبارہ اس خبر کی تصدیق کی، میرے لئے یہ ناقابل یقین تھا کہ ہندوستانی فوج دارالخلافہ سے صرف ۳۰ میل دوری پر ہے اور وہ حیدرآباد کی طرف بڑھ رہی ہے۔اس سڑک جسے بغیر کسی دفاع کے چھوڑ دیا گیا تھا میرے لئے یہ زندگی کا سب سے بڑا دھکا تھا۔یہ صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ یا تو نکریکل میں متعین دفاعی حیدرآبادی فوج کا مکمل صفایا ہو گیا ہے یا پھر ان دفاعی فوجوں کو ایک طرف چھوڑ کر ہندوستانی فوجیں نکریکل جنگاؤں

روڈ سے حیدرآباد کی طرف بڑھ رہی ہیں ۔ مغربی محاذ پر بھی ہندوستانی فوجیں والم پر متعین فوجوں کو ایک طرف چھوڑ کر اچانک بیدر میں نمودار ہوئیں ۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں بھی وہی ہوا ہے ۔ میں نے فوری فوجی ہیڈ کوارٹرس سے فون پر رابطہ قائم کیا ۔ مجھ سے کہا گیا کہ مشرقی محاذ پر کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور دفاع مکمل محفوظ ہے اگر چہ کہ ہندوستانی فضائیہ کے طیارے مشین گن سے گولیاں برسا رہے ہیں ۔ جب میں فوجی ہیڈ کوارٹرس کو ریلوے کے چیف کی طرف سے آئی ہوئی اطلاع سنائی تو اس پر جواب دیا گیا کہ صرف ایک منٹ قبل ریلوے کے چیف سے انھیں بھی یہ اطلاع ملی ہے ۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ اگر یہ خبریں صحیح ہیں تو اس پیش قدمی کو روکنے کے لئے کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی اور اس رفتار سے ہندوستانی افواج ۴ سے ۵ گھنٹے میں حیدرآباد پہنچ جائیں گے ۔ میرے لئے اب یہ تمام معاملہ اختتام تک پہنچ چکا تھا ۔ ہندوستانی افواج بی بی نگر اسٹیشن اور حیدرآباد تک ایسی سڑک پر جس پر دفاع کا کوئی انتظام نہیں تھا ، پہنچ چکی تھی ۔ اب کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ میں نے ریلوے والوں سے دوبارہ اس حقیقت کی تصدیق کی ۔ اب میں نے محسوس کیا کہ مجھے کچھ نہ کچھ فوراً کرنا چاہئے میں نے فوراً وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کی ۔ قرآن پاک سے کچھ آیات کی تلاوت کی اور دن بھر کی مصروفیات کے لئے تیاری کر رہا تھا کہ فوجی کمانڈر آئے ۔ میں نے انھیں کافی دینے کے لئے ملازم کو ہدایت دی اور گفتگو کرنے کے لئے کمانڈر کے ساتھ بیٹھ گیا ۔

سیکورٹی کونسل کی میٹنگ جس کا سب کو بے چینی سے انتظار تھا ۔ آخر کار ۱۶ ر ستمبر کی شام پیرس میں منعقد ہوئی ۔ جس کی صدارت برطانیہ کے نمائندے سرالگزنڈ کاڈگان نے کی ۔ میٹنگ کے سامنے پہلے یہ مسئلہ پیش آیا کہ کیا حیدرآباد کی درخواست قابل سماعت ہے ؟ حیدرآباد کے مندوب کے لئے بھی یہ انتہائی نازک مسئلہ تھا ۔ ڈر تھا کہیں خالصتاً ایک تکنیکی نکتہ پر حیدرآباد کی درخواست مسترد نہ کی جائے ۔ قوم پرست چین کے نمائندے نے مشورہ دیا کہ میٹنگ ۲۰ ر ستمبر تک ملتوی کی جائے کیوں کہ انھیں ان کی حکومت سے ضروری ہدایات موصول نہیں ہوئیں ۔ لیکن برطانوی نمائندے کا کہنا تھا کہ معاملہ کی نوعیت اور اہمیت کے پیش نظر فوری قدم اُٹھانا ضروری ہے ۔ اس لئے کم از کم بحث شروع کرنے میں دیر نہ کی جائے ۔ فرانس کے نمائندے نے برطانوی نمائندے کی تائید کی ۔ بلجیم کا نمائندہ ایک دن کے لئے میٹنگ ملتوی کرنا چاہتا تھا ۔ روس کے نمائندے کا کہنا تھا کہ چوں کہ برطانیہ

ہندوستان کی آزادی کے لئے ذمہ دار ہے، اس لئے برطانیہ کا نمائندہ ہی اس موقف میں ہے کہ حیدرآباد کی قانونی حیثیت پر روشنی ڈال سکے۔ اس پر برطانوی نمائندے نے مناسب موقع پر ضروری معلومات مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نمائندے مسٹر جیسپ نے اس بات کی تائید کی کہ حیدرآباد کی درخواست میٹنگ کے ایجنڈے پر لی جائے۔ ارجنٹینا کے نمائندے مسٹر آرسی نے اس بات کی بھرپور تائید کی اور کہا کہ جب کہ دنیا کے ایک خطہ میں ایک ملک نے دوسرے پر جارحیت کی ہے اور عوام کا قتل ہو رہا ہے، لوگ زخمی ہو رہے ہیں ایسی صورت میں اقوام متحدہ کا ادارہ سیکورٹی کونسل ایسی میٹنگ کو کسی حالت میں ملتوی نہیں کر سکتا۔ کافی بحث کے بعد اس تجویز پر ووٹنگ ہوئی کہ حیدرآباد کی درخواست پر بحث ہونا چاہئے یا نہیں۔ ۸ ممبران نے تائید کی اور ۳ غیر حاضر رہے اور اس طرح سے درخواست پر بحث کرنا طے ہوا اور حیدرآباد کے نمائندے معین نواز جنگ کو دعوت دی گئی کہ وہ اپنا موقف پیش کریں۔ حیدرآبادی نمائندے نے پوری طاقت سے اور موثر طریقہ سے اپنی حکومت کے موقف کو پیش کرتے ہوئے کونسل سے درخواست کی کہ وہ فوراً مداخلت کرے اور ان کے ملک کو تباہی اور خون خرابہ سے فوری طور پر بچائے اور دیرپا امن کے لئے کوشش کرے۔ اس کے بعد حکومت ہند کے نمائندے راما سوامی آئنگار نے بحث کا جواب دیا۔ جہاں تک جارحیت کا سوال تھا حکومت ہند کا موقف کمزور تھا ان کی بحث کا مرکز صرف یہ تھا کہ حیدرآباد کی حکومت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنا کیس کونسل میں پیش کرے۔ انھوں نے کونسل سے یہ وعدہ کیا کہ وہ اپنے موقف کی تائید میں دستاویزی ثبوت پیش کریں گے اور یہ ثابت کریں گے کہ حیدرآباد کبھی آزاد ملک کی حیثیت سے نہیں رہا۔ اس طرح سے اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ سیکورٹی کونسل میں اپنا دعویٰ پیش کرے۔ طرفین کے بحث کی سماعت کے بعد کونسل کے صدر نے تمام ممبران کو معاملہ پر غور کرنے کے لئے بروز پیر ۲۰ ستمبر ۱۹۴۸ء تک کے لئے کونسل کا اجلاس ملتوی کر دیا۔ اگر چہ کہ حیدرآباد کے نمائندے کو بنیادی طور پر کامیابی ہوئی کہ وہ اپنا کیس کونسل کے سامنے رکھنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن ۲۰ ستمبر تک اجلاس کا التوا ایک مایوس کن پہلو تھا۔ حیدرآبادی نمائندے کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ صورتحال نہایت سنگین ہے اور ۲۰ ستمبر تک اجلاس کا التوا فیصلہ کن ثابت ہو سکتا ہے اس لئے حکومت حیدرآباد کے وفد کے نمائندوں نے کونسل کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اس پر جو ردعمل ہوا وہ کافی ہمت افزا تھا مگر پھر بھی

کونسل کے صدر کا یہ خیال تھا کہ ۱۸ رستمبر یعنی ہفتہ (سنیچر) سے قبل اجلاس بلانا ممکن نہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ ۲۰ رستمبر تک ملتوی شدہ اجلاس ہفتہ کے روز بلایا جائے۔ انفرادی ملاقات کے وقت ہر ممبر نے اس بات سے اتفاق کیا کہ جنگ بندی کے لئے فوری قرارداد منظور کی جائے۔ صرف قوم پرست چین نے اس سے اختلاف کیا اور ایسا لگا کہ روس اس ممکنہ اجلاس میں غیر حاضر رہے گا۔ یہ سب کچھ ممکن تھا اگر حکومت حیدرآباد آخر تک صورتحال کو قابو میں رکھ سکے۔ اس طرح یہ بھی ظاہر تھا کہ جب کہ ہندوستانی فوج کے بکتر بند دستے بغیر کسی دفاع کے شہر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے کسی امکانی قدم کی افادیت بہت کم تھی۔ اگر ہندوستانی فوج پوری طرح جنگ کرنے کی تیاری سے شہر کی طرف داخل ہو تو شہری آبادی کا کتنا خون خرابہ ہوگا۔ اس کے بارے میں قیاس کرنا ممکن نہیں تھا۔ ہندوستانی افواج کے عثمان آباد، کلیانی، بیدر اور دوسرے شہروں میں داخلے کے بعد جو قتل عام ہوا تھا وہ میرے پیش نظر تھا۔ علاوہ اس کے شہر میں فرقہ وارانہ فسادات بھڑک اُٹھے تو اس سے بھی کیا صورتحال پیدا ہو سکتی ہے وہ بھی بعید از قیاس تھی۔ اب میں مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا میں نے سوچا کہ ممکن ہے نظام اس کے لئے خود قدم اُٹھائیں اور شہری قتل عام سے بچ جائیں۔ اس لئے میں نے طے کیا کہ فوراً میں اپنا استعفیٰ پیش کروں اور ساتھ ہی اپنی کابینہ میں شریک ساتھیوں کو یہ مشورہ دوں کہ وہ بھی مستعفی ہو جائیں۔

جوں ہی فوجی کمانڈر چلے گئے میں سیدھے شاہ منزل پہنچ گیا۔ اس دوران حیدرآباد کے ایجنٹ مقیم کراچی مشتاق احمد کے بہت سارے پیغامات کو پڑھ چکا تھا۔ ایک پیغام میں مجھے پاکستانی رہنماؤں کی طرف سے ہدایت دی گئی تھی کہ میں فوراً حیدرآباد چھوڑ دوں اور ہندوستانی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچ جاؤں۔ علاوہ اس کے سیکورٹی کونسل کے اجلاس کے بارے میں تفصیلات ان پیغامات میں شامل تھیں۔ میں نے صبح ساڑھے نو بجے کابینہ کا اجلاس طلب کرنے کا حکم دیا۔ اسی دوران قاسم رضوی صاحب کا فون آیا اور میری خیریت دریافت کی۔ میں نے صورتحال سے انھیں واقف کرایا۔ میں نے انھیں یہ بھی تاکید کی کہ کسی طرح حالات کو قابو میں رکھیں۔ فرقہ وارانہ فسادات سے شہر کو کسی طرح بچائیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ اس قسم کا ایک بھی واقعہ ہندوستانی حملے کے بعد سے نہیں ہوا اور ان کا خیال تھا کہ حیدرآباد کے ہندو اور مسلمان دونوں کو تباہی کا سامنا کرنا ہے۔ میں

حالات پر قابو پانے کے لئے کوئی بھی قدم اُٹھانے کو تیار ہیں تب ایسی صورت میں وہ اپنے عہدہ کو چھوڑ کر کسی بھی حکم کو بجالانے کے لئے تیار ہیں۔ انھوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا کہ وہ پورے خلوص اور اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ ریاست کے ہر شہری ہر وزیر نے ریاست کے دفاع کے لئے ہر ممکن کوشش کی ہے اور وزیر اعظم کے زیر رہنمائی کوئی بھی اپنی ذمہ داری سے ذرا بھی متزلزل نہیں ہوا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگرچہ ہم نے ہر ممکن جدوجہد کی لیکن اس کے باوجود ہندوستانی افواج کی طاقت کے سامنے ہمیں گھٹنے ٹیکنا پڑے مگر جو کچھ ہر وفادار شہری نے کیا ہے اس پر کوئی بھی نادم نہیں۔ وینکٹ راما ریڈی نے مزید کہا کہ شاید وہ آخری مرتبہ مخاطب ہیں اور کچھ ہی گھنٹوں کے بعد گولی سے ماردیئے جائیں گے۔ مگر یہ موت کسی بھی طرح بے عزتی کی موت نہیں ہوگی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر انھوں نے کہا کہ اگر آپ مستعفی ہو رہے ہیں تو وہ بھی استعفیٰ دے رہے ہیں۔

یہ مختصر مگر بہت جذباتی تقریر تھی۔ ان کے بعد ہر رکن کابینہ نے کم و بیش ان ہی خیالات کا اظہار کیا۔ پھر ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا کہ حکومت نے حتی الامکان اپنے ملک کو بچانے کی کوشش کی، لیکن طاقتور ظالم حکومت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا۔ اس لئے کابینہ اپنا استعفیٰ نظام کے سپرد کر دی ہے۔ پھر اس قرارداد کو نظام کے پاس روانہ کر دیا گیا۔ جب میں کابینہ کے اجلاس سے باہر آیا تو میرے اسٹاف کے کچھ آفیسرس میرے منتظر تھے۔ انھوں نے کہا کہ وہ سپاہی جو بی بی نگر تک ہندوستانی افواج کی پیش قدمی کے بارے میں معلومات لانے گئے تھے انھیں بی بی نگر اور اس کے قرب و جوار میں اور سڑک پر ہندوستانی فوج کا نام و نشان تک نہیں ملا۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ریلوے والوں کے ذرائع سے جو اطلاعات انھیں ملی تھیں کہ ہندوستانی افواج گولہ باری کرتے ہوئے حیدرآباد کی طرف بڑھ رہی تھی وہ غلط تھیں۔ انھوں نے یہ بھی بتلایا کہ نہ تو مغربی محاذ سے اور نہ تو مشرقی محاذ سے کسی بڑے حملے کا امکان ہے۔ ہاں البتہ ہندوستانی افواج کی کچھ ٹکڑیاں فوجی حالات کا سروے کرتے دیکھی گئی ہیں۔ مگر حیدرآبادی افواج جو اگلے مورچوں پر تعینات تھیں۔ ان پر مسلسل لڑاکا طیاروں کے ذریعے بمباری کی جارہی تھی۔ میں نے آفیسرس سے کہا کہ پوری کابینہ مستعفی ہوگئی ہے تو ان کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ آفیسرس سے بتلایا گیا کہ شاید نظام اب صلح اور امن کے لئے کوشش کریں گے۔ اس پر جواب ملا ”وہ کچھ دن اور ہندوستانی افواج کی پیش قدمی کو روک سکتے

ہیں''میں نے کہا'' شاباش ہم ختم ہو جائیں گے مگر جوش و جذبہ، ولولہ، حوصلہ اور روح قائم و دائم رہیں۔''

اس دوران مجھے ایک ارجنٹ فون آیا۔ نظام سے فوراً ملاقات کرنے کی ہدایت ملی۔ میں حیرت میں تھا کہ نظام اب مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں جب ان سے ملا تو وہ پولیس چیف اور فوجی کمانڈر سے نئی حکومت کی تشکیل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس سے قبل ہی وہ ہندوستانی نمائندہ کے۔ ایم۔ منشی کو یہ اطلاع پہنچا چکے تھے کہ میری حکومت مستعفی ہو گئی ہے اور وہ جلد نئی حکومت کے تشکیل کے لئے ضروری تجاویز ان کو روانہ کر دیں گے تاکہ منشی سے حکومت ہند کے نمائندے کی حیثیت سے نئی حکومت کی تشکیل کے لئے ضروری رضامندی اور ہدایت مل جائے۔ میں نے اس وقت کی گفتگو میں کسی قسم کا حصہ نہیں لیا۔ پولیس چیف اور فوجی کمانڈر کے چلے جانے کے بعد میں نے نظام سے کہا کہ معاملات اتنے آسانی سے طے ہونے والے نہیں جیسا کہ وہ سمجھ رہے ہیں اور اسی قت میں نے نظام سے زور دے کر کہا کہ ان کے آفس کے تمام حساس اور خفیہ دستاویزات اور ریکارڈ تلف کر دیئے جائیں۔ میرے مشورے پر انھوں نے کچھ دیر غور کیا اور پھر اپنے پرسنل سکریٹری کو طلب کر کے اس ضمن میں ضروری ہدایات دیں۔ میں نے خود فوراً شاہ منزل جا کر اپنے اسٹاف کو اس قسم کی ہدایات جاری کئے اور تمام خفیہ دستاویز کو اور وہ تمام کوڈ جس سے مشتاق احمد ایجنٹ جنرل کراچی سے وائرلیس کے ذریعے پیغامات موصول کئے جاتے تھے تلف کرنے کی تاکید کی۔ اس سے قبل میں نے مشتاق احمد کو ایک پیغام روانہ کیا جس میں کہا گیا کہ ہندوستانی فوج کی زبردست طاقت کو پیش نظر رکھ کر اور نظام کی خواہشات کا خیال رکھتے ہوئے میں نے استعفیٰ دیا ہے۔ پیغام میں یہ بھی کہا گیا کہ یہ ان کا آخری پیغام ہے اور کچھ ہی گھنٹوں کے بعد شاید وہ اس دنیا میں نہیں رہیں گے۔ مزید ہدایت دی گئی کہ حیدرآبادی پرچم لہراتے رکھنا اور معین نواز جنگ کو یہ پیغام پہنچانا تمام اداروں میں اور خاص طور پر سیکورٹی کونسل میں حیدرآباد کے لئے جدوجہد کرتے رہنا۔ اسٹاف کا ہر فرد نہایت افسردہ نظر آرہا تھا اور اشک بار تھا۔ میں واپسی میں منشی سے ملا۔ وہ حکومت ہند سے رابطہ قائم کرنے کے لئے حیدرآباد کے مواصلاتی نظام کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مجھے ایسے لگا کہ کسی بھی نئی تشکیل ہونے والی حکومت میں کے۔ ایم۔ منشی خود کو ایک ایڈوائزر (مشیر) کا رول ادا کرنے کے خواہش مند ہیں۔ میں نے منشی کو اس بات کی یاددہانی کروائی کہ حیدرآباد کے خلاف زبردست پروپگنڈہ کے

باوجود اس دور میں کہیں بھی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔ میں نے منشی سے اپیل کی کہ وہ ہندوستانی فوج کے کمانڈروں پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے عوام کو کسی ممکنہ قتل عام سے بچائیں جیسا کہ کچھ دن قبل ہندوستانی فوج کے مفتوحہ علاقوں اور اضلاع میں ہوا۔ مجھے ایسا لگا کہ میری اپیل سے وہ کافی متاثر ہوئے اور مجھے یقین دلایا کہ وہ شہری آبادی کو ہندوستانی فوج کے ہاتھوں ہونے والے خون خرابے سے ضرور بچائیں گے اور اس کے لئے وہ حتی الامکان کوشش کریں گے۔

نظام نے فون پر مجھ سے خواہش کی کہ جمعہ کی نماز میں ان کے ساتھ باغ عام کی مسجد میں پڑھوں۔ نماز کے بعد نظام نے مجھ سے خواہش کی کہ سہ پہر کے وقت میں ان سے کچھ دیر کے لئے ملوں۔ میں اس بات کے لئے راضی ہوا۔ میں سیدھے شاہ منزل گیا اور اس بات کا اطمینان کیا کہ تمام خفیہ ریکارڈ تلف کر دیا گیا ہے۔ مشتاق احمد کو میرا آخری پیغام بھی پہنچا دیا گیا تھا۔ سہ پہر سے کچھ دیر قبل میں حیدرآباد ریڈیو سے حیدرآباد کے عوام سے مخاطب ہوا اور چند الفاظ میں عوام کو واقف کرا دیا کہ حیدرآباد اس موقف میں نہیں ہے کہ ہندوستان کی طاقتور فوج کی مزاحمت کی جا سکے اور چوں کہ حیدرآباد کی حکومت ملک کی آزادی کا تحفظ نہیں کر سکی اس لئے مستعفی ہو گئی ہے۔ میں نے اپیل میں ہر مرد اور عورت سے کہا کہ آنے والی تباہی کو جرأت اور ہمت سے برداشت کرے اور خود اپنے آپ کو اس نئے طرز زندگی میں ڈھالنے کی کوشش کرے جو بالکل مختلف ہو گی۔ ایک ایسا نظام زندگی جس سے حیدرآبادی عوام کے آباء و اجداد مانوس تھے نہ موجودہ عوام نے انھیں کبھی واسطہ دیا۔ اپیل میں فرقہ وارانہ ملاپ اور امن عامہ کی اہمیت بتلائی گئی جو حیدرآبادی عوام کی اجتماعی زندگی کا خصوصی پہلو ہے۔ ایک بھی ناخوشگوار واقعہ نہ ہو ایسی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عوام سے خدا پر بھروسہ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے ان کو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں چھوڑ دیا۔ ریڈیو اسٹیشن سے جب میں واپس ہو رہا تھا اس وقت میں نے دیکھا کہ دکانوں اور عوامی ٹھکانوں پر ریڈیو کے اطراف لوگوں کے ہجوم ٹھہرے ہوئے تھے۔ تقریباً ہر شخص مٹھی دبائے ہوئے تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر میری آنکھوں سے بھی دو آنسوؤں کے قطرے نکلے۔ شاہ منزل واپس ہو کر میں نے قاسم رضوی کو فون کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ریڈیو سے فرقہ وارانہ ملاپ اور امن عامہ کے لئے عوام سے اپیل کریں۔ پہلے تو انھوں نے کچھ تامل کیا پھر ریڈیو اسٹیشن جا کر بہت ہی پر اثر تقریر کی اور عوام سے امن

قائم کرنے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے اپیل کی۔ میرے لئے دوسرا اہم مسئلہ زیادہ سے زیادہ ہتھیار گولہ بارود تباہ کرنے کا تھا اس لئے میں نے ضروری ہدایات جاری کیں۔ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ اگر جب کہ میں اقتدار پر نہیں تھا مگر اس کے باوجود میرے احکامات کی تعمیل ہوئی۔

اسی دوران ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا جس کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ رحیم جو میری کابینہ میں تھے انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ کسی طرح قاسم رضوی کو پاکستان یا کسی اور ملک کو بذریعہ طیارہ بھجوانے کا انتظام کیا جائے۔ جس وقت وہ قاسم رضوی کے بارے میں کہہ رہے تھے انھیں خود اس بات کا یقین تھا کہ ہم سب لوگ مارے جائیں گے۔ مگر اس کے باوجود ان کا یہ جذبہ قاسم رضوی کے لئے قابل تعریف تھا۔ میں نے اس سلسلے میں فون پر فوجی کمانڈر سے دریافت کیا کہ کیا وہ کسی طیارے کے ذریعے جس میں بھرپور ایندھن ہو قاسم رضوی کو کسی دوسرے ملک منتقل کر سکتے ہیں۔ جواب ملا کہ یہ ناممکن ہے کیوں کہ ہندوستانی لڑاکا طیارے ہر طرف اُڑان بھر رہے ہیں اور حیدرآباد کے ہوائی اڈے سے کسی بھی اُڑنے والے طیارے کو آسانی سے مار گرا دیا جائے گا۔ اس دوران اگرچہ کہ میں نظام سے ملاقات نہیں کرنا چاہتا تھا مگر مجھے بار بار بلایا جا رہا تھا۔ ایک وقت میری موجودگی میں یہ بات چل رہی تھی کہ ہندوستانی افواج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی رسم کون ادا کریں۔ حیدرآبادی فوجی کمانڈر کا خیال تھا کہ وہ خود اس رسم کے لئے زیادہ مناسب ہے جب کہ دوسرے جو وہاں موجود تھے ان کا خیال تھا کہ پرنس آف برار جو رسمی کمانڈر آف چیف ہیں اس کام کے لئے مناسب ہیں۔ کے۔ ایم۔ منشی نے نظام سے اصرار کیا کہ وہ ریڈیو اسٹیشن سے عوام سے خطاب کریں اور پیغام دیں۔ ایک پیغام کا مسودہ منشی نے خود تیار کیا تھا۔ اس تقریر میں اس بات کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا تھا کہ انھوں نے اقوام متحدہ میں حیدرآبادی مندوب کو تاکید کی ہے کہ حیدرآباد کی درخواست واپس لے لی جائے اس کے بعد منشی نے خود عوام سے خطاب کیا۔ دونوں تقاریر کا حاصل یہ تھا کہ حیدرآباد کی پچھلی حکومتوں نے بہت ساری غلطیاں کی ہیں جس کے لئے کچھ رہنما ذمہ دار ہیں اور اب حکومت ہند کی سرپرستی میں نئی حکومت قائم کی گئی ہے تاکہ تمام غلطیوں کو درست کیا جائے۔ دوسرے دن صبح مجھے موقع ملنے پر میں نے دریافت کیا کہ کیا وہ تمام خفیہ دستاویز جن کی نشاندہی کی گئی تھی تباہ کی گئیں؟ انھوں نے یقین دلایا کہ ایسا ہوا ہے۔ اسی دن شام یعنی ۱۸ ستمبر کو ہندوستانی افواج کے میجر جنرل جے۔ این۔ چودھری

جن کے ہاتھ میں مغربی محاذ کی کمان تھی حیدر آبادی فوج کے کمانڈران کے اسٹاف کے ساتھ جیپ کے ذریعے بلارام کی ریڈیننسی میں داخل ہوئے۔ نظام نے ان کے استقبال کے لئے اپنی طرف سے ذوالقدر جنگ، ابوالحسن سید علی، علی یاور جنگ اور دوسرے حضرات پر مشتمل ایک وفد روانہ کیا۔ اس وفد کا ایک تو مقصد میجر کا استقبال کرنا تھا اور دوسرے یہ کہ نئی حکومت کی تشکیل کے لئے میجر جنرل چودھری کی منظوری لی جائے جس کے بارے میں پہلے ہی کے۔ ایم۔ منشی سے مشورہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد نظام نے مجھے طلب کیا۔ جس وقت میں ان سے گفتگو کر رہا تھا وفد کے تمام اراکین افسردہ چہروں کے ساتھ واپس ہوئے اور بتلایا کہ حکومت کے تشکیل کے سلسلے میں چودھری کسی قسم کی بات چیت کرنا نہیں چاہتے۔ نظام کا کوئی مشورہ نہیں چاہتے۔ انھوں نے مزید کہا کہ چودھری جلد ہی مارشل لاء کا اعلان کرنے والے ہیں اور اپنے تحت فوجی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ نظام حیرت زدہ ہوئے اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ منشی سے جو کچھ طے ہوا ہے یہ اس کے خلاف ہے۔ میں نے پوچھا ''منشی سے کیا طے ہوا ہے؟'' اس پر وہ خاموش رہے۔ میں نے فوراً تاڑ لیا کہ میری موجودگی وہاں اب ناپسندیدہ ہے۔ اس لئے وہاں سے نکل جانے کی اجازت مانگ کر اُٹھ گیا۔ نظام نے مجھ سے کہا کہ دوسرے دن صبح میں ان سے ملوں۔ میں نے وعدہ تو کیا مگر وہ وعدہ پورا نہ کر سکا۔ گھر پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ ہندوستانی افواج مغرب کی سمت سے ۱۹ رستمبر کی دوپہر کے وقت اور مشرقی سمت سے سہ پہر کو شہر میں داخل ہوں گی۔ شام میں ایک سپاہی محکمہ پولیس کی طرف سے ایک لفافہ لاکر مجھے دے گیا۔ لفافے میں فوجی حکومت کی طرف سے حکم اجراء کیا گیا تھا کہ میں اپنے مکان میں زیر حراست ہوں اور مجھے مکان نہ چھوڑنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس وقت تک میں نے اپنی بیوی، بچوں اور بہن کو شہر کے نامعلوم حصے میں اپنے دوستوں کے گھر روانہ کر دیا تھا تا کہ میری موجودگی میں ان کی بے حرمتی نہ ہو اور مجھے ان کی موجودگی میں قتل نہ کیا جائے۔ حکم ملنے کے بعد میں اطمینان سے اپنے مکان میں بیٹھ گیا۔ میرا ایک خانگی اتالیق جو نسل سے عرب تھا اور جس نے بچپن سے میری تربیت کی تھی میرے پاس کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مجھے پولیس چیف کا ایک فون آیا اور اس نے مجھ سے اس بات کی معافی مانگی کہ حسب وعدہ نظام سے ملاقات نہ کریں اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کے لئے بھی کہ انھوں نے حراست میں لینے کا حکم دیا ہے جن کے لئے وہ مجبور تھے۔ میں نے جواباً کہا کہ

میں ان کی مجبوری کو سمجھ سکتا ہوں ۔میں نے قاسم رضوی صاحب کے بارے میں دریافت کیا تو مجھے بتایا گیا کہ صبح انھیں بھی حراست میں لینا ہے تھوڑی دیر کے بعد قاسم رضوی صاحب کا فون آیا ان کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح چاق ہیں ۔انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ صبح ناشتہ پر آ رہے ہیں جیسا کہ وہ کبھی کبھی کیا کرتے تھے ۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیا جائے ۔پھر بھی میں نے کہا کہ ضرور آ جائیں ۔بظاہر وہ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے ۔مجھ سے علیحدہ رہنا یہ میری فیملی کے لئے شاید نا قابل برداشت تھا ۔میرے ساتھ جو کچھ بھی ہونے والا ہے شاید اس میں وہ بھی شریک ہونا چاہتے ہیں ۔اس لئے دوسرے دن یہ لوگ اچانک آ گئے ۔میرے ٹیلی فون کے تار کاٹ دیئے گئے تھے ۔پھر بھی کچھ کچھ خبریں مل رہی تھیں ۔مغربی اور مشرقی محاذ سے ہندوستانی افواج فاتحانہ انداز سے شہر میں داخل ہو کر بلارم فوجی چھاؤنی میں داخل ہوئیں ۔رات دیر گئے ایک اونچے قد والے ہندوستانی فوج کے افسر نے میرے مکان پر مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ۔میں نے نچلی منزل میں اس سے ملاقات کی ۔یہ فوج میں کرنل تھا ۔اس نے نہایت ہی شائستہ انداز میں کہا کہ دوسرے دن صبح مجھے لے جایا جائے گا ۔میں نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا کیا فائرنگ اسکوائڈ تیار رہے گا؟ مگر میں حیرت زدہ تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے ۔وہ معافی مانگتے ہوئے جواب دیئے بغیر فوجی انداز میں سلام کر کے چلا گیا ۔یہ معلوم کر کے کہ مجھے دوسرے دن صبح لے جایا جائے گا میری بیوی، بہن اور بچوں پر ایک دم سکتہ طاری ہوا ۔پھر جلد ہی انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا ۔ایسا لگ رہا تھا کہ ساری رات کوئی بھی سو نہ سکا تھا پھر جو کچھ وقت بچا رہا اس میں اپنے خاندان کے افراد سے بات چیت کرتا رہا اور پھر سو گیا ۔صبح فجر کی نماز ادا کی ،دوسرے دن علی الصبح فوجی گاڑیاں میرے مکان کے آس پاس دیکھی گئیں لیکن مکان میں کوئی داخل نہیں ہوا ۔میں انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ کافی دیر ہو گئی ۔ایسا لگ رہا تھا کہ یہ یونٹ اپنے ہیڈ کوارٹر سے وائرلیس کے ذریعے رابطہ قائم کئے ہوئے ہے ۔جس طرح یہ فوجی دستہ مختلف گاڑیوں سے آیا تھا واپس چلا گیا ۔ہم نے بہت دیر تک انتظار کیا مگر کچھ ہوا نہیں شاید اس کا تعلق کونسل کے اجلاس سے ہو ۔پھر گھنٹے دنوں میں بدل گئے دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں ۔اس کے بعد میرے سامنے کوئی چیز ایسی نہیں آئی جو ضبط تحریر میں لائی جائے ۔پھر ایک دن خدا کا فضل ہوا کہ میں ہجرت میں کامیاب ہو گیا ۔

کتابیات

1. India's Struggle Quarter Centuary (1921-46) — By A.C. Goha (Publication Division Govt. of India)
2. The History of Indian National Congress — By Pattabhi Seetharamia (India)
3. A Centuary History of Indian National Congress — Govt. of India Publication
4. Integration of the Indian States — By V.P.Menon (Orient Longman Ltd. Madras India)
5. India Wins Freedom — By Moulana Abul Kalam Azad (Orient Longman Ltd. Madras India)
6. Tragedy of Hyderabad — By Mir Laik Ali (Pakistan Co-Operative Book Society Ltd. Karachi)
7. Tipu Sultan — By Dr. B.Shaik Ali (Tupu Sultan Research Centre Hyd, India)
8. From Autocracy to Integration — By Lucien D Benichou (Orient longman Chennai India)
9. History of moddern Deccan — Abul Kalam Azad Oriential Research Institute Hyderabad, India

10. حیدرآباد کا عروج وزوال — بدر شکیب (عثمانیہ اکیڈیمی، کراچی، پاکستان)
11. سوانح بہادر یار جنگ جلد اول تا سوم — نذیر الدین احمد (بہادر یار جنگ اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا)
12. تقاریر و نگارشات بہادر یار جنگ — مرتبہ محمد احمد خان و مجید احمد فاروقی (بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی، پاکستان)
13. زوال حیدرآباد کی ان کہی داستان — مشتاق احمد خان (لاہور، پاکستان)
14. روزنامہ رہبر دکن — (حیدرآباد، انڈیا)
15. تاریخ مجلس اتحاد المسلمین مملکت آصفیہ اسلامیہ — دار الاشاعت سیاسیہ مجلس اتحاد المسلمین (حیدرآباد، انڈیا)
16. سقوط حیدرآباد — دار الاشاعت کل ہند مجلس تعمیر ملت حیدرآباد، انڈیا
17. آصف سابع اور مملکت حیدرآباد — مرتبہ محمد سعید اللہ اور رشید شکیب (بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی، پاکستان)